عشق کا عین

الٰہی بخش کو پہلی نظر میں عشق ہوا تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ اس کا خمیر ہی عشق کی مٹی سے اٹھا تھا۔

بچپن ہی سے وہ عشق اور محبت کی باتیں سنتا رہتا تھا۔ اس وقت سے جب وہ حروف ع اور م پہچانتا بھی نہیں تھا۔ محبت اور عشق کی تلقین اس کے باپ کا وظیفہ تھا۔ وہ ہر وقت اس عشق اور محبت کی بات کرتا' جو انسان ہونے کے ناتے اس پر اور اس کی آنے والی نسلوں پر فرض تھی اور یہ تعلیم اسے اس کے بزرگوں نے اسی طرح دی تھی وہ نسلاً عاشق تھے۔

الٰہی بخش کی سمجھ میں اپنے باپ کا فلسفۂ عشق کبھی نہیں آیا۔ ابتدا میں تو وہ سمجھنے کے قابل ہی نہیں تھا۔ باپ بھی عشق کی وہ تلقین اسے گھٹی سمجھ کر پلاتا تھا کہ گھٹی کا اثر کبھی نہیں جاتا۔ بلکہ وہ بہت مضبوط اور دیرپا اثر ہوتا ہے۔ انسان اس سے کسی طرح لڑ ہی نہیں سکتا۔ مگر جب الٰہی بخش سمجھ داری کی حدود میں داخل ہوا تب بھی ابا کا فلسفہ عشق اسکے حلق سے کبھی نہیں اترا۔ الٹا اس کے اندر ایک مزاحمت پیدا ہوگئی۔ اس کے مزاج میں عشق سے بغاوت آ گئی۔

اس سلسلے میں اس کی پہلی یاد ہی ایسی تھی جو اس کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوئی۔ وہ اس وقت پانچ ساڑھے پانچ سال کا ہوگا۔ وہ گندم کے کھیت کے سامنے کچھ

بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ ان میں تین بچے سادات کے بھی تھے۔ کھیل کھیل میں ایوب شاہ اور نواز شاہ نے بے ایمانی شروع کر دی۔ اس نے اس پر احتجاج کیا تو دونوں نے مل کر اس کی پٹائی کر دی۔ ایک تھپڑ ایسا لگا کہ اس کی نکسیر پھوٹ گئی۔ تکلیف کا احساس تو نہیں ہوا تھا لیکن اس کی نظر دھار کی شکل میں گرتے ہوئے خون پر پڑ گئی اس نے آستین سے ناک صاف

کرنے کی کوشش کی تو آستین خون میں تر بتر ہو گئی بس پھر کیا تھا اس پر جنون طاری ہو گیا اس نے نظریں جھکا کر زمین پر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر وہ زمین پر پڑے ایک پتھر کی طرف جھپٹا۔

ادھر وہ دونوں بھی بہتا ہوا خون دیکھ کر دم بخود رہ گئے تھے۔ وہ خون زدہ نظروں سے خون کو دیکھے جا رہے تھے۔ انہوں نے اسے پتھر اٹھاتے دیکھا ---------لیکن در حقیقت نہیں دیکھا۔ وہ یوں بت بنے کھڑے تھے کہ پتھر لگنے تک ان کی سحر زدگی ٹوٹنے والی نہیں تھی۔

مگر پتھر لگنے کی نوبت ہی نہیں آئی

الٰہی بخش کا پتھر والا ہاتھ بلند ہوا نیم قوس کی شکل میں پیچھے کی طرف گیا اور آخری مرحلے میں آگے کی سمت لپک ہی رہا تھا کہ جیسے پتھر کا سا ہو گیا۔ اس کے پورے جسم کی قوت اس وقت تک استعمال میں آ چکی تھی۔ چنانچہ شدید جھٹکا لگا۔ اس کا پورا جسم ہل کر رہ گیا ----------سوائے پتھر والے ہاتھ کے۔ کہ وہ بڑی مضبوط گرفت میں تھا۔ اس کا جسم آگے کی طرف گیا اور پھر ردعمل کے طور پر پیچھے ہٹا۔ ذرا سنبھلنے کے بعد اس نے سر گھما کر دیکھا۔ اس کا پتھر والا ہاتھ ابا کی گرفت میں تھا۔

وہ ہاتھ چھڑانے کے لئے زور لگاتا رہا لیکن ابا کی نگاہوں میں جتنی نرمی تھی گرفت میں اس سے زیادہ سختی تھی۔

''ابا۔۔۔۔۔۔۔چھوڑ دو مجھے'' وہ چلایا ''میں ان کا سر پھاڑ دوں گا۔۔۔۔۔۔''

''نا بالکے۔پتھر پھینک دے'' ابا نے بہت شیریں لہجے میں کہا۔

''ابا انہوں نے مجھے مارا ہے۔یہ خون دیکھو۔'' اس نے فریاد کی۔پتھر اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

''میں دیکھ رہا ہوں۔تو پتھر تو چھوڑ۔پھر میں کچھ کرتا ہوں''

کچھ کرتا ہوں۔ سے الٰہی بخش کو آس تو بندھی لیکن وہ ہچکچا رہا تھا۔پتھر اس نے اب بھی نہیں چھوڑا۔

''تو میری بات نہیں مانے گا؟ باپ نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

اس بار ننھے الٰہی بخش نے پتھر ہاتھ سے چھوڑ دیا۔باپ نے فوراً ہی اسے گود میں اٹھایا اور گھر کی طرف دوڑ لگا دی۔گھر میں گھستے ہی وہ صحن میں لگے ہینڈ پمپ کی طرف لپکا۔اس نے الٰہی بخش کو بٹھایا اور خود پمپ چلانے لگا۔ٹھنڈا ٹھنڈا پانی الٰہی بخش کے سر پر گرا تو وہ اچھلا۔وہ بھاگنے ہی والا تھا کہ باپ نے ڈپٹ کر کہا'' بیٹھا رہ۔ابھی خون رک جائے گا''

ماں آوازیں سن کر کمرے سے نکلی تو یہ منظر دیکھ کر ان کی طرف جھپٹی۔'' کیا ہوا۔۔۔۔۔۔۔یہ کیا ہوا؟''

'' کچھ نہیں۔کھیل میں چوٹ لگ گئی ہے۔نکسیر پھوٹی ہے۔تم چلو میں پانی لے کر اس کی ناک میں ڈالو۔''

ذرا دیر میں خود رک گیا۔مگر اس وقت تک الٰہی بخش کے کپڑے بھیگ چکے تھے اور اسے سردی لگ رہی تھی "چل ---------- اندر چل ۔" باپ نے اس کا ہاتھ تھاما اور کمرے کی طرف چلا۔تم اس کے کپڑے نکالو۔اس نے بیوی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

الٰہی بخش کو کپڑے بدلوانے کے بعد ماں نے اس سے پوچھا۔اب یہ تو بتا ہوا کیا تھا؟

اماں وہ کھیل میں بے ایمانی کر رہے تھے۔میں نے منع کیا تو دونوں نے مل کر مجھے مارا ۔الٰہی بخش نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔وہ دکھ اور شرمندگی سے نڈھال ہو رہا تھا دکھ اس بات کا نہیں تھا کہ اسے چوٹ لگی۔دکھ یہ تھا کہ وہ بدلہ نہیں لے سکا۔اس کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔

"وہ کون تھے وہ دونوں تو مجھے بتا۔میں ان کی خبر لوں گی۔ماں بپھر گئی۔

ایوب شاہ اور نواز شاہ اس نے بتایا

نام سنتے ہی ماں کو بھی سانپ سونگھ گیا۔پھر وہ سنبھل کر بولی۔تو بیٹھ میں تیرے لئے دودھ لاتی ہوں"

ننھے الٰہی بخش کی مایوسی کی کوئی حد نہیں تھی۔باپ نے تو اسے مایوس کیا ہی تھا لیکن ماں تو ان کی خبر لینے جا رہی تھی۔پھر اسے کیا ہو گیا۔ان کے نام سنتے ہی اس کا رویہ کیوں بدل گیا۔اس سوچ کے ساتھ ہی اسے غصہ آنے لگا۔اس نے سوچا کہ اسے ہی کچھ کرنا ہو گا اور یہ مشکل بھی نہیں تھا موقع تو ضرور ملے گا۔بس پھر وہ پتھر اٹھائے گا اور

"بیٹے یہ خیال دل سے نکال دے" باپ کی آواز نے اسے چونکا دیا۔وہ

جیسے اس کی سوچیں پڑھ رہا تھا۔

''کیا ابا؟''

''وہی جو تو سوچ رہا ہے۔''

اتنی دیر میں ماں دودھ کا پیالہ لے آئی تھی'' لے۔۔۔۔۔۔۔۔پی لے''

الٰہی بخش نے پیالہ لینے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا'' میں دودھ نہیں پیوں گا

اماں۔'' اس نے جواب دیا۔ وہ اس وقت کچھ پینا چاہتا تو تو صرف ان دونوں لڑکوں کا

خون جنہوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔

''پی لے بیٹا'' ماں کے لہجے میں اصرار تھا۔

الٰہی بخش نے جیسے ماں کی بات سنی ہی نہیں' میں انہیں نہیں چھوڑوں گا اماں۔ میں بدلہ

ضرور لوں گا۔''

''بالکے میں نے کہا نا یہ خیال دل سے نکال دے'' اس بار باپ کا لہجہ بہت

سخت تھا۔

''نہیں ابا۔ میں نہیں چھوڑوں گا انہیں آج تو تم نے مجھے روک دیا لیکن موقع ملتے ہی

میں۔۔۔۔۔۔۔۔؟

باپ کا ہاتھ اٹھا لیکن ماں نے اسے روک دیا۔ وہ اسے مضطر انہ نگاہوں

سے دیکھ رہی تھی۔

''یہ پتھر اٹھا کر انہیں مارنے والا تھا۔ وہ تو میں پہنچ گیا ورنہ غضب ہو جاتا''

الٰہی بخش کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا غضب ہو جاتا۔ انہوں نے اس کا خون

نکالا تھا وہ پتھر مارتا تو ان

کا بھی خون بہتا۔ اس میں غضب کی کون سی بات تھی ۔۔۔۔۔۔۔

"تم اسے پیار سے سمجھا دینا۔" ماں نے بہت دھیرے سے کہا۔

باپ کی سمجھ میں بات آگئی۔ سختی سے نفرت پیدا ہوئی تھی اور پھر وہ ہر وقت ہر پل تو اس کی چوکیداری نہیں کر سکتا تھا۔ پیار سے سمجھانے ہی میں بہتری تھی۔ اس نے الٰہی بخش کو کھینچ کر سینے سے لگایا' خوب پیار کیا اور پھر اسے گود میں بٹھالیا۔ "دیکھ میرا بیٹا تو پہلے دودھ پی لے۔ پھر میں تجھے سمجھاؤں گا۔"

بپھرے ہوئے شیر جیسا الٰہی بخش باپ کے بوسوں سے بھیگ کر ایک دم بکری بن گیا۔ دودھ پینے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن باپ کے اصرار پر اس نے پی لیا۔ ماں خالی پیالہ واپس لے گئی تو باپ نے بات شروع کی۔ "دیکھ بیٹے یہ باجی لوگ ہیں نا' یہ ہمارے پیارے نبی ﷺ کی اولاد ہیں اور پیارے نبی ﷺ پر جان مال اور اپنا سب کچھ قربان کر دینا ہم پر فرض ہے۔ ہماری زندگی کا مقصد ان سے محبت کرنا ہے۔ تو سمجھ رہا ہے نا؟

الٰہی بخش نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ یہ تو وہ اب تک سمجھ چکا تھا۔ باپ اسے یہ باتیں بہت عرصے سے سمجھاتا رہا تھا۔

"تو باجی لوگوں کی اور ان کی اولاد کی عزت کرنا' ان سے محبت کرنا ہمارا فرض ہے۔"

"چاہے وہ ہمارے ساتھ زیادتی کریں؟" الٰہی بخش نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں" باپ نے مستحکم لہجے میں کہا۔ یوں ہم عزت کریں تو کون سا کمال ہو

گا۔ ہاں زیادتی سہہ کر بھی ان کی عزت کریں تو اللہ بھی خوش ہوگا اور اس کا رسول ﷺ بھی اور اللہ خوش ہوگا تو انعام بھی دے گا"

"ابا۔۔۔۔۔۔۔۔باجی لوگوں کو پولیس بھی نہیں پکڑ سکتی؟" الہی بخش کے معصوم ذہن نے ایک اور سوال اٹھایا۔

"تو ان چکروں میں نہ پڑ بیٹے ہمیں تو صرف اپنی دیکھنی چاہیے۔ دنیا کی باتیں دنیا جانے ہم تو بس

نبی ﷺ کی اولاد کے خادم ہیں۔ اب تو سوچ کہ ان پر ہاتھ اٹھائیں گے تو گستاخی ہوگی نا۔ اسی لئے میں نے تیرا ہاتھ پکڑا تھا۔ دیکھ بیٹے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو کبھی ناراض نہ کرنا۔"

الہی بخش خاموش بیٹھا رہا۔ بات اب بھی اس کے حلق سے نہیں اتری تھی۔

"وعدہ کر کہ اب بھی ایسا نہیں کرے گا۔ بدلہ لینے کا خیال بھی دل میں نہیں لائے گا"

الہی بخش ہچکچاتا رہا۔ وہ اپنے دل کو ٹٹول رہا تھا' جس میں تلخی ہی تلخی تھی۔ پھر اچانک ایک حیرت انگیز تبدیلی آئی اس کے ننھے سے دل میں در گزر کی نمی پھوٹی اور لمحوں میں جیسے پتھر موم ہوگیا۔ ٹھیک ہے بابا پھر میں انہیں معاف کر دیتا ہوں۔

باپ کے چہرے کی رنگ متغیر ہوگئی۔ بس بات ختم کر دیتے ہیں۔"

باپ کے لہجے کی تلخی نے اسے ڈرا دیا۔ ٹھیک ہے بابا اس نے آہستہ سے کہا۔

☆۔۔۔۔۔۔۔۔☆۔۔۔۔۔۔☆

اس وقت وہ چھوٹا تھا۔اسے بحث کرنی نہیں آتی تھی۔بڑا ہوا تو وہ بحث کرنے لگا۔اس کا باپ پڑھا لکھا تو نہیں تھا لیکن جواب دینے اسے خوب آتے تھے۔اس کے پاس وہ دانش تھی جو صرف عشق سے آتی ہے۔

ایسی ہی ایک بحث کے دوران الٰہی بخش نے کہا "ابا' یہ سادات کچھ کرتے ہوئے اپنے نام و نسب کا لحاظ کیوں نہیں کرتے؟

باپ نے نظریں اٹھا کر اسے گھورا۔ "کیا مطلب ہے تیرا؟

" میں یہ کہہ رہا ہوں ابا' کہ زیادہ تر ان کا عمل لائق احترام نہیں ہوتا۔وہ برے کام کیوں کرتے ہیں۔برائی میں کیوں ملوث ہوتے ہیں؟"

دیکھ بیٹے آدمی اپنے اعمال پر نظر رکھے تو اسے کبھی دوسروں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی۔تو اپنے اعمال پر نظر رکھا کر بیٹے۔قیامت کے دن کیا اللہ سے یہ کہے گا کہ مجھ سے زیادہ گناہ تو

فلاں شخص نے کیے تھے۔دیکھ حساب تو آدمی کو صرف اپنا دینا پڑے گا۔"

ایک اور موقع پر الٰہی بخش نے کہا "------- تم عشق کی بات بہت کرتے ہو کہتے ہو زندگی کا مقصد عشق ہونا چاہیے-------- عشق اللہ سے اور اس کے رسول ﷺ سے۔یہ بتاؤ یہ عشق کیا چیز ہے۔مشکل ہے کہ آسان ہے۔مجھے محبت بہت آسان لگتی ہے۔کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی' ہو جاتی ہے تو ہو جاتی ہے۔نہیں ہوتی تو نہیں ہوتی۔مگر اتنا بڑا مسئلہ تو نہیں لگتا۔جتنا تم اسے بتاتے ہو۔"

باپ کے چہرے پر نرمی ہی نرمی بکھر گئی۔آنکھوں میں جیسے گہری سوچ اتر آئی۔

''میں تو جاہل آدمی ہوں بیٹے' پر آپ ہی آپ بیا تمیں سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ اس کو سمجھنے کے لئے کتابیں پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ عشق تو آدمی کے اندر رہتا ہے نا۔ بس اس کے لئے خود کو سمجھا اور تبدیل کرتے رہنا ہوتا ہے۔ وہ کہتے کہتے رکا اور بظاہر سامنے والی دیوار پر کچھ دیکھنے لگا لیکن لگتا تھا کہ وہ بہت دور دیکھ رہا ہے۔ عشق تو بیٹے آسان ہے ۔۔۔۔۔ بہت ہی آسان۔ یہ تو ہو جاتا ہے۔ پر عشق کرتے رہنا' عشق کیے جانا بہت مشکل ہے۔ عشق کے تقاضے پورے کرنا بالکل آسان نہیں۔ اس کے لئے تو اپنا آپ مارنا پڑتا ہے۔''

تم ہمیشہ مجھے اللہ اور رسول ﷺ سے عشق کی نصیحت کرتے ہو بابا۔ تم خود بھی تو کرتے ہو نا؟''

''ہاں' کرتا ہوں۔'' باپ نے گہری سرد آہ کھینچتے ہوئے کہا۔ لیکن جیسے کرنا چاہیے ویسے نہیں کر پاتا۔ بس خلوص سے' سچے دل سے کوشش کیے جاتا ہوں۔

''پر یہ کیسے ہوتا ہے بابا۔ اس سے عشق کیسے ہو سکتا ہے جسے دیکھا ہی نہ ہو؟''

بیٹے اپنے وجود سے غور کرنا شروع کر۔ پیدا ہوا تو کیڑے جیسا تھا۔ اپنے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ نہ اپنی حفاظت نہ زندگی کا اہتمام۔ رب نے تیری حفاظت کی۔ تجھے پالا تجھے دو ہاتھ دیئے' دو ٹانگیں دیں ۔۔۔۔۔۔۔۔ کام کرتی ہوئی' دو آنکھیں دیں۔ بینائی دی' عقل دی۔ تجھے ایک مکمل انسان بنایا۔ کوئی کمی' کوئی محرومی تیرے لئے نہیں چھوڑی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تجھے مسلمان کے گھر پیدا کیا۔ تا کہ تجھے حق کی تلاش میں بھٹکنا نہ پڑے۔ یہ سب احسان تجھ پر اس نے کئے جو بے نیاز ہے جسے کسی سے غرض نہیں۔ اسے کسی سے کچھ نہیں چاہیے اتو اتنے احسانوں

کے بعد اس نے بھلائی کا راستہ دکھا کر تجھ پر احسان کیا۔ اب یہ بتا کہ جواب میں تو کیا کرے گا؟

الٰہی بخش کچھ دیر سوچتا رہا۔ سوال مشکل تھا۔ سوچتے سوچتے ذہن منتشر ہو جا رہا تھا۔ وہ اپنی سوچوں کو یکجا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں اللہ کے حکامات پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔ نماز پڑھوں گا' عبادت کروں گا اس کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلوں گا۔ اس کا شکر ادا کروں گا۔

یہ بھی تو اللہ کا احسان ہو گا تجھ پر" بابا نے کہا" اس لیے کہ یہ سب کچھ کرنا تیرے ہی فائدہ مند ہو گا۔ پھر بتا کہ تو نے کیا کیا۔ کچھ بھی تو نہیں' یاد رکھ توفیق بھی اللہ ہی دیتا ہے"

"تو اور میں کیا کر سکتا ہوں؟ الٰہی بخش نے بے بسی سے کہا۔

"محبت کر۔ محبت کے سوا کیا کر سکتا ہے۔ اللہ کی غلامی تو فرض ہے۔ اس کا حکم بجا لانے میں تو تیری ہی فلاح ہے۔ ہاں محبت اس کے لئے ہے۔ سمجھا کچھ؟

"سمجھ تو گیا بابا پر محبت کی تو نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔"

"ٹھیک کہتا ہے لیکن محبت بھی بے سبب بھی نہیں ہوتی۔ کبھی یہ ہمدردی کی وجہ سے ہوتی ہے کبھی اس کا سبب کوئی خواہش ہوتی ہے' کبھی آدمی محبت کی طلب میں محبت کرتا ہے' یہ سوچ کر کہ اسے جواب میں محبت ملے گی اور کبھی آدمی کسی کے احسانات کی وجہ سے محبت کرتا ہے۔ تیرے پاس محبت کا سبب تو موجود ہے۔ محبت کا سامان تو کر۔

کیسے کروں بابا؟

"ہر وقت خدا کے احسانات یاد کیا کر۔ غور کیا کر کہ ہر سانس خدا کی

عنایت ہے۔ یوں دل میں شکر گزاری پیدا ہوگی۔ پھر تو بے بسی محسوس کرے گا کہ اتنے احسانات کا شکر کیسے ادا کیا جا سکتا ہے۔ وہ بے بسی تیرے دل میں محبت پیدا کرے گی۔ تو سوچے گا کہ مالک نے بغیر کسی غرض کے تجھے اتنا نوازا۔ تجھ سے محبت کی۔ تو غور کر کہ اتنی بڑی دنیا میں کروڑوں انسانوں کے بیچ تو کتنا حقیر ہے۔ سینکڑوں کے مجمع میں بھی تیری کوئی پہچان نہیں۔ کوئی تجھ پر دوسری نظر بھی نہیں ڈالے گا۔ کسی کو پروا نہیں ہوگی کہ کوئی الٰہی بخش بھی ہے لیکن تیرا رب کروڑوں انسانوں کے بیچ بھی تجھے یاد رکھتا ہے' تیری ضرورت پوری کرتا ہے' تیری بہتری سوچتا ہے اور تجھے اہمیت دیتا ہے۔ اس سب باتوں پر غور کرتا رہے گا تو تیرے دل میں خدا کی محبت پیدا ہوگی۔ اس محبت کے ساتھ بھی یہ سب کچھ سوچتا رہے گا تو محبت میں گہرائی پیدا ہوگی اور پھر تجھے خدا سے عشق ہو جائے گا"

''لیکن بابا اللہ نے محبت کا طریقہ کیا ہے؟ الٰہی بخش نے پوچھا کیا اس سے یہ کہتا رہوں کہ مجھے تجھ سے محبت ہے۔"

یہ تو انسانوں سے کہنا پڑتا ہے کیونکہ وہ کچھ نہیں جانتے لیکن وہ تو سب کچھ جانتا ہے۔ اس سے دل کا حال چھپا نہیں۔ صرف محبت کرتے رہو۔ وہ جان لے گا۔ جہاں تک طریقے کا تعلق ہے تو ہم جیسے حقیر بندوں کے لیے اس نے فرمایا کہ مجھ سے محبت کرنی ہے تو میرے بندوں سے محبت کرو۔ یعنی بغیر کسی غرض کے ہر انسان سے صرف اس لیے محبت کرو کہ وہ بھی اللہ کا بندہ ہے۔ باپ کہتے کہتے رکا اور مسکرایا۔ اب تو سمجھ رہا ہے نا۔ اللہ کو آخری رسول ﷺ خاتم الانبیاء سے خاص محبت ہے۔ بے پناہ محبت ہے۔ ہم اللہ سے محبت کرتے ہیں تو ہم پر عشق رسول ﷺ بھی لازم ہوا۔ عشق نہ

کہیں رکتا ہے نہ کبھی ختم ہوتا ہے۔

''اور رسول سے عشق ہم کیسے کریں گے؟''

''ہم نے اللہ سے محبت کی تو ہمیں اس سے عشق تو کرنا پڑے گا' جو اللہ کو سب سے پیارا ہے اور اس سے عشق کرنے کے لئے ہمیں اس کا احترام کرنا ہوگا۔ اسے درود بھیجتے رہو' اس کے اسم مبارک پر احترام کھڑے ہو جاؤ۔ اس کی سنت طیبہ کی پیروی کی کوشش کرو اور آخری بات یہ اصول کہ جو بھی اسے پیارا ہو' اسے اپنی جان سے پیارا سمجھو۔ اسی بنیاد پر تو ہم اللہ کے عشق سے رسول ﷺ کے عشق تک پہنچے ہیں۔''

اب یہ بتا کہ انسان کو سب سے پیارا کون ہوتا ہے؟ باپ نے سوال کیا۔

''بچے ماں باپ۔ الٰہی بخش نے بلا جھجک کہا۔

''ٹھیک کہا تو نے'' باپ مسکرایا۔ ''لیکن جس چیز کا تجربہ نہیں ہے وہ تو کیسے کہہ سکتا ہے وہ میں تجھے بتاتا ہوں۔ ماں باپ کے علاوہ انسان کو اولاد سب سے پیاری ہوتی ہے۔ یہ تو خود اللہ نے ہمیں بتایا ہے۔

کیسے بابا؟

''حضرت ابراہیم اللہ کے بہت عظیم عاشق تھے۔ آپ سے اللہ تعالیٰ نے عزیز ترین چیز کی قربانی طلب فرمائی اور آخر ثابت ہوا کہ وہ آپ کے فرزند حضرت اسماعیل تھے۔''

''ٹھیک ہے بابا''

''تو ہم پیارے رسول ﷺ سے عشق کرنا چاہیں تو ضروری ہوا کہ ان کی

اولاد کو اپنی جان سے زیادہ چاہیں اور یہ باجی لوگ رسول ﷺ کی اولاد ہیں بیٹے۔"

الٰہی بخش حیران رہ گیا۔ اس کا باپ زیادہ بولنے والا نہیں تھا وہ تو بہت کم بات کرتا تھا۔ پڑھا لکھا بھی نہیں تھا مگر کہاں سے گھما پھرا کر اسے اپنے مطلب کی بات پر لے آیا تھا۔ بات مدلل تھی لیکن الٰہی بخش کے دل اور ذہن نے قبول نہیں کی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اللہ اور رسول ﷺ سے بلاواسطہ عشق بھی تو کر سکتا ہے لیکن یہ بات اس نے باپ سے نہیں کی۔ وہ اور بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ میں اولاد نبی ﷺ پر اپنی جان بڑی آسانی سے قربان کر سکتا ہوں" باپ نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ "لیکن میری دعا ہے کہ کبھی وقت آئے تو میں اولاد رسول ﷺ پر اپنی اولاد بھی قربان کر سکوں۔ مگر جانتا ہوں کہ اس کے لئے بڑا دل چاہیے اور اللہ ہی دے سکتا ہے۔"

اس آخری جملے نے الٰہی بخش کو اور باغی بنا دیا۔ اسے احساس ہونے لگا کہ باپ اس سے محبت نہیں کرتا اور قربانی کے جانور سے زیادہ اس کی وقعت بھی نہیں ہے۔ اسے لفظ عشق سے چڑ ہو گئی۔ وہ سادات سے بچنے لگا۔ ان کے بچوں کے ساتھ کھیلنا تو اس نے بچپن میں ہی چھوڑ دیا تھا۔

اس گفتگو کے چند ماہ بعد ہی وہ واقعہ پیش آ گیا۔ پہلے تو اسے ایسا لگا کہ باپ کی دعا قبول ہو گئی ہے لیکن بہرحال وہ بچ گیا۔ زندہ رہا۔ البتہ سر سے پیشانی کے وسط تک زخم کا وہ بدنما نشان اسے اب بھی اس واقعے کی یاد دلاتا اور بے تعلقی کا احساس جگاتا تھا۔

اس واقعے کے بعد اس نے باپ سے کہا "ابا.........میں کراچی جانا چاہتا ہوں"

"کیوں؟"

"کراچی میں روزگار بہت ہے ابا۔ یہاں سے اچھا ہی رہوں گا وہاں۔"

"تیری مرضی بیٹے" باپ نے مختصراً کہا۔ وہ جانتا تھا کہ بیٹا ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میٹرک تک پڑھنے کے بعد الٰہی بخش نے تعلیم کو خیرباد کہہ دیا تھا اور روزگار کی فکر میں لگ گیا تھا۔ جزیرہ میں روزگار کی فکر بڑی فکر تھی۔ کیونکہ روزگار تھا ہی نہیں۔ زیادہ تر لوگ اس سلسلے میں باہر ہی جاتے تھے۔ کچھ ملک کے بڑے شہروں میں اور کچھ ملک سے باہر۔ اجازت دینے کے سوا وہ کیا کرتا۔

مگر الٰہی بخش کا مسئلہ روزگار نہیں تھا۔ وہ تو باپ کے عشق سے گھبرا کر بھاگ رہا تھا۔ وہ رنگ و روغن کا کام جانتا تھا اور اس کا اچھا کاریگر تھا۔ کام بھی ٹھیک ٹھاک مل جاتا تھا۔ اس لئے کہ وہ ایمان دار بھی تھا۔ یہ الگ بات کہ آخر میں وہ ایمان داری ہی اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوتے ہوتے رہ گئی لیکن اس دن کے بعد سے وہ باپ کے عشق سے خوف زدہ ہو گیا۔ اس کے لئے فرار ہونے میں ہی عافیت تھی۔

یہ الگ بات کہ عشق نے کراچی میں بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اسے کراچی آئے ہوئے ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ خود عشق میں مبتلا ہو گیا۔ مگر وہ عشق باپ کے عشق سے بالکل مختلف تھا۔

الٰہی بخش کو کراچی بہت پسند آیا۔ اس لئے کہ وہاں نام و نسب سے کسی کا کام نہیں چلتا تھا۔ وہاں آدمی کی شناخت اس کے کام اس کے ہنر سے ہوتی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اسے یہ خوش گوار احساس ہوا کہ اس کی اپنی بھی ایک شناخت ہے اور وہ اس شناخت سے بالکل مختلف ہے جو اس پر تھوپ دی گئی تھی۔ کراچی میں وہ جلاہوں کی اولاد ہونے

کی وجہ سے جانا نہیں تھا وہ الہی بخش تھا ---------- رنگ ساز الہی بخش۔

کراچی میں اسے دو مقام بہت زیادہ پسند آئے۔ ایک فیڈرل بی ایریا کے واٹر پمپ کی چورنگی اور دوسرا طارق روڈ پر کیفے لبرٹی کی چورنگی۔ اس کا بس چلتا تو وہ دونوں مقامات اپنا لیتا لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ اسے دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے کیفے لبرٹی کی چورنگی کے حق میں فیصلہ کیا۔ ایک وجہ یہ تھی کہ وہ بڑے لوگوں کا علاقہ تھا۔ دوسری یہ کہ وہاں رونق بہت ہوتی تھی۔ وہ علاقہ سے بھا گیا تھا۔

بعد میں زندگی بھر وہ یہی سوچتا رہا کہ اگر وہ کیفے لبرٹی کی بجائے واٹر پمپ پر بیٹھتا تو اس کی زندگی مختلف وسوسوں میں یعنی نہ وہ جتا ئے عشق ہوتا اور نہ اس کی زندگی نذرِ عشق ہوتی۔ اس کی سمجھ میں یہ بات بھی آگئی کہ معمولی سے غیر اہم سے فیصلے زندگی پر کتنے بھرپور طریقے سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس نے یہ بھی سمجھ لیا کہ فیصلے کا اختیار تو آدمی کو ہوتا ہے لیکن وہ انسان اپنی تقدیر کے مطابق ہی کرتا ہے۔ فیصلہ وہ کرتا ہے لیکن مرضی اوپر والے کی ہوتی ہے۔

کراچی میں محنت کے بازار جا بجا لگتے ہیں۔ ہر علاقے کا اپنا ایک بازار محنت ہے۔ کیفے لبرٹی کے آگے کی سمت بالکل مقابل جیولرز کی ایک دکان ہے اس کے سامنے والے فٹ پاتھ پر بھی ایسا ہی ایک بازار ہے۔ علاقے میں کسی کو کسی بھی نوع کی کسی خدمت کی ضرورت ہو تو وہ اس بازار کا رخ کرتا ہے۔ اس بازار میں ہر طرح کی محنت انسانی دکانوں میں، انسانی شوکیسوں میں سجی ہوتی ہے کہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس جاؤ اور خرید لو۔ فٹ پاتھ پر سجی ہوئی یہ انسانی دکانیں اپنے شو

کیس سمیت بمشکل دو فٹ جگہ گھیرتی ہیں۔ کہیں کوئی بیلچہ' کدال یا پھاوڑا نظر آئے تو سمجھ لیں کہ وہاں مزدور دستیاب ہے۔ پینٹ کے ڈبے پر برش اور رنگوں کا کارڈ نظر آئے تو وہ رنگ و روغن والا ہے۔ خالی تسلے پر کوچی رکھی ہو تو چونا کرنے والا ہے۔ پلمبنگ کے اوزار پلمبر کا پتا دیتے ہیں۔ کوئی شخص کرنی اور فرش بنانے والا تختہ لے بیٹھا ہو تو وہ راج مستری ہے۔ اور جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو' بس ایک لمبا سا میلا سا کپڑا کندھے پر ہو تو سمجھ لیں کہ وہ بوجھ ڈھونے والا مزدور ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسان کی شناخت اس کے شجرہ نسب سے نہیں' اس کے اوزاروں سے' اس کے ہنر سے ہوتی ہے۔

الٰہی بخش کو یہی بات پسند آئی تھی۔ اس نے پینٹ کا ایک خالی ڈبہ' کلر کارڈ اور اپنے برش لے کر اس فٹ پاتھ پر محنت کا انسانی شوکیس بن گیا۔ ڈیڑھ دو فٹ جگہ میں وہ بھی سج بن کر بیٹھ گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ زندگی سے خوش تھا۔

جلد ہی زندگی معمولات کی ڈگر پر چل پڑی۔ ایبٹ آباد سے سات لڑکوں کے ساتھ آیا تھا۔ ان آٹھوں نے مل کر اعظم بستی میں ایک مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ کرایہ سو روپے تھا۔ بجلی کا بل ملا کر ہر ایک کو زیادہ سے زیادہ بیس روپے دینے ہوتے تھے گھر سے وہ لوگ زیادہ پیسے نہیں لائے تھے۔ انہوں نے چارپائیاں خرید لیں۔ موسم ایسا تھا کہ فی الحال بستر کی ضرورت نہیں تھی۔ کھانا وہ باہر کھاتے تھے۔ لہٰذا برتنوں کا جھمیلا بھی نہیں تھا۔ زندگی آسانی سے شروع ہوئی۔ پھر سب سے اچھی بات یہ تھی کہ سب کو فوری روزگار بھی مل گیا۔

الٰہی بخش کے لئے یہ تجربہ بھی انوکھا تھا کہ وہ پردیس میں تھا لیکن ایک منٹ کے لئے بھی

سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ فٹ پاتھ پر آ کر بیٹھا تو پہلے ہی دن
سے کام مل گیا۔ کام بھی ایسا کہ چار دن اسے کام کے سوا کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔ وہ تو
سے بعد میں معلوم ہوا کہ بعض اوقات کئی کئی دن خالی بیٹھے بھی گزر جاتے ہیں۔ پہلی
بار اس نے جس کے ہاں کام کیا تھا، وہ اس کے کام سے اتنا خوش ہوا کہ اسے دس
روپے انعام بھی دیا۔ اس آغاز کے بعد کبھی یہ نوبت نہ آئی کہ اس کی جیب خالی رہی ہو
۔ ابتدائی میں الٰہی بخش کو اپنا شہر بہت یاد آیا۔ وہ ہمیشہ سوچتا کہ جیٹ آباد جیسا خوب
صورت اور سرسبز علاقہ دنیا میں کہیں نہیں ہوگا۔ ایسے سادہ اور پرامن لوگ کہیں ہو ہی
نہیں سکتے اور ایسا موسم اور آب و ہوا کہیں نہیں ملے گی۔ بات ٹھیک ہی تھی لیکن اندازہ
نہیں ہوا کہ کراچی کس طرح اس کے دل میں گھر کر رہا ہے۔ وہ تو ایک دن چونکا۔ اسے احسا
س ہوا کہ اسے کراچی سے محبت ہوگئی ہے۔ اس نے دل کو ٹٹولا تو پتا چلا کہ اس محبت نے
اس کے دل کی گہرائی میں جڑیں پکڑ لی ہیں۔ غور کیا تو ثابت ہوا کہ کراچی اس محبت کا
مستحق ہے۔

الٰہی بخش کراچی کے متعلق سوچتا تو اس کا وجود احساسِ شکر گزاری سے سرشار
ہو جاتا۔ اس کے ذہن میں غریب پرور شہر، برکتوں کا شہر، خدا کی رحمتوں کا مرکز جیسے
عنوان گونجنے لگتے۔ کراچی کے لوگ بہت اچھے تھے۔ فراخ دل، محبت کرنے والے
اور پرسکون۔ الٰہی بخش ایسے کتنے ہی لوگوں سے مل چکا تھا، جو بغیر ٹکٹ کے ریل میں
چھپتے چھپاتے سفر کرتے کراچی پہنچے تھے اور ان کی جیبیں خالی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ
اس کے باوجود انہیں کبھی بھوکا نہیں سونا پڑا تھا۔ کسی کو اسٹیشن کی حدود میں ہی روزگار مل
گیا تھا اور کسی کو شہر پہنچ کر۔ روزگار کی فراوانی تھی۔ کھانے پینے کا بھی یہ تھا کہ ایک روپے

میں بھی پیٹ کی آگ بجھائی جاسکتی تھی۔ سونے کا ٹھکانہ میسر نہ ہوتا تو لوگ پارکوں' بازاروں میں بھی سو لیتے تھے۔ کھلا آسمان انہیں تحفظ فراہم کرتا تھا۔ اب ایسے شہر سے کوئی محبت کے بغیر رہ سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ کراچی سے چلے جانے کے بعد بھی کراچی کے مہمان اس شہر سے محبت کرتے تھے۔ اسے یاد رکھتے تھے۔ آج بھی دیکھ لیں۔ ملک کے ہر بڑے چھوٹے شہر میں بلکہ چھوٹے چھوٹے قصبوں تک میں کراچی کے نام کی کوئی دکان' کوئی ہوٹل ضرور ملے گا جو ایک بار کراچی رہ گیا' اس نے اس شہر کے نام کو اپنی خوش بختی کی علامت ضرور سمجھا۔

سو کراچی آتے ہی الٰہی بخش محبت سے آشنا ہو گیا۔ ورنہ وہ تو عشق اور محبت سے خوف زدہ تھا۔

الٰہی بخش نے انگریزی زبان کا یہ مقولہ سنا بھی نہیں تھا کہ صبح سویرے رزق کی تلاش میں نکلنے والے پرندے کو کھانے کے لئے سب سے زیادہ کیڑے ملتے ہیں۔ مگر وہ تھا بہت سویرے اٹھنے والا پرندہ اور سویرے اٹھ کر گھر میں وقت ضائع کرنے کا وہ قائل نہیں تھا۔ گھر میں دل لگانے کا کوئی سامان تھا بھی نہیں۔ چنانچہ وہ تیار ہو کر باہر نکلتا' ہوٹل میں ناشتہ کرتا اور محبت کا بازار لگنے سے پہلے ہی بازار پہنچ جاتا۔ وہاں اس کے لئے طمانیت ہی طمانیت تھی۔ ذرا سی دو فٹ کی جگہ سے ملکیت کا احساس دلاتی تھی۔ یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ صاحب جائیداد ہے۔ وہ کیلا چپٹے ٹھکانے پر آ بیٹھتا۔ پینٹ کے خالی ڈبے رکھ کر وہ اپنی دکان سجاتا۔ پھر پاؤں پھیلا کر بیٹھ وہ گردو پیش کی ویرانی دیکھتا رہتا۔

سچ پوچھو تو وہ وہاں اتنی صبح صرف اداس ہونے کے لئے آتا تھا۔ البتہ سے

س بات کا کبھی احساس نہیں ہوا۔ سنسان سڑکیں' بند دکانیں اور سوئے ہوئے فلیٹ دیکھ کر وہ اداس ہو جاتا۔ اسے یقین نہیں آتا کہ شام اسی جگہ اتنی چہل پہل تھی کہ فٹ پاتھ پر کسی نہ کسی سے ٹکرائے بغیر چلنا ممکن نہیں تھا۔ اتنی گاڑیاں سڑک پر تھیں کہ بعض اوقات ٹریفک آدھا آدھا گھنٹا جام رہتا تھا۔ ہارنوں کا' لوگوں کا ایسا شور تھا کہ خاموشی کی طلب ہونے لگتی تھی۔ دکانوں پر اتنی بھیڑ تھی کہ لگتا تھا' ہر چیز مفت بانٹی جا رہی ہے اور اب.........اب اتنا سناٹا۔ کوئی بھولی بھٹکی گاڑی سامنے سے گزر جاتی تو لگتا کہ سناٹے کا شیشہ چھن سے ٹوٹ گیا ہے۔

یہ منظر دیکھ کر الٰہی بخش کو ایبٹ آباد یاد آنے لگا.........ایبٹ آباد نہیں' وہاں کا موسم خزاں۔ جب ٹنڈ منڈ درختوں کو دیکھ کر وہ اداس ہو جاتا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ درخت مر گئے ہیں۔ وہ جانتا تھا لیکن پھر بھی اسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ درخت پھر ہرے ہوں گے۔ نئی کونپلیں پھوٹیں گی۔ شاخوں پر نئے پتے نکلیں گے۔ ہر سال وہ یہ عمل دیکھتا۔ مگر درختوں کو خزاں رسیدہ دیکھتا تو یقین نہ آتا کہ یہ موت عارضی ہے۔ اس کا فائدہ یہ تھا کہ وہ بدترین اور انتہائی مایوس کن صورت حال میں بھی پر امید رہتا تھا۔ کیونکہ ہر خزاں کے بعد اس نے بہار آتے دیکھی تھی۔

کراچی میں موسم کی وہ کرشمہ کاریاں تو نہیں تھیں لیکن اس کا متبادل صبح کی ویرانی کی شکل میں مل گیا تھا۔ یہاں لوگ دیر تک سوتے تھے۔ صبح نو بجے تک تو ہر طرف سناٹا رہتا۔ پھر جیسے زندگی انگڑائی لے کر بیدار ہوتی۔ دس بجے سے چہل پہل شروع ہو تی۔ شام کو رونق اپنے شباب پر ہوتی۔ ایسی رونق ہوتی کہ وہ کوشش کے باوجود صبح کی ویرانی کا تصور بھی نہ کر پاتا۔ لگتا جادو کے زور سے سب بدل گیا ہے۔

اس کے نزدیک یہ کراچی کے بہار، خزاں تھے۔ ایبٹ آباد میں خزاں تین مہینے رہتی تھی اور سال میں ایک بار آتی تھی۔ یہاں خزاں ہر روز آتی تھی اور دن گھنٹے کے لیے آتی تھی۔ وہاں خزاں سچ مچ کے درختوں پر آتی تھی۔ جبکہ یہاں رشتوں کے درخت خزاں میں ٹنڈ منڈ ہو جاتے تھے۔ یہاں کی خزاں کے تین گھنٹے وہاں کی خزاں کے تین ماہ سے زیادہ کرب ناک تھے۔ وہاں تو وہ خزاں رسیدہ درختوں کے دکھ میں شریک رہتا تھا۔ تنہائی کا احساس تو نہیں ہوتا تھا مگر یہاں اسے لگتا کہ کسی نے جادو کے زور پر انسانوں کو ہر چیز کو پتھر کا بنا دیا تھا اور پتھر کی عمارتوں میں مجسمے قید ہیں۔ اسے تنہائی کا بہت شدید احساس ہوتا تھا۔ لگتا تھا کہ پوری کائنات میں خدا کے اور اس کے سوا کوئی موجود نہیں۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ وہ تنہائی اسے خوف زدہ نہیں کرتی تھی۔ بلکہ سوچنے پر اکساتی تھی۔ دنیا کی بے ثباتی اس پر بالکل واضح ہو جاتی تھی۔ زندگی میں پہلی بار اس کی سمجھ میں یہ بات آئی تھی کہ نیند عارضی موت ہوتی ہے۔

تو یوں ہر صبح الٰہی بخش دوائی سے اپنے دن کا آغاز کرتا۔ وہ بیٹھ کر زندگی، موت اور موسموں کے بارے میں سوچتا رہتا اور اچانک اسے احساس ہوتا کہ اس استغراق کے عالم میں اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کسی نے جادو کی چھڑی گھمائی ہے اور دنیا پھر سے زندہ ہو گئی ہے۔

دن گزرے تو ساتھ بیٹھنے والے مزدوروں سے دوستی بھی ہو گئی۔ وہ سب ایک فیملی کی طرح تھے۔ کبھی جھگڑے بھی ہوتے لیکن ایک دوسرے کا خیال رکھتے۔ اس طرح ساتھ رہنے میں ایک اچھی بات پیدا ہو گئی تھی۔ ان کا عقیدہ درست ہو گیا تھا۔ اس بات پر ایمان پختہ ہو گیا تھا کہ جس کو جتنا رزق ملنا ہے اتنا ہی ملے گا اور کوئی کسی کا

حق نہیں دے سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ کسی پیشے والے کو کام ملتا تو دوسرے کاریگر اس سے حسد نہ کرتے۔ یہ نہ سوچتے کہ وہ نہ ہوتا تو شاید کام انہیں مل جاتا۔

الہی بخش کو بوجھ ڈھونے والے مزدوروں میں خاصی دلچسپی تھی۔ وہ چیونٹیوں کی سی فطرت رکھنے والے تھے۔ مل کر گروہ کی صورت میں کام کرتے۔ وہاں چھ مزدوروں کا ایک گروپ تھا۔ الہی بخش جانتا تھا کہ ان لوگوں کا کام بہت سخت ہے۔ فرنیچر کی دکان سے بھاری فرنیچر ٹرک پر لادنا۔ پھر اس سامان کو منزل پر پہنچا کر مرضی کی جگہ پر رکھنا۔ بعض اوقات انہیں سامان چوتھی منزل تک پہنچانا پڑتا۔ کوئی شخص مکان تبدیل کرتا تو اسے ان مزدوروں کی ضرورت پڑتی۔ کام دو گھنٹے میں نمٹے یا دس گھنٹے، دیہاڑی وہ پورے دن کی لیتے۔ کام ایسا تھا کہ وہ تھکن سے چور ہو جاتے۔

انہیں دیکھ کر الہی بخش کو یا تو چیونٹیوں کا خیال آتا تھا یا شہد کی مکھیوں کا۔ کم از کم اس گروپ میں جس سے وہ واقف تھا۔ تنظیم بھی تھی اور ڈسپلن بھی تھا۔ گروہ کا سردار وہ ہوتا تھا جس کی عمر سب سے زیادہ ہوتی تھی۔ اس کی بوجھ اٹھانے کی صلاحیت بھی سب سے کم ہوتی تھی۔ وہ ہاتھ ضرور بٹاتا تھا لیکن اس کے ساتھی اسے زیادہ بھاری سامان اٹھانے نہیں دیتے تھے۔

وہیں الہی بخش کو یہ علم ہوا کہ بوجھ اٹھانے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ اسی سے زیادہ عمر والے کو سردار بنایا جاتا ہے لیکن اصل سردار سب سے کم عمر لڑکا ہوتا تھا۔ جو سب سے زیادہ بوجھ اٹھانے کی اہلیت رکھتا تھا۔ وہ لڑکا اپنے ساتھیوں کو تحفظ فراہم کرتا تھا۔ سب سے بھاری سامان وہ اٹھاتا تھا۔ چار پانچ سال میں وہ عام مزدوروں کی طرح ہو جاتا تھا اور گروپ کو اس کا متبادل تلاش کرنا ہوتا تھا۔ سردار سے لے کر تمام عام مزدور

اس مرحلے سے گزر چکے ہوتے تھے۔

ل سے الٰہی بخش کو ان کی تنظیم کا اندازہ ہو گیا۔ وہ تو باقاعدہ یک وارہ سا تھا۔ مزدور جیسے جیسے جسمانی تنزلی کی طرف بڑھتا تھا، اس کا مرتبہ بھی بڑھتا رہتا تھا ور اس سے کام کم لیا جاتا تھا۔ اس کا احترام زیادہ ہوتا تھا۔ اس کے تجربے سے فائدہ ٹھانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ وہ بوجھ اٹھانے کی پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ چٹکیوں میں حل کر دیتا تھا۔ پھر ایک وقت آتا تھا کہ سینئر مزدور کو ریٹائر ہو جانا پڑتا تھا۔ قدرت کا نظام ایسا تھا کہ اس وقت تک اس کا بیٹا بڑا ہو چکا ہوتا تھا۔ وہ ذمے داری سنبھال لیتا تھا۔ پچھ ورنہ کر پاتا تو بڑے باپ کے ہی گروپ میں کام سنبھال لیتا اور کوئی مزدور بیٹے کا باپ نہ ہوتا یا اس کا بیٹا بہت چھوٹا ہوتا تو ساتھی مزدور اس کے لیے اتنا بندوبست کر دیتے کہ وہ کہیں بیٹھ کر پھل سبزی یا کوئی اور چیز بیچنے لگتا۔ اس کی بجائے گروپ میں نیا خون شامل کر لیا جاتا۔

الٰہی بخش کو یہ سب جلدی معلوم ہو گیا۔ اس کی یک وجہ تو یہ تھی کہ گروپ کا سردار قاسم اس پر بڑا مہربان تھا۔ وہ اس پر غیر معمولی شفقت کرتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ گروپ ان دنوں بحران کی زد میں تھا۔ انہیں گروپ میں شامل کرنے کے لیے نیا خون نوعمر مزدور درکار تھا۔ قاسم بوڑھا ہو گیا تھا۔ اب وہ بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔

یک دن الٰہی بخش نے قاسم سے پوچھا۔ چاچا۔۔۔۔ تمہاری عمر کتنی ہے ؟"

"میں تمہیں شمار سے بتا سکتا ہوں" قاسم نے مسکراتے ہوئے کہا"

حساب تمہیں ہی لگانا ہوگا۔ مزدوری کے سوا کوئی حساب نہیں لگ سکتا"

"چلو اشارے ہی دے دو"

قاسم چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا "پاکستان بنا تو میں پچیس سال کا تھا"

الٰہی بخش حیران رہ گیا "ارے ــــــــــ تم صرف 40 سال کے ہو" اس کی حیرت بجا تھی قاسم دیکھنے میں ساٹھ سال کا لگتا تھا۔

"بیٹا یہ کام ہی ایسا ہے کہ آدمی کو اندر سے چاٹ لیتا ہے۔ کھوکھلا کر دیتا ہے۔ اب تو مجھ سے بوجھ اٹھایا بھی نہیں جاتا۔ جیسے ہی کوئی نیا لڑکا ملے گا' میں یہ کام چھوڑ دوں گا۔ زیادہ دیر ساتھیوں پر بوجھ تو نہیں بن سکتا"

الٰہی بخش جانتا تھا کہ وہ لوگ کسی جوان لڑکے کی تلاش میں ہیں' بچے تمہارے کتنے ہیں چاچا؟ اس نے پوچھا۔

"منزل ابھی دور ہے" قاسم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میرا بڑا بیٹا ابھی صرف دس سال کا ہے۔"

الٰہی بخش کو دکھ ہوا۔ مزدور کے لیے بچوں میں صرف بیٹے کی اہمیت تھی اور وہ بھی بڑے بیٹے کی۔ یقینی طور پر اس بڑے بیٹے سے بڑی قاسم کی کوئی بیٹی بھی ہو گی ــــــــــ بلکہ ممکن ہے' بیٹیاں بھی ہوں لیکن وہ بتانا نہیں چاہتا تھا تو کریدنا بھی مناسب نہیں تھا۔ "آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ بھی کر لوں گا۔ پھیری والا بن کر گھر جاؤں گا۔ لوگوں کی خدمت اب بھی کرتا ہوں' جب بھی کروں گا؟ــ"

اس گفتگو کے ایک ہفتے بعد بوجھ ڈھونے والے مزدور کو مطلب کا ایک لڑکا

مل گیا۔ اس روز جشن کا سا سماں تھا۔ وہ سب بہت خوش تھے لیکن سب سے زیادہ خوش عباس تھا۔ عباس وہ لڑکا تھا جو اب تک گروپ میں سب سے کم عمر تھا۔ الہی بخش اس کی خوشی کو سمجھ سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عباس پچھلے پانچ سال سے سب سے زیادہ بوجھ اٹھاتا رہا ہے۔ وہ اب بھی جوان تھا لیکن عمر سے بہت بڑا لگنے لگا تھا اور اب اسے پانچ برسوں کا صلہ ملنے والا تھا۔ اب بہت بھاری بوجھ اس کے لئے نہیں تھا۔ اس کی جگہ کسی اور نے لے لی تھی۔ اب آنے والے وقت میں اس کے لیے سختی کم سے کم ہوتی جاتی تھی۔

نئے مزدور کا نام زرو خان تھا۔ اس کی عمر مشکل انیس سال ہوگی۔ دیکھنے میں وہ بالکل جوان و رنہیں لگتا تھا۔ الہی بخش نے یہ بات قاسم سے بھی کہہ دی۔ قاسم باچھیں پھیلاتے ہوئے مسکرایا۔ ارے بیٹا وہ

بہت شاندار لڑکا ہے۔ وہ بولا "لیکن تمہارے پاس مزدوری کی آنکھ تو نہیں ہے نا' کام ملنے دو۔ پھر اس کے

جوہر دیکھنا۔

چاند رہونہ ہو یا لڑکا مبارک بہر حال تھا۔ پہلے ہی دن انہیں کام مل گیا۔ ایک بڑی فیملی طارق روڈ سے ناظم آباد شفٹ ہو رہی تھی۔ سامان دوسری منزل سے اتارنا اور چوتھی منزل پر چڑھانا تھا۔ مزدور بہت خوش تھے۔

مزدور تیاریوں میں لگے ہوئے تھے کہ قاسم الہی بخش کے پاس آیا۔ کیا خیال ہے بیٹے آج چھٹی کر سکتے ہو؟ اس نے مشفقانہ لہجے میں پوچھا۔

کیا بات ہے چاچا کوئی کام ہے؟ الہی بخش نے پوچھا۔

''کام تو نہیں، جی چاہتا ہے آج کا دن ہمارے ساتھ گزارو۔''

''ٹھیک ہے چاچا۔ میرے لئے تو یہ خوشی کی بات ہے۔ میں چلوں گا تو لوگوں کے ساتھ''

''بات صرف کام کی نہیں رات کا کا کھانا بھی میرے گھر پر کھاؤ گے ------ سب کے ساتھ''

''یہ بھی ہو جائے گا۔ اپنا کوئی گھر پر انتظار کرنے والا تھوڑی ہے۔'' الٰہی بخش نے بے فکری سے کہا۔

ٹرک آیا تو الٰہی بخش بھی سب مزدوروں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ صاحب خانہ انہیں دوسری منزل پر اپنے فلیٹ میں لے گئے۔ فلیٹ میں بتری پھیلی ہوئی تھی۔ سامان کاٹھ کباڑ کی طرح بکھرا ہوا تھا لیکن الٰہی بخش اندازہ کر سکتا تھا کہ گھر یہ لئے کے ردے سے پہلے اس سامان کے ساتھ یہ فلیٹ کیسا لگتا ہوگا۔ سچ یہ ہے کہ اس نے ایسا سامان پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ قالین، صوفے، بیڈ، الماریاں، ٹی وی، ورنہ جانے کیا کیا۔ تو گھر ایسے بھی ہوتے ہیں، اس نے حیرت سے سوچا، اور گھروں میں سامان ایسا بھی ہوتا ہے۔

صاحب خانہ قاسم کو سامان دکھا رہا تھا۔ ''یہ ان ڈبوں میں کانچ کے برتن ہیں'' ۔ وہ اشارہ کرتے

ہوئے کہہ رہا تھا، انہیں احتیاط سے اتارنا ہوگا۔

''آپ بے فکر رہیں صاحب۔ قاسم نے کہا۔'' ایک پیالی بھی نہیں ٹوٹے گی

اللہ کے حکم سے''۔

صاحب اس بات سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔''اور یہ فرنیچر بالکل نیا ہے۔''
اس نے کہا۔خراش بھی نہیں پڑنی چاہیے کسی چیز پر۔

''آپ فکر نہ کریں صاحب۔جیسا آپ کا سامان ہے'ایسا ہی اترے گا اور
ایسا ہی چڑھے گا دوسرے مکان میں'' قاسم نے کہا۔

''صاحب اس بات سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔''اور یہ فرنیچر بالکل نیا ہے
۔''اس نے کہا۔خراش بھی نہیں پڑنی چاہیے کسی چیز پر۔

''آپ فکر نہ کریں صاحب جیسا آپ کا سامان ہے ایسا ہی اترے گا اور ایسا
ہی چڑھے گا دوسرے مکان میں۔قاسم نے کہا۔

بس تو شروع کرو دو''صاحب نے حکم دیا۔

مزدوروں کے درمیان مشاورت نہیں ہوئی لیکن انہوں نے کام اس انداز
میں شروع کیا جیسے سب کچھ پہلے ہی سے طے رہا ہو۔بھاری فرنیچر نے لڑکے کی ذمے
داری تھا۔لکڑی کی یک الماری بہت بھاری تھی۔اس کے لیے قاسم نے صاحب کو
آواز دی'وہ آیا تو اس نے پوچھا۔''صاحب یہ الماری کھلنے والی ہے۔؟

''نہیں۔''

قاسم کو مایوسی ہوئی۔کھلنے والی ہوتی تو آسانی رہتی۔اس نے کہا
تم لوگوں کے لئے یہ بڑا مسئلہ تو نہیں''صاحب نے بے نیازی سے کہا۔

''وزن کی بات نہیں صاحب'' قاسم نے بے حد اعتماد سے کہا''لیکن زینے
بہت تنگ ہیں خراش

لگ سکتی ہے۔ خیر اللہ مالک ہے۔ وہ نے لڑکے زردادی طرف متوجہ ہو گیا۔ بیٹے پہلے بھی تارڑ نے عیاس تیرا ساتھ دے گا۔

''اس کی ضرورت نہیں استاد۔ زرداد بولا۔ بس اسے میری پیٹھ پر لا دو۔

قاسم جواب میں کچھ کہنے والا تھا مگر کچھ سوچ کر رک گیا۔ الٰہی بخش نے پسے انداز میں کہ کسی کو محسوس نہ ہو' الماری کو کھسکانے کی کوشش کی لیکن الماری بہت بھاری تھی' یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں تھی کہ اکیلا زرداد خان اسے کمر پر اٹھا کر نیچے تارے گا۔

مزدوروں نے مل کر الماری زرداد کی کمر پر رکھ دی۔ یک چادر کو بل دے کر الماری کے درمیانی حصے سے گزار کر زرداد خان نے اپنے پیٹ پر چادر کو گرہ لگا دی۔ پھر وہ چل پڑا۔ تمام مزدوروں کے چہروں پر خوشی سنسناری تھی۔ ان میں سے دو زرداد کے آگے تھے وہ باقی اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں کوئی سامان نہیں تھا۔ شاید اس لئے کہ انہیں یقین نہیں تھا کہ زرداد الماری کو نیچے پہنچا سکے گا۔ کسی بھی وقت سے ہنگامی طور پر مدد کی ضرورت پڑ سکتی تھی اور وہ سب اس کے لیے تیار تھے۔ الٰہی بخش کو قاسم کی مزدوری نظر کا قائل ہونا پڑا۔

زرداد کو کسی کی مدد کی ضرورت نہیں پڑی۔ درمیان میں وہ کہیں یک سانس کے لیے بھی نہیں رکا۔ الماری اس نے نیچے اتار دی' اور پیشانی سے پسینہ پونچھنے کے بعد بغیر کسی توقف کے زینوں کی طرف چل دیا۔ اب مزدوروں کے چہروں پر خوشی کے ساتھ اعتماد بھی تھا۔ صحیح معنوں میں کھل اٹھے تھے۔

اس کے ساتھ ہی کام کی گہما گہمی شروع ہو گئی۔ جسموں میں جیسے بجلیاں بھر

گئیں۔ الٰہی بخش کو بھی بے مصرفی کا احساس ستا رہا تھا۔ تمام مزدور خاموشی سے کام
میں لگ گئے تھے۔ کوئی سستی نہیں دکھا رہا تھا۔ کانچ کے برتنوں والے ڈبوں کی طرف
کسی نے دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ شاید قاسم کی ذمے داری تھی۔

قاسم ایک کارٹن لے کر چلا گیا تو الٰہی بخش نے ادھر ادھر دیکھا اور ایک
نشست والے صوفے کو ہلا جلا کر دیکھا۔ وہ بھاری نہیں تھا۔ اس نے اسے اٹھا کر
کندھے پر رکھا اور چل دیا۔

الٰہی بخش ایک جاندار پہاڑی جوان تھا لیکن صوفے کو اٹھا کر نیچے لے
جانے میں اس کی سانس اکھڑ گئی۔ جسم سے پسینہ جیسے ابل پڑا تھا۔ پہلی بار اس کی سمجھ
میں آیا کہ قاسم ٹھیک کہہ رہا تھا۔ یہ کام واقعی آدمی کو اندر سے چاٹ لیتا ہوگا۔

نیچے قاسم نے اسے صوفے کے ساتھ لڑکھڑاتے دیکھا تو صوفہ اتارنے میں
اس کی مدد کی اور بولا۔ ”بیٹا میں تجھے بوجھ اٹھانے کے لیے تو نہیں لایا ہوں۔ خبردار جو کسی
چیز کو ہاتھ لگایا۔“

”لیکن چاچا۔ خالی رہنا مجھے برا لگ رہا ہے۔“ الٰہی بخش نے ہانپتے ہوئے کہا۔

”کوئی ضرورت نہیں۔ تو تو مہمان ہے ہمارا۔“

”نہیں چاچا۔ کچھ نہیں کرنے سے اچھا ہے کہ میں چلا جاؤں۔“

قاسم کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”تو ٹھیک ہے تو میرے
ساتھ برتنوں والے ڈبے اتروا دے۔ وہ نازک کام ہے۔ احتیاط سے کرنا ہوگا۔“

پورا سامان نیچے اتارنے میں دو گھنٹے لگے۔ پہلے صوفے کے بعد الٰہی بخش
نے کسی بھاری چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بھاری بوجھ بھی اٹھ سکتا ہے لیکن

بھاری سامان کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنا اور اترنا کسی اور ہی دنیا کا کام لگتی تھی۔

سامان کو ٹرک میں لدوانے میں قاسم کی مہارت سامنے آئی۔ جتنا سامان اس نے ٹرک میں لدوادیا' الٰہی بخش کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ممکن ہے۔ یہ سرد ار تجربہ تھا کہ کون سی چیز پہلے رکھی جائے اور کون سی چیز بعد میں۔ ٹرک میں موجود جگہ کو کیسے بہتر سے بہتر طور پر استعمال کیا جائے۔

وہ ٹرک میں بیٹھ کر ناظم آباد چلے۔ الٰہی بخش اس وقت تک بری طرح تھک چکا تھا یعنی وہ بوجھ اٹھانے کا کام نہیں کر سکتا تھا۔ مزدور تھکے ضرور تھے لیکن ٹرک میں بیٹھ کر یک دوسرے کو چھیڑتے ستاتے' تھکن ان کے چہرے سے ڈھلتی لگ رہی تھی۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ مزدور بھی نہ ہوتے شاید۔ کیونکہ اب انہیں زیادہ سخت مرحلہ درپیش تھا۔ انہیں سامان چوتھی منزل پر چڑھانا تھا۔

ٹرک کے سفر کے دوران الٰہی بخش زردادخان کو غور سے دیکھتا رہا۔ وہ ابھی تک پچھلی ٹولی میں گھلا ملا نہیں تھا۔ الگ تھلگ بیٹھا تھا مگر عباس اس کام کو آسان کرنے میں لگا ہوا تھا وہ زردادخان کے پاس بیٹھا اس سے باتیں کر رہا تھا۔ زردادخان کے چہرے پر اور آنکھوں میں صرف طمانیت تھی۔

الٰہی بخش نے سرگوشی میں قاسم سے کہا ''واقعی چاچا۔ یہ نیا لڑکا تو کام کا نکلا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ اتنا بوجھ اتنی آسانی سے اٹھا سکتا ہے۔''

''بیٹے بوجھ اٹھانے کے لئے جاندار ہونا ضروری نہیں۔ یک تو یہ پیدائشی صلاحیت ہوتی ہے پھر آدمی جی دار ہو تو زردادخان جیسا ہی ہوتا ہے مگر یک بات بتاؤں

۔

قاسم کے لہجے میں تاسف ابھر آیا "ایسے لوگ زیادہ دن نہیں چلتے" یہ لوگ زیادہ نہیں چلتے' میں نے بہت جلدی خون تھوکتے دیکھا ہے انہیں۔

الٰہی بخش لرز کر رہ گیا۔ تب تو یہ ظلم ہے چاچا "ظلم نہیں یہ زندگی ہے" قاسم نے سادگی سے کہا " یہ زرد وخان خوش نصیب ہے کہ ہماری ٹولی میں آ گیا۔ میں نے لڑکوں کو اس کے سلسلے میں سمجھا دیا ہے۔"

وہ یک عجیب اور بھرپور دن تھا۔ اس روز الٰہی بخش نے جو دیکھا' سیکھا' سمجھا ور جانا' وہ عمر بھر اس کے ساتھ رہا' یہ بات اس پر واضح ہو گئی کہ طبقاتی تقسیم یک بہت بڑی حقیقت ہے۔ کہیں خاندان' برادری اور حسب ونسب کی اونچ نیچ ہے تو کہیں حیثیت کا تفاوت ہے۔ وہاں بعثت آباد میں وہ چکر تھا' اور یہاں کراچی میں یک صاحب طبقہ تھا 'جو بڑے آراستہ گھروں میں رہتا تھا۔ روپیہ پیسہ اس طبقے کے لئے مسئلہ نہیں تھا۔ جبکہ دوسرا طبقہ وہ روپے کمانے کے لئے ہر روز ایسا بوجھ ڈھوتا' جس سے بوجھ ڈھونے والے جانور بھی گھبرا جائیں اور کچھ عرصے کے بعد وہ خون تھوکتا زندگی کی پھسلن سے موت سے کی طرف پھسل جاتا۔

یہ سب سوچ کر الٰہی بخش پر تھرتھری چڑھنے لگی۔ یہ زندگی ہے' اتنے لوگوں کے لئے اتنی مختلف۔

زرد وخان وہی الماری اس بار بھی بغیر رکے اوپر چوتھی منزل کے فلیٹ تک لے گیا تھا یک اچھی بات یہ تھی کہ اس بلڈنگ کے زینے کشادہ تھے۔ اس سے کام آسان گیا۔ ورنہ طارق روڈ والی بلڈنگ میں زینے کے موڑ پر سامان اتارنے کے لئے ترکیبیں لڑانی پڑی تھیں۔

انہیں کام سے فارغ ہوتے ہوتے چھ بج گئے۔ صاحب بہت خوش تھا۔ کسی چیز کو معمولی سی خراش بھی نہیں آئی تھی۔ کوئی برتن نہیں ٹوٹا تھا۔ ''آپ سب چیک کرلیں صاحب۔ قاسم نے اس سے کہا۔ ''ہمارا کام ختم ہوگیا ہے''

''چیک کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں بہت خوش ہوں تم لوگوں سے۔ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں بھی تمہیں خوش کردوں گا۔''

تھوڑی دیر بعد صاحب نے چائے اور بسکٹوں سموسوں سے ان کی تواضع کی۔ پھر اس نے دس روپے کے آٹھ نوٹ قاسم کی طرف بڑھائے'' یہ ہے تم لوگوں کی مزدوری'' اس نے کہا پھر اس نے سو کا ایک نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ یہ ہے مجھے خوش کرنے کا انعام۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تم آٹھوں کے لیے۔''

وہ صاحب کا شکریہ ادا کرکے، اسے سلام کرکے نیچے آگئے۔ سب بہت خوش تھے۔ ان کے حساب سے انہیں ڈھائی دن کی دیہاڑی ایک ہی دن میں مل گئی تھی۔ چونکہ رمضو کو خیال آیا کہ کھانا نہیں کھایا گیا ہے اور بھوک لگ رہی ہے۔ عاقل نے بھی تائید کی۔

''نہیں بھئی یہ کھانے کا وقت نہیں۔ قاسم نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''اس وقت کھالو گے تو رات کو دیر سے گھر پر کیا کھاؤ گے۔''

بات معقول تھی۔ استاد کھانا کس وقت ملے گا؟

''آٹھ بجے تیار ہوگا کھانا میں کہہ کر آیا ہوں۔ قاسم نے کہا چلو کسی ہوٹل میں چلتے ہیں جسے زیادہ بھوک لگی ہو وہ کچھ بسکٹ سموسے کھالے۔''

وہ سب ایک ریسٹورنٹ میں چلے گئے۔ رمضو اور عاقل کے سوا کسی نے

سمو سے نہیں کھائے۔ وہاں قاسم نے مزدوری کی رقم تقسیم کی۔ اس نے بائیس روپے

الٰہی بخش کی طرف بڑھائے تو وہ حیران رہ گیا "یہ کیا چاچا"

یہ تمہارا حصہ ہے؟

"لیکن چاچا میں تو مہمان ہوں۔ تمہارے ساتھ یک دن گزارنے کے

لیے آیا تھا۔ الٰہی بخش نے احتجاج کیا۔

یہ تو تمہیں لینا پڑے گا۔ صاحب نے آٹھ آدمیوں کی مزدوری دی ہے۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا"

"بے کار بات مت کرو" قاسم نے اس کی بات کاٹ دی۔ تمہاری حصہ

لے کر ہم گناہگار بنے گے کیا؟

اس پر سب پیچھے پڑ گئے۔ الٰہی بخ کو وہ پیسے لینے ہی پڑے لیکن اسے بہت

شرمندگی ہو رہی تھی۔

ہوٹل سے باہر آ کے قاسم نے کہا "یہ الٰہی بخش اور ررردو میرے ساتھ جا رہے ہیں۔ تم

لوگ آٹھ بجے تک میرے گھر پہنچ جانا۔"

باقی سب لوگ چلے گئے۔ قاسم الٰہی بخش اور رررو کو لے کر بس سٹاپ کی طرف چل پڑ

۔ اس وقت صدر جانے والی بسوں میں رش نہیں تھا۔ انہوں نے مزے سے بیٹھ کر سفر کیا

۔ نمائش کے سٹاپ پر وہ اتر گئے۔ وہ جیکب لائن میں رہتا ہوں۔ یہاں سے زیادہ

قریب پڑتا ہے میرا گھر۔ قاسم نے وضاحت کی۔

سڑک پر کوئی پانچ منٹ چلنے کے بعد وہ کچے پکے مکانوں کے علاقے میں

پہنچ گئے۔

ب وہ تنگ گلیوں میں چل رہے تھے' جہاں دونوں طرف مکان ہی مکان تھے' زیادہ تر مکان یسے تھے کہ ان میں ٹاٹ کے پردے ہی دروازے کا کام کرتے تھے۔ یسے ہی یک دروازے پر انہیں ٹھہرا کر قاسم ٹاٹ کا پردہ ہٹا کے اندر چلا گیا۔ چند لمحوں بعد اس نے انہیں آواز دی آ جاؤ۔ وہ پردہ ہٹا کے اندر چلے گئے۔

دروازے سے داخل ہوتے ہی چھوٹا سا صحن کے پار دو کمرے تھے۔ ایک کچا کمرہ تھا دوسرا پکا۔ پکے کمرے کی چھت ٹین کی چادروں کی تھی۔ سائیڈ میں باورچی خانہ اور غسل خانہ تھا۔ صحن کے اس طرف والے حصے میں بیت الخلا تھا۔ درمیان میں یک ٹنکی رکھی تھی۔

قاسم نے درمیان میں پڑا پردہ کھینچ کر گویا پردے کا اہتمام کر دیا۔ اس طرف تین چار چارپائیاں پڑی تھیں۔ تکیے بھی رکھے تھے۔ قاسم نے اشارہ کرتے ہوئے کہا "بیٹھ جاؤ اور تھکن ہو رہی ہو تو پاؤں پھیلا لو۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔"

الہی بخش اور زردو بیٹھ گئے۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر قاسم زردو کو بوجھ اٹھانے کے رموز سمجھانے لگا۔ الہی بخش توجہ سے سنتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا' کون جانے یہ باتیں بھی کام آ ہی جائیں۔

وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ وہ لوگ تو اس وقت چونکے جب باہر سے کسی نے قاسم کو آواز دی "استاد"

لو یہ لوگ بھی آ گئے' قاسم نے کہا پھر دروازے کی طرف منہ کرکے پکارا "جاؤ یارو"

ٹاٹ کا پردہ اٹھا اور سب سے پہلے مشتاق اندر آیا۔ وہ کسی چیز کو کھینچ رہا تھا۔ دوسری طرف سے رشو اس چیز کو دھکیل رہا تھا۔ قاسم اور وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

تی دیر میں وہ لوگ اندر آ گئے تھے۔

قاسم، الٰہی بخش اور زرداد کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ لوگ ایک ٹھیلا لائے تھے اور وہ بہت خوبصورت ٹھیلا تھا۔ ٹھیلے کو دیکھ کر قاسم کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ وہ آگے بڑھا اور ٹھیلے کو چھو کر دیکھنے لگا، جیسے وہ کوئی غیر حقیقی چیز ہو۔

کیا دیکھ رہے ہو استاد۔ یہ تمہارا ہی ہے،' نثار نے کہا۔

نئی زندگی مبارک ہو استاد'' رحیمو بولا۔

قاسم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ ٹھیلے پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ پھر رندھی ہوئی آواز میں بولا۔ میں تم لوگوں کی اس محبت کا شکریہ کیسے ادا کروں..........''

''اس کی ضرورت نہیں استاد'' نثار نے اس کی بات کاٹ دی۔ قاسم کے بعد وہ سب سے سینئر تھا۔ بس اللہ تمہیں اس ٹھیلے سے بہت رزق دے۔ یہ دعا قبول ہو گئی تو سمجھو ہمیں محبت کا صلہ مل گیا۔

دوسرے مزدوروں کی آنکھیں بھی چمکنے لگیں۔ میں اتنی محبت کا حقدار تو نہیں تھا یارو۔ قاسم منمنایا۔

''تم تو اس سے زیادہ محبت کے قابل ہو استاد۔ پھر ہم سب غریب لوگ ہیں۔ نثار بولا۔

''بس اب یہ ڈراما ختم کرو اور کھانا کھلواؤ۔ عباس نے ماحول کو بدلنے کی کوشش کی لیکن قاسم تو کسی اور ہی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ وہ ٹھیلے پر ہاتھ پھیر رہا تھا لیکن اس کی آنکھیں دیوار کے پار دور کہیں بہت دور دیکھتی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر اس نے سحر زدگی کیسی کیفیت میں ٹھیلے کو دھکیل کر آگے بڑھایا اور بے ساختہ آواز لگائی۔ لو

بھنڈی، بینگن، توری، لے لو سبزی والا'' اپنی آواز نے خود اسے بھی چونکا دیا۔ وہ خجالت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر بے حد معصوم مسکراہٹ تھی۔

''لاؤ استاد'' ایک سیر آلو بینگن'' عباس نے شوخی سے کہا ''لیکن پکے ہوئے چاہئیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ روٹی کے ساتھ۔''

قاسم کو احساس ہو گیا کہ ان لوگوں کو بہت بھوک لگ رہی ہوگی۔ آج آلو گوشت بنے گا بیٹے۔ اس نے شرمندگی سے کہا ''ارے تم لوگ بیٹھو۔''

وہ سب بیٹھ گئے قاسم پردہ ہٹا کر اندر چلا گیا تھوڑی دیر بعد وہ ہاتھ کی بنی ہوئی دو میزیں اٹھا لایا۔ وہ اس نے چارپائیوں کے درمیان رکھ دیں۔ تم لوگ ہاتھ دھو لو میں کھانا لا رہا ہوں۔

کھانے میں آلو گوشت تھا اور چنے کی بریانی تھی۔ وہ سب کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ الٰہی بخش کو پردے کی اوٹ سے جھانکتی ہوئی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ مجھے کو دیکھ رہی تھیں اور آوازوں سے ان کی خوشی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ الٰہی بخش کو اس مے ان مزدوروں پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ انہوں نے اس گھرانے کو کتنی بڑی خوشی دی تھی۔ برتن سمیٹنے کے لئے قاسم کا وہ بیٹا آیا جس کا اس نے الٰہی بخش سے تذکرہ کیا تھا۔ دیکھنے میں وہ دس سال کا بھی نہیں لگتا تھا۔ کھانے کے بعد گپ شپ ہوتی رہی۔ اس دوران ان لوگوں نے چائے پی۔ پھر قاسم نے ان سے پوچھا ''اب کیا ارادہ ہے؟''

''یہ تو ہمیں تم سے پوچھنا ہے استاد'' نثار نے کہا۔ یہ تو معلوم ہو گیا کہ تم سبزی فروش کا کام کرو گے۔''

''ہاں تو اب پوچھنا کیا ہے؟''

صبح منڈی جاؤ گے؟

"ہاں قاسم نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کس وقت جاؤ گے؟"

صبح چار بجے جانا ہوگا"

"تو پھر استاد ہم بھی یہاں سے نکلنے والے تو نہیں" نثار نے کہا اس پر قاسم نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر دوسروں کو جن کے سر تائید میں ہل رہے تھے۔ "ہم تمہارے ساتھ منڈی چلیں گے" نثار نے مزید کہا۔ "ہمارا رکنا مسئلہ ہو تو اور بات ہے ہم چلے جائیں گے اور صبح چار بجے آ جائیں گے۔

"کوئی بات نہیں۔ بس تم لوگوں کو تکلیف ہوگی۔" قاسم نے شرمندگی سے کہا۔ "اور پھر اس کی ضرورت کیا ہے؟"

"ضرورت تو ہے۔" مشتاق بولا۔

"اور ہم لوگوں کی تکلیف کی فکر مت کرو۔" رحیمو نے کہا "ہم تو رت جگا کریں گے۔ چار بجے تک تاش کی پارٹی جمے گی یہاں۔"

پر تم لوگوں کو صبح کام پر۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"تم اس بات کو چھوڑو استاد۔ تاش لے آؤ" رحیمو نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ قاسم اندر گیا اور تاش کی دو گڈیاں لے آیا۔ وہ پارٹیوں میں تقسیم ہونے اور ترپ چال کھیلنے لگے۔ الہی بخش قاسم، نثار اور رحیمو کے ساتھ تھا۔ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔ اندر بچے تو شاید سو گئے تھے لیکن قاسم کی بیوی نہیں سوئی تھی۔ اس کی بدولت ان لوگوں کو چائے ملتی رہی۔

پھر چانک عاقل کو خیال آیا۔اب بس کریں استاد۔میرا خیال ہے وقت ہو گیا ہے۔"

قاسم اور نثار نے آسمان کی طرف دیکھا،ہاں ابھی رات کا اندھیرا تھا"ہاں وقت ہو گیا ہے"نثار نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ ہاتھ منہ دھولو۔پھر چلتے ہیں"قاسم نے کہا۔

پندرہ منٹ بعد وہ سب باہر نکل آئے۔باہر لگتا تھا پوری کائنات سو رہی ہے۔وہ سنسان سڑک پر بے فکری سے دندناتے ہوئے چلتے رہے۔الٰہی بخش نثار کے ساتھ قدم ملا کر چلنے لگا۔قاسم سب سے آگے تھا۔اس کے ساتھ زردو چل رہا تھا۔

"نثار بھائی"اچانک الٰہی بخش نے سرگوشی میں کہا اب تم لوگ قاسم چاچا کو سبزی فروش والا کہو گے؟"

نثار نے سر گھما کر اسے دیکھا"ہاں بخشے"اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

الٰہی بخش نے جیب سے تین روپے نکال کر ہاتھ میں رکھ لیے تھے۔وہ اس نے نثار کی طرف بڑھائے۔میں بھی تمہارے ساتھ شامل ہونا چاہتا ہوں نثار بھائی"

نثار نے اس کے ہاتھ کو دیکھا لیکن پیسے لینے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا۔"اس کی ضرورت نہیں بخشے۔ہمارے پاس ضرورت سے زیادہ پیسے ہیں۔ہم سب بہت عرصے سے اس موقعے کے لیے رقم بچا رہے تھے۔"

"یہ بات نہیں نثار بھائی۔میں تمہارے ساتھ شریک ہونا چاہتا ہوں۔قاسم چاچا سے میرا بھی تعلق ہے۔"

"نہیں بخشے۔ضرورت ہوتی تو میں ضرور لے لیتا۔"

"تم میرا دل توڑ رہے ہو۔ صرف اس لئے کہ میں تم میں سے نہیں ہوں۔"
الٰہی بخش نے دل گرفتگی سے کہا۔

"یہ بات نہیں بخشے۔" نثار نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "پر تو بھی
مزدور ہے اور مزدور کا ہاتھ عام طور پر تنگ ہی رہتا ہے۔"

"یہ تو وہی پیسے ہیں جو مجھے صرف تمہارے ساتھ ہونے کی وجہ سے ملے
ہیں۔ ان پر تو میرا حق ہی نہیں تھا۔ تم لوگوں نے زبردستی مجھے دے دیئے۔ اب تم انہیں
قبول نہ کر کے مجھے احساس دلا رہے ہو کہ میں بدرنگ ہوں۔"

"تو پاگل ہو گیا ہے۔ دیکھ بھائی تو بھی مزدور ہے اور ہم بھی۔ یہی رشتہ ہوتا
ہے۔ ہمارے دکھ سکھ ایک سے ہیں۔ مگر میری جان یہ معاملہ برادری کا۔۔۔۔" نثار
کہتے کہتے رکا۔ "۔۔۔۔۔۔۔۔ برادری کا بھی نہیں ٹولی کا معاملہ ہے یہ۔"

"ٹھیک ہے یار بھائی۔" الٰہی بخش نے اداس لہجے میں کہا۔ "آئندہ میں اپنی
حد میں رہوں گا۔"

نثار چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر اس نے ہاتھ بڑھا دیا۔ "لا پیسے مجھے دے
دے اب مسمت لٹکا۔" اس سے الٰہی بخش نے نوٹ لے کر گنے۔ وہ تیس روپے تھے۔ نثار
جانتا تھا کہ گزشتہ روز کی مزدوری میں حصہ بائیس روپے بنتا تھا۔ یعنی اس میں آٹھ
روپے الٰہی بخش نے اپنی جیب سے ملائے تھے۔ جبکہ پچھلے روز اس نے کام بھی نہیں
کیا۔ پورے دن بلکہ اب تک انہیں لوگوں کے ساتھ لگا رہا تھا۔

نثار کا دل دکھنے لگا لیکن اب وہ الٰہی بخش سے حجت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس
نے خاموشی سے پیسے جیب میں رکھ لئے۔

وہ سب سبزی منڈی کی طرف چلتے رہے۔

منڈی دیکھ کر الٰہی بخش حیران رہ گیا۔ وہاں ایسی گہما گہمی' ایسا ہجوم تھا جیسے دن نکل چکا ہو۔ قاسم اپنے تھوڑے کر کے بچائے ہوئے پیسے لایا تھا اور اسی حساب سے مال خریدنا چاہتا تھا۔ نثار نے جو اسے پھلوں کی پیٹیاں سبزی کے علاوہ دلائیں تو وہ حیرت رہ گیا اس کی آنکھیں پھر بھیگ گئیں۔ "اس سب کی ضرورت نہیں تھی یارو۔ وہ ٹھیلا ہی بہت تھا" وہ بڑبڑایا۔

"بے کار باتیں مت کرو استاد۔" رحیمو بولا۔

واپسی کے سفر میں وہ سب لدے پھندے تھے اور بہت خوش تھے۔ جیسے وہ سب ہی کوئی نیا کام شروع کر رہے ہوں۔ گھر پہنچ کر انہوں نے ٹھیلا لادنے میں قاسم کی مدد کی۔ سب بہت خوش تھے۔ ہر شخص بساط بھر مشورے دے رہا تھا۔ سبزیاں اور پھل لگ گئے تو ٹھیلا اور خوبصورت لگنے لگا۔

اس دوران سورج نکل آیا تھا۔ قاسم نے انہیں ناشتہ کرایا۔ سب نے ڈٹ کر چائے میں پاپے بھگو کر کھائے۔ پھر چلنے کا وقت آ گیا۔ قاسم کو ٹھیلا لے کر نکلنا تھا۔ اس کی نئی زندگی کا آغاز ہو رہا تھا۔

"استاد ہمیں اجازت دو۔" نثار نے کہا۔ "ہم اب چلتے ہیں تم بھی بسم اللہ کرو۔ اللہ تمہیں کامیاب کرے۔"

قاسم ممنونیت بھری بھیگی آنکھوں سے ایک ایک کو تکتا رہا۔ اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ اسے احساس تھا کہ شکریہ بہت چھوٹا لفظ ہے۔ عباس نے بھرے ہوئے ٹھیلے کو ہلکے سے دھکیلا۔ "واہ استاد۔ یہ تو پھول ہو رہا ہے تمہارے تو مزے آ گئے۔" اس

نے شوخ لہجے میں کہا۔

اس پر سب کھلکھلا کر ہنس دیئے۔

☆------☆------☆

وہ دن اور وہ رات الٰہی بخش کبھی نہیں بھولا' جو اس نے مزدوروں کے ساتھ گزارا تھا۔ اس نے ان سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور سمجھا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس نے ایک دوسرے کے لیے ان کی محبت دیکھی تھی۔

بس اس بات پر وہ جھنجلانے لگتا۔ کیا مصیبت ہے۔ جس چیز سے بھاگ کر وہ کراچی آیا' وہ یہاں بھی موجود ہے۔ اسے یاد آیا' ایک بار اس کے باپ نے کہا تھا' محبت تو سبھی کرتے ہیں بیٹے اور جو لوگ خود سے نہیں کرتے' انہیں محبت کرنی پڑ جاتی ہے' اچھا یہی ہے کہ آدمی محبت کی عادت ڈال لے۔ اس سے اللہ بھی خوش رہتا ہے ورنہ آپ بھی۔ جو آدمی محبت کرنا نہیں چاہتا' وہ بہت نقصان میں رہتا ہے۔ جب وہ محبت پر مجبور ہوتا ہے تو بہت بے بس ہوتا ہے۔ بہت تکلیفیں اٹھاتا ہے وہ۔ مزدوروں نے اس پر ثابت کر دیا تھا کہ وہ سب ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ شاید وہ محبت ان کی ضرورت تھی۔ ان کا روزگار' ان کے مفادات' ان کے دکھ سکھ جو مشترک تھے۔ پھر بھی وہ تھی تو محبت ہی۔ ورنہ انہیں تا‌م کے لیے اتنا کچھ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وقت نکل گیا تھا۔ تا‌م اب ان کے لیے بے کار تھا۔ انہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ پھر انہوں نے یہ سب کچھ کیوں کیا۔ محبت' ہاں محبت ہی تھی۔ الٰہی بخش کو اعتراف کرنا پڑا۔

اب سے پہلا تجربہ بھی کیسا تھا۔

تمام کے سبزی فروٹ کے لئے پیسے تو اس نے بھی ملائے تھے۔ تو کیا یہ محبت تھی؟ ہرگز نہیں۔ انسیت؟ یہ بھی نہیں۔ تو پھر کیوں؟ بہت غور کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ اس کی خودداری' اس کی انا کا معاملہ تھا۔ اسے مزدوری کے بغیر اجرت دی گئی تھی۔ جو اصرار کی وجہ سے اسے لینی پڑی تھی۔ وہ اس کے سوا اور کیا کر سکتا تھا کہ کسی بھی بہانے سے اس میں مزید اپنی رقم ملا کر انہیں لوٹا دے اور بہانہ موجود تھا۔

الٰہی بخش کو مایوسی ہوئی' کیا وہ محبت کی اہلیت ہی نہیں رکھتا؟ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ کبھی اس نے کسی سے محبت کی ہو لیکن نہیں۔ اسے تو شاید ماں باپ سے بھی محبت نہیں۔ کراچی آنے کے بعد اس نے ابا کو صرف ایک خط لکھا تھا اور گھر کے لوگ اسے کبھی یاد بھی نہیں آئے تھے۔ وہ یہاں خوش تھا۔

اس دن کے بعد سے محبت الٰہی بخش کے سر پر سوار ہو گئی۔ صبح سویرے ٹھکانے پر آ کر بیٹھتا تو گردوپیش کی ویرانی اور تنہائی میں وہ محبت اور عشق کے بارے میں سوچتا رہتا۔ اسے باپ کی باتیں یاد آتیں۔ گردوپیش میں زندگی بیدار ہوتی تو وہ چونکتا اور اس پر جھنجھلاتا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی محبت کے بارے میں کیوں سوچتا رہتا ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ وہ محبت ہی کر لے۔

درحقیقت وہ خوف زدہ تھا۔ باپ کی بات کے حوالے سے اسے خوف آتا تھا۔ کیا محبت نہ کرنے کی سزا میں اسے ایسی محبت ہو گی کہ جو اسے مجبور اور بے بس کر کے رکھ دے گی وہ یہ سوچتا اور لرز جاتا۔ وہ عشق اور محبت سے گھبرا کر ہی تو گھر چھوڑ کر بھاگا تھا۔ لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ اسے پردیس میں محبت ہو گی' جس کے سامنے وہ بے بس ہو جائے گا اور یہ محبت کے خلاف مزاحمت کا ردعمل ہوگا۔

وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ اب وہ وقت آ پہنچا ہے۔

☆-----------☆--------☆

الہی بخش کو پہلی نظر میں عشق ہوا تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ اس کا خمیر ہی عشق کی مٹی سے اٹھا تھا لیکن یہ عشق کہاں' کس جگہ' کس انداز میں ہوا' اس پر مزید حیرت کی جا سکتی ہے۔

الہی بخش کو یک بڑا کام ملا تھا جو اس نے چار دن میں نمٹا دیا تھا' اجرت کے علاوہ انعام بھی ملا تھا۔ لہٰذا جیب بھاری تھی۔ وہ بے فکروں کی طرح مست بیٹھا تھا۔ صبح سے کام نہیں ملا تھا تو اس کی اسے پروا بھی نہیں تھی۔ اس روز وہ کام کرنا چاہتا بھی نہیں تھا۔ البتہ کام مل جاتا تو وہ انکار بھی نہیں کرتا۔ یہ مزدوری کے اصول کی بات ہے۔ ورنہ دل تو اس کا یہی چاہتا تھا کہ اس روز گھر بیٹھ کر آرام کرے' چار دن کی تھکن اتارے لیکن اپنے کام میں نوکری سے زیادہ پابندی کرنا پڑتی ہے۔ الہی بخش کہتا تھا کہ یہ آزادی کی قیمت ہے۔ اس نے وہ معمول کے مطابق اپنا محنت کا شوکیس لگائے بیٹھا تھا۔

شام ہو گئی تھی۔ طارق روڈ کی رونق اپنے شباب پر تھی۔ الہی بخش کو یہ وقت بہت اچھا لگتا تھا۔ عام طور پر وہ اسی رونق کی خاطر دیر تک رکا رہتا تھا۔ کسی دن تھکن بہت زیادہ مجبور کرتی تو شام کو جلدی گھر چلا جاتا۔ ورنہ رات کا کھانا کھا کر ہی جاتا۔

وہ اپنے معمول کے مطابق نظریں جھکائے بیٹھا تھا۔ نظریں وہ کم ہی اٹھاتا تھا۔ اچانک ہی جگہ جہاں اس کی نظریں جمی تھیں' ایک شاپنگ بیگ گرا اور اس طرح گر کر اس کی تمام چیزیں بکھر گئیں۔ کچھ کپڑے تھے' کچھ بال پن اور کچھ ایسی چیزیں جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ ساتھ ہی ایک سریلی آواز سنائی دی' اوہ مائی گاڈ۔

الٰہی بخش نے سر اٹھا کر دیکھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا۔ وہ بے حد حسین لڑکی تھی۔ عمر اٹھارہ انیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کا چہرہ کندن کی طرح دمکتا ہوا تھا۔ آنکھیں کٹوروں سی تھیں۔ نقوش ایسے تھے جیسے بڑی نزاکت و نفاست سے تراشے گئے ہوں۔ بالائی ہونٹ کے اوپر پسینے کے قطرے یوں چمک رہے تھے جیسے صبح کے وقت گلاب پر شبنم۔ وہ جسم جیسے سانچے میں تیار کیا گیا تھا۔ لڑکی کے ہونٹ یوں کھلے ہوئے تھے جیسے وہ بھی تک پکار رہی ہو۔۔۔۔۔۔۔۔اور مانی گاڈ!

الٰہی بخش اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ اسے اس لڑکی کے سوا کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہ رنگ کے ڈبے اور برش لگائے یک فٹ پاتھ پر بیٹھا ہے۔ وہ زمان و مکان سے ماورا ہو گیا تھا۔

"اب دیکھ کیا رہی ہو اٹھاؤ نا۔"

اس آواز نے الٰہی بخش کو چونکا دیا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ لڑکی کے ساتھ کوئی اور بھی ہے' وہ ایک معمر خاتون تھیں۔ اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں برہمی تھی۔ الٰہی بخش کو احساس ہو گیا کہ وہ جس طرح لڑکی کو دیکھ رہا تھا' وہ لڑکی کی ماں نے دیکھ لیا ہے اور ظاہر ہے' اسے یہ بات اچھی نہیں لگی ہے۔

الٰہی بخش نے نظریں جھکا لیں۔ اب اس کے سامنے لڑکی کی بکھری ہوئی چیزیں تھیں۔ وہ شرمسار تھا کہ اس نے ایسی معیوب حرکت کی۔

"بھی سمیٹ رہی ہوں ممی" اس نے لڑکی کی سریلی آواز سنی۔

اگلے ہی لمحے لڑکی جھکتے ہوئے خود اس کی نظروں کے فوکس میں آ گئی اور یوں آئی کہ اس کے دل کی دنیا زیر و زبر ہو گئی۔ لڑکی کا آنچل ڈھلک گیا تھا۔ جیسے دہکتے

ہوئے لفظوں کی کوئی کتاب کھل گئی تھی۔ وہ نظارہ الٰہی بخش کے لیے بالکل نیا تھا۔ وہ
سے اچھا بھی نہیں لگا لیکن دل چاہا کہ دیکھتا ہی رہے۔ اسے اپنے کانوں کی لوئیں انگارہ
ہوتی اور چہرہ تمتماتا محسوس ہوا۔ تپش سے گھبرا کر اس نے نظریں اٹھائیں تو سامنے لڑکی
کی ماں کی شرربار نگاہیں تھیں۔ وہ گھبرا کر سامنے دیکھنے لگا۔ اس لمحے اسے اپنا آپ
بہت چھوٹا بہت حقیر محسوس ہو رہا تھا۔ جانے کب تک وہ یونہی سامنے دیکھتا رہا۔ اس کا
دل چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ نظریں ہٹیں تو اسے پتا چلا
کہ وہ دونوں جانے کب کی جا چکی ہیں۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا اور نظریں جھکا
دیں۔

لیکن اس کا اطمینان وقتی ثابت ہوا۔ اس کی جھکی ہوئی نظروں کے سامنے
لڑکی کا چہرہ ابھر آیا' اور وہ جیسے تصور نہیں 'جیتا جاگتا' سانس لیتا چہرہ تھا کہ وہ ہاتھ
بڑھائے اور چھو لے۔ اس نے سر جھٹکا تو لڑکی کی ماں کی شرربار نگاہیں سامنے آ گئیں۔
اس نے گھبرا کر سر گھمایا تو وہ نظارہ سامنے آ گیا جس کی تپش وہ اب تک محسوس کر رہا تھا۔
اس نے اسے جھٹکنے کے لیے پلکیں جھپکیں تو لڑکی کا چہرہ پھر سامنے تھا۔

اب تو ان تینوں جھلکیوں کی آنکھ مچولی شروع ہو گئی۔ پھر ان میں سے شرربار
نگاہوں والی جھلک جیسے کسی خودکار طریقے سے خارج ہو گئی اور کچھ دیر بعد صرف لڑکی کا
چہرہ رہ گیا جو نظروں کے سامنے سے ہٹنے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔

وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر اس نے ایک راہگیر سے وقت پوچھا۔ سن کر اسے یقین ہی
نہیں آیا کہ ساڑھے آٹھ بج چکے ہیں لیکن یہ سچ تھا کہ رات ہو چکی تھی۔ الٰہی بخش کو حیرت
اس پر بھی تھی کہ اسے اب تک بھوک نہیں لگی۔ عام طور پر وہ آٹھ بجے کھانے سے فارغ

ہو جاتا تھا اور یہ بات تو بالکل ہی ناقابل یقین تھی کہ اس نے اتنا وقت یونہی بیٹھے بیٹھے صرف وہ چہرہ دیکھتے گزار دیا ہے۔ ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے تصور میں تو کبھی ہیروئنوں کے چہرے بھی نہیں آئے تھے۔

بہر حال وہ اٹھ گیا۔ یہ بات ابھی اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ اسے محبت ہو گئی ہے۔

بھوک نہیں تھی۔ پھر بھی وہ ہوٹل میں چلا گیا۔ بھوک ہو نہ ہو کھانا کھانا ضروری ہے۔ آدھی رات کو گھر میں بھوک لگی تو بڑا مسئلہ بن جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ کھانا زہر مار کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن چند لقموں سے زیادہ اس سے کھایا نہیں گیا۔ یہ بھی غیر معمولی بات تھی۔ ورنہ بھوک اسے ہمیشہ بہت اچھی لگتی تھی اور وہ کھانا بھی طبیعت سے کھاتا تھا۔ پھر یہ بے رغبتی کیوں۔ جبکہ اس کی کوئی ظاہری وجہ بھی نہیں۔ پورا دن اس نے معمول کے مطابق گزارا تھا۔ دوپہر کا کھانا ہمیشہ کی طرح ساڑھے بارہ بجے کھایا تھا۔ ہر روز اسے شام سات بجے سے بھوک لگنے لگتی تھی اور آٹھ بجے وہ رات کا کھانا کھا لیتا تھا۔

اسی الجھن میں وہ گھر پہنچ گیا۔ اسے احساس تھا کہ اس کی زندگی میں کوئی بہت بڑا انقلاب آ چکا ہے۔ گھر میں رہنے والے ساتھیوں سے بھی اس نے اس روز کوئی گپ شپ نہیں کی۔ ان کے ساتھ تاش کے لیے بھی نہیں بیٹھا۔ بہانہ اس نے یہ کیا کہ تھکن کی وجہ سے نیند جلدی آ رہی ہے لیکن درحقیقت اس کی آنکھوں میں نیند کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ وہاں تو بس ایک ضدی چہرہ جم کر بیٹھ گیا تھا۔

وہ آنکھیں بند کیے لیٹا اس چہرے کو تکتا رہا۔

سے نیند بھی ہمیشہ بہت اچھی آتی تھی۔ گہری اور پرسکون نیند۔ بو جب بھی
سے جگانے کی کوشش کرتے تو جھنجھلا جاتے۔ "یہ لڑکا کیسا بےخبر سوتا ہے۔" وہ اماں
سے کہتے۔ کوئی آ کر اسے کاٹ بھی ڈالے تو اسے پتا نہیں چلے گا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو۔" اماں خفا ہو کر کہتیں۔ "سوچ سمجھ کر منہ سے لفظ
نکالا کرو۔"

"تو یہ اٹھتا کیوں نہیں؟"

"بچپن ہی سے مدہوش سوتا ہے یہ تو۔" اماں کہتیں۔ "اور یہ تو ایسے وقت پر
سونے اور اٹھنے والا ہے کہ کانٹوں پر لیٹ کر بھی سو ہی جائے۔"

اور اب وہ مدہوش سونے والا اپنے وقت پر کانٹوں پر بھی سو جانے والا الٰہی
بخش وقت گزر جانے کے بعد بھی جاگ رہا تھا۔ تاش کی محفل کب کی اٹھ چکی تھی۔
سب لوگ کب کے سو چکے تھے۔ رات کا مخصوص سکوت طاری تھا اور وہ کروٹیں بدلے
جا رہا تھا۔ آنکھیں بند کرتا تو وہ چہرہ سامنے آ جاتا۔ آنکھیں کھولتا تو بےچینی ہونے لگتی
۔ وہ جھنجھلاتا۔ اپنے بال نوچنے کو، سر پیٹنے کو جی چاہتا۔ بس آنکھیں بند کرنے سے سکون
ملتا تھا اور آنکھیں بند کرتے ہی وہی چہرہ۔ وقت بہت آہستہ آہستہ گزرتا رہا۔ رات کی
سانسیں اکھڑتی گئیں۔ وہ مضمحل ہوتی گئیں لیکن الٰہی بخش کو نیند نہیں آئی۔ وہ
آنکھیں کھولتا تو جلتا کڑھتا اور جھنجھلاتا۔ آنکھیں بند کرتا تو وہ چہرہ اسے پرسکون کر دیتا
مگر پھر بےبسی کا احساس ستانے لگتا۔ اپنی خوشی سے جاگنے کی اور بات ہے لیکن یوں وہ
کبھی نہیں جاگا تھا۔

"یہ کیسی بےبسی ہے؟" وہ بڑبڑایا۔

سی لیے فجر کی اذان شروع ہو گئی۔ یہ اس کے معمول کے مطابق اٹھنے کا وقت تھا لیکن وہ اٹھا نہیں۔ "یہ کیسی بے بسی ہے؟" اس نے دوہرایا۔

"اللہ بہت بڑا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔" موذن پکار رہا تھا۔

"یہ کیسی بے بسی ہے؟" الٰہی بخش بڑبڑا رہا تھا۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔"

"میں سو کیوں نہیں سکتا؟ یہ کیسی بے بسی ہے؟"

" آؤ نماز کی طرف ۔۔۔۔۔۔۔۔ آؤ بھلائی کی طرف ۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"یہ سب کیا ہے؟ میں اتنا بے بس کیوں ہو گیا ہوں؟"

"نماز نیند سے بہتر ہے۔"

"یہ کیسی بے بسی ہے؟"

موذن نے آخری بار اللہ کی کبریائی کا اور اس کے سوا کسی معبود کے نہ ہونے کا اعلان کیا۔ اس کے ساتھ ہی ایسا سکوت طاری ہو گیا' جیسے پوری کائنات ساکت ہو گئی ہو۔ چند لمحوں کے اس سکوت نے الٰہی بخش کو اس کے سوال کا جواب دے دیا۔ اس کے کانوں میں بوڑھی آواز گونجی۔ "جو لوگ خود محبت نہیں کرتے انہیں محبت کرنی پڑ جاتی ہے۔ جو آدمی محبت کرنا نہیں چاہتا' وہ نقصان میں رہتا ہے۔ جب وہ محبت پر مجبور ہوتا ہے تو بہت بے بس ہوتا ہے۔ بہت دکھ اٹھاتا ہے وہ۔"

تو یہ بے بسی اسی لیے ہے۔ الٰہی بخش نے خود سے کہا۔ اس لمحے سے

پوری طرح ادراک ہو گیا کہ اسے محبت ہو گئی ہے۔ محبت پہلی نظر میں اور ایک ایسی لڑکی سے جس کا وہ کسی طرح ہمسر نہیں ہے۔ وہ دولت مند گھرانے کی فیشن ایبل لڑکی تھی۔ جبکہ وہ ایک دیہاتی مزدور تھا۔ اس نے سمجھ لیا کہ اسے باپ کی بات نہ ماننے کی محبت کے سامنے سر تسلیم خم نہ کرنے کی سزا محبت ہی کی شکل میں دی گئی ہے۔ اب وہ بے بس اور مجبور رہے گا۔ نہ اپنی مرضی سے کھا سکے گا نہ اپنی مرضی سے سو سکے گا۔

چونکہ ہی اسے طمانیت کا احساس ہونے لگا۔ اس نے سوچا' یہ تو بس چند روز کی سزا ہے۔ اب وہ لڑکی کہاں مل سکے گی۔ وہ تو شاید زندگی میں کبھی نظر بھی نہ آئے۔ چند روز بعد وہ سب کچھ بھول جائے گا۔ بلکہ ممکن ہے آج ہی ---------

لیکن کوئی نامعلوم حس اسے بتا رہی تھی کہ یہ معاملہ اتنا آسان نہیں۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بیت الخلا سے آنے کے بعد نلکے کے سامنے ہاتھ دھونے بیٹھا تو اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ وضو کر رہا ہے۔ احساس ہوا تو پہلے اسے حیرت ہوئی اور پھر پچھتاوا سر میں ڈنک مارنے لگا۔ وہ تو ہمیشہ اسی وقت جاگتا رہا ہے۔ پھر کیوں اسے نماز کا خیال نہیں آیا۔

اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ اس کے قدم مسجد کی طرف اٹھ رہے تھے۔ محبت اسے نماز کی طرف لے جا رہی تھی۔

☆---------☆---------☆

دن سست روی سے گزرتے رہے۔ الٰہی بخش ہر روز امید کو آنے والی کل کے سپرد کر دیتا۔ اس کی دلیل معقول تھی۔ جسے اب کبھی ملنا نہیں تھا وہ کب تک اس کی محبت میں گرفتار رہ سکتا ہے۔ کب تک آنکھیں اس ایک جھلک کے عکس کو بچا سکیں گی۔

مگر معاملہ برعکس تھا۔ محبت کی دیوانگی ہر روز فزوں تر ہوتی جا رہی تھی۔ عکس آنکھوں میں گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ دو مہینے اسی طرح گزر گئے تو الٰہی بخش نے شکست تسلیم کر لی۔ اس نے مان لیا کہ بات اگرچہ آگے بڑھنے والی نہیں لیکن یہ روگ عمر بھر کا معلوم ہوتا ہے۔

اسے احساس تھا کہ وہ خود بدل گیا ہے۔ اس کے معمولات بدل گئے ہیں۔ سب کچھ بے ترتیب ہو گیا تھا۔ بھوک لگتی تو وہ کھانا کھا لیتا۔ نہ لگتی تو نہ کھاتا۔ نیند آتی تھی مگر پہلے کی طرح نہیں۔ اب وہ بے سدھ ہو کر نہیں سوتا تھا۔ وہ خوش مزاج بھی نہیں رہا تھا۔ بہت کم آمیز ہو گیا تھا وہ۔ کسی سے بات کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ گھر کے ساتھی بھی اس سے شاکی رہنے لگے تھے۔ مزدوروں کی ٹولی نے بھی اس میں تبدیلی محسوس کر لی تھی۔

اس لڑکی کی دید کو دو ماہ ہوئے تو الٰہی بخش نے شکست تسلیم کر لی۔ مزید ایک ماہ گزرا تو اس میں اور تبدیلی آئی۔ تسلیم کے بعد سپردگی کا مرحلہ آیا۔ اس نے خود کو اس محبت کے سپرد کر دیا جو خود سے ناقابل یقین حماقت لگتی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی تنک مزاجی رخصت ہو گئی۔ وہ آدم بیزار نہیں رہا۔ مزاج میں بلا کی نرمی اور دھیمی آ گئی۔ اس کا لہجہ نرم اور آواز شیریں ہو گئیں۔ اس کی متحمل مزاجی بھی بڑھ گئی تھی۔ کم گو وہ اب بھی تھا۔ مگر کوئی مخاطب ہوتا تو وہ بڑی توجہ سے بات سنتا اور بے حد رسان سے جواب دیتا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بھی بڑھ گئی تھی۔ اس سے آنکھ ملا کر بات کرنا اب آسان نہیں رہا تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ عموماً نظریں اٹھا کر بات ہی نہیں کرتا تھا۔

سب سے زیادہ مزدوروں کی ٹولی اس کی تبدیلیوں پر حیران تھی۔ وہی اسے سب سے قریب سے دیکھ بھی رہے تھے۔

نظریں جھکا کر بازاری رونق سے لطف اندوز ہونے والا الٰہی بخش اب نظریں اٹھا کر اس رونق کو دیکھتا بلکہ تو تا تھا۔ وہ دور نزدیک ہر چہرے کو غور سے دیکھتا' جیسے سے کسی خاص چہرے کی' کسی خاص شخص کی تلاش ہو' اگر اس کی نگاہوں میں معصومیت نہ ہوتی تو وہ یہی سمجھتے کہ عارف نے اسے خراب کر دیا ہے' پہلے تو وہ عورتوں کو نظر اٹھا کر دیکھتا ہی نہیں تھا۔ حالانکہ دل کی گدگدی کرتے ہوئے گزرنے والی خوشبو ور چھو کر گزرنے والی لباس کی سرسراہٹوں کے سامنے مدافعت کرنا آسان نہیں ہوتا۔ ب وہ عورتوں' لڑکیوں کو خاص طور پر دیکھتا۔ مگر اس کی نظروں میں معصومیت ور یک بے نام سے تجسس کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ کام میں اس کی دلچسپی کم ہوگئی ہے۔ کام آتا تو بہ زیادہ مزدوری طلب کرتا۔ اس سے اندازہ لگتا کہ وہ کام سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پہلے وہ اٹھ کر ادھر ادھر گھومتا اور باتیں کرتا تھا۔ مگر ب وہ بس پنی جگہ بیٹھا خریداری کے لیے آنے والوں کو تکتا رہتا۔

مزدور بہت متجسس تھے۔ نثار نے تو کہہ دیا تھا کہ یہ ساری علامات عشق کی ہیں۔ ضرور پنے محلے میں اسے کسی سے عشق ہو گیا ہے۔ دوسرے کئی لوگوں کو بھی یہ بات لگتی تھی۔ مگر یک بار الٰہی بخش کے ساتھ رہنے والا کرامت اس سے ملنے آیا تو مسئلہ اور پیچیدہ ہو گیا۔

نثار نے کرامت سے بھی یہی بات کہی۔

"نہیں جی' یہ تو ہو ہی نہیں سکتا" کرامت نے شدت سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "وہاں تو یہ صرف سونے کے لیے جاتا ہے۔ رات نو بجے کے قریب گھر پہنچتا ہے ور فوراً ہی سونے کے لیے لیٹ جاتا ہے۔ صبح سات بجے یہاں آنے کے

ے گھر سے نکل پڑتا ہے۔ اس نے تو کبھی کسی پڑوسی کی صورت ہی نہیں دیکھی۔ کسی پڑوسن سے عشق کیا کرے گا۔"

نثار کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ تو اسی ایک امکان پر تکیہ کیے بیٹھا تھا۔ وہ اس طرح رد ہو تو اس کی عقل ہی جواب دے گئی۔ چند لمحے بعد اس نے سنبھل کر کہا۔ تو پھر؟

"تم لوگوں کا خیال ہے کہ یہیں پر کوئی چکر چلا ہے" کرامت نے تنکھ دباتے ہوئے کہا۔

"یہاں؟" نثار نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ یہ تو پیارے بھائی جادو نگری ہے یہاں کوئی عشق نہیں کرسکتا۔ یہ تو کھلا میدان ہے جہاں پھول نہیں کھل سکتے۔ پھول آتے ہیں۔ جادو سے یہ باغ بن جاتا ہے۔ پھول چلے جاتے ہیں تو پھر میدان ور ریت یہاں عشق کیسے ہوسکتا ہے۔

"تم لوگ کام پر کس وقت آتے ہو؟" کرامت نے پوچھا۔

"ساڑھے نو بجے زیادہ جلدی آ گئے تو نو بجے۔"

لیکن یہ بخش سات بجے گھر سے نکلتا ہے۔ ساڑھے سات بجے یہاں آ جاتا ہوگا۔"

"اس وقت تو یہاں الو بول رہے ہوتے ہیں۔ مشتاق بولا۔

"تو یہ بخش یہاں اتنی دیر کیا کرتا ہے؟ کرامت نے سوال اٹھایا۔ میرا تو خیال ہے یہی وقت میں یہاں کوئی چکر چلا یا ہے اس نے۔"

"مگر یہاں تو کوئی ہوتا ہی نہیں" اچھو نے کہا۔

"ارے یہاں فلیٹ بھی تو ہیں" کرامت نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔
نیلن پورے دن تو اسے کسی فلیٹ کی طرف متوجہ ہوتے نہیں دیکھا۔"
عباس بولا" ایسی کوئی بات ہوتی تو نظر میں ضرور آتی۔"
یہ بخشو ہے بہت گہرا آدمی' راز چھپانا اسے آتا ہے۔" نثار نے گہری سانس
لے کر کہا۔ خیر میں خود دیکھوں گا کسی دن۔"
محفل برخواست ہوگئی۔ کرامت پھر کسی دن آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

☆----------☆----------☆

ابھی بخش کو اندازہ نہیں تھا کہ لوگ اس کے بارے میں کتنے متجسس ہو رہے ہیں۔ اسے پتا کیا چلتا وہ تو سرشاری کی عجیب سی کیفیت میں تھا اسے دوسروں کو دیکھنے اور سمجھنے کا ہوش ہی کہاں تھا۔ یہ کیا کم تھا کہ اس نے ایک بہت اہم بات سمجھ لی تھی۔ وہ یہ کہ پہلی نظر میں عشق ہو گیا ہے۔

اب تو اس کے دل میں لڑکی بات کا خوف بھی نہیں تھا۔ یہ خیال ہی دل سے نکل گیا تھا کہ یہ محبت سزا ہے۔ وہ سوچتا' اگر یہ سزا ہے تو اتنی سخت سزا ابھی نہیں۔ اس میں تو عجیب مستی' بے خودی ہے' اپنا آپ اچھا لگنے لگا ہے' ہاں کبھی کبھی ایک بات اسے ایک خلش ستاتی۔ کاش وہ اس لڑکی کو پھر دیکھ سکے۔ اس کے متعلق جان سکے' وہ کون ہے' کیسی ہے' کیا نام ہے اس کا؟ اس کی پسند' ناپسند۔ مگر وہ فوراً ہی اس خلش کو جھٹک دیتا۔ اس نے خود سے بہت طویل بحث کی تھی اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس لڑکی کو دوبارہ دیکھنا' اس کے بارے میں جاننا اس کے لیے بہتر نہیں۔ سادہ سی حقیقت یہ تھی کہ محبت اپنی جگہ لیکن وہ لڑکی اس کے لیے نہیں ہے۔ وہ حیثیت اور مرتبے میں اس

سے بہت اوپر ہے۔ وہ مختلف ماحول کی لڑکی ہے۔ اس سے بہتر تو شاید اس کے ملازم
ہوں گے۔"

سو الٰہی بخش مطمئن تھا کہ اسے اس لڑکی کو دوبارہ دیکھنے کی خواہش نہیں۔
اسے احساس بھی نہیں تھا
کہ غیر شعوری طور پر وہ اس کی جستجو کر رہا ہے۔ خود کو سمجھنا دنیا کے مشکل ترین کاموں میں
سے ایک ہے۔ بعض اوقات تو آدمی کو برسوں پتا نہیں چلتا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اس نے
تھوڑا سا غور کر لیا ہوتا تو بات اس کی سمجھ میں بھی آ جاتی۔ مگر اسے تو خیال ہی نہیں آیا کہ
وہ اب نظریں جھکا کر نہیں بیٹھتا۔ بلکہ نظروں سے چہروں کے ہجوم کو کھنگالتا رہتا ہے۔

اپنی کسی تبدیلی کا احساس انسان کو خود نہ ہو تو دوسرے احساس دلا دیتے ہیں
۔ اس کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا۔

الٰہی بخش کو یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہ ایک گھر میں ساتھ رہنے والوں کے
لئے اور مزدوروں کی ٹولی کے لئے کیسا پیچیدہ معما بن گیا ہے۔

کوئی دو ہفتے بعد کرامت پھر آیا۔ اس روز الٰہی بخش کو کام مل گیا تھا۔ وہ
موجود نہیں تھا۔ "کیا رہا استاد۔ میری بات درست نکلی نا؟" کرامت نے نثار سے
پوچھا۔

"نہیں ایسا نہیں ہے" نثار نے کہا۔ "میں نے تین دن ساڑھے سات بجے
صبح یہاں آ کر دیکھا ہے وہ کچھ نہیں کرتا۔ سر جھکائے بیٹھا رہتا ہے۔ میں نے اسے
ایک منٹ کے لئے بھی یہاں سے اٹھتے نہیں دیکھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ وقت
وہ کیسے گزر لیتا ہے۔ مجھے تو لگ رہا تھا کہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔

تو پھر؟ کرامت نے مایوسی سے کہا۔ اور کیا بات ہو سکتی ہے؟"

بات تو یہی ہے لیکن یہ چکر کہاں چلا ہے۔ وہ سمجھ میں نہیں آتا۔"

میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ گھر کی طرف تو یہ ناممکن ہے۔ ایسا سوچنا بھی نہیں

ورنہ یہاں بھی یہ ممکن نہیں۔ نثار نے کہا۔ ٹھیک ہے اب میں خود اس سے

بات کروں گا۔

لیکن اس سے اگلوانا آسان نہیں ہوگا استاد۔ کرامت بولا۔ ہم سب ہر

طرح سے کوشش کر رہے ہیں۔

میں کچھ اگلواؤں گا نہیں۔ نثار نے کہا۔ میں صرف اسے احساس دلاؤں گا

کہ بہت سے لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ اس کا کوئی چکر ہے۔ بس پھر اس کی نظریں

ہی کسی دن پورا بھید کھول دیں گی۔ وہ زبان سے تو نہیں خود ہی یہ بات بتا دے گا۔

"واہ استاد۔ ترکیب تو زوردار ہے۔" کرامت نے ستائشی نظروں سے

دیکھا۔ تین دن بعد نثار الٰہی بخش کے پاس آ بیٹھا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا

۔ قدموں کی چاپ سن کر الٰہی بخش نے سر اٹھایا اور سامنے سے گزرنے والی لڑکیوں کے

چہروں کو غور سے دیکھنے لگا۔ نثار نے کچھ دیر اسے اس کا موقع دیا۔ پھر چونک بولا۔ تو

نے جواب نہیں دیا میری بات کا؟

الٰہی بخش نے چونک کر اسے دیکھا "کون سی بات نثار بھائی"

"تو تو میری بات سن ہی نہیں رہا تھا" نثار نے خفگی سے کہا۔

"معاف کرنا نثار بھائی۔ آج کل میرے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ دھیان ہٹ جاتا

ہے۔ ادھر ادھر۔"

"ایسا کیوں ہوتا ہے بخشے پہلے تو نہیں ہوتا تھا"

معلوم نہیں ہے یا بتانا نہیں چاہتا۔ نثار نے کہا۔

یسی کیا بات ہو سکتی ہے کہ میں چھپاؤں۔

ہوتی ہے۔ ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں۔ نثار نے مربیانہ انداز میں کہا۔ جس عمر میں تو ہے اس میں ایسی باتیں ہوتی ہیں۔

س بار الٰہی بخش اپنے چہرے کی تمتماہٹ پر قابو نہ پا سکا۔ وہ تمتماہٹ نثار نے بھی دیکھ لی۔ میرے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں نثار بھائی۔"

چھا یک بات بتاؤ یہ تم گزرنے والوں کو اتنے غور سے کیوں دیکھتے ہو؟ نثار نے چونک حملہ کیا۔

ہی بخش ہل کر رہ گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ لوگ اسے اتنے غور سے دیکھتے ہیں۔ یہاں بیٹھ کر کوئی اور کیا دیکھ سکتا ہے۔ نثار بھائی۔ اس نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔

یلن پہلے تم لوگوں کو ایسے نہیں دیکھتے تھے۔

مجھے تو خیال نہیں--------

ور خاص طور پر عورتوں اور لڑکیوں کو۔ نثار نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

اس بار تو الٰہی بخش کے وجود میں بھونچال آ گیا۔ نن--------نہیں تو نثار بھائی۔

کسی کو تلاش کرتا ہے تو؟ اس بار نثار نے مشفقانہ لہجے میں پوچھا۔

اہی بخش کا جی چاہا اعتراف کر لے۔ یوں بوجھ بھی ہلکا ہو جاتا۔ جواب تک

وہ تھپ اٹھا نے ہوئے تھا لیکن اس صورت میں اسے پوری بات بتانی پڑتی ور وہ سب کچھ ب خود س مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ وہ نثار کو بتاتا۔ نثار دوسروں کو بتاتا، پھر اس کا مذاق اڑتا۔ چنانچہ اس نے زبردستی کی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ یہ تمہارا وہم ہے استاد، ایسی کوئی بات نہیں۔"

نثار خاموش ہوگیا۔ زیادہ دباؤ ڈالنا مناسب نہیں تھا۔ اس نے الہی بخش کے چہرے کے بدلے ہوئے تاثرات دیکھ لئے تھے۔ پہلی بار کے لئے اتنا ہی کافی تھی۔

☆————————☆————————☆

الہی بخش اب پھر مضطرب اور بے چین تھا۔

اس کی خوش فہمی دور کر دی گئی تھی۔ وہ تو اپنے تئیں ایک بے ضرر محبت میں مست تھا۔ اس اطمینان تھا کہ اسے اس چہرے کی جستجو نہیں۔ اس نے وہ مل بھی گئی تو کیا ہوگا۔ یوں محبت کرنے میں تو کوئی نقصان نہیں تھا۔ نہ ہی احساس کمتری کا کوئی سوال تھا لیکن اب صورت حال مختلف تھی یہ اس کے لئے ایک انکشاف تھا کہ وہ پچھے اڈے پر بیٹھے بیٹھے سے تلاش کرتا رہا لیکن یہ حقیقت اس کے شعور سے اتنا نزدیک تھی کہ سے با آسانی تسلیم کرنا پڑی۔ وہ خود سے بحث بھی نہ کر سکا۔ اسے تو یہ خیال آیا کہ وہ اس بات سے واقف تھا لیکن اسے خود سے بھی چھپاتا رہا تھا۔

اب اس حقیقت کے حوالے سے اسے کچھ سوالات کا سامنا کرنا تھا۔ سوال یہ تھا کہ وہ اس لڑکی کی تلاش کرنا چاہتا تھا۔ خود کو بہت ٹٹولنے کے بعد بھی سے اس سوال کا تشفی بخش جواب نہ مل سکا۔ کیا وہ اس لڑکی سے محبت کا اظہار کرنا چاہتا ہے؟ اس سوال کا واضح جواب نفی میں تھا۔ تو پھر؟ کیا یونہی وہ جاننا چاہتا تھا کہ جس کی محبت میں

وہ بیدوجہ گرفتار کر دیا گیا ہے وہ ہے کون اس کے سوا کوئی بات نہیں۔ اس جواب سے اسے بخش کو مطمئن ہو جانا چاہیے تھا لیکن اس نے لاشعور کی کرشمہ کاری بھی ابھی دیکھی تھی ور اس کے بعد خود پر بھی اختیار نہیں کر سکتا تھا۔

وہ کئی دن اس سوچ میں الجھا رہا لیکن اطمینان بخش جواب نہ مل سکا۔ اس کی بے قراری اپنی جگہ رہی۔ پھر دھندلی دھندلی سی ایک بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ یہ کہ جو محبت وہ کر رہا ہے وہ کوئی سرِ اتو نہ ہوئی۔ جبکہ محبت کے کچھ دکھ بھی ہوتے ہوں گے۔ وہ محسوس کر سکتا تھا کہ اس کے لئے دکھوں کا سامان ہو رہا ہے اور وہ اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس ناگہانی سے نہیں بچ سکا تھا تو آگے بھی نہیں بچ سکے گا اس بات کی جزئیات اس کی سمجھ میں نہیں آئیں۔ اسی لئے وہ اسے دھندلی سی بات سمجھ رہا تھا ورنہ وہ دھندلی سی بات بھی اس کا دماغ نہیں سمجھ سکا تھا۔ البتہ دل نے وہ بات سمجھ لی تھی۔

ردعمل کے طور پر وہ جھنجلا گیا۔ اسے احساس ہونے لگا کہ وہ تقدیر کے ہاتھوں کھلونا بن گیا ہے۔ اب دکھ ملتے ہیں تو دکھ ہی سہی۔ اس نے خود کلامی کی۔ ”میں کیوں خواہ مخواہ پریشان ہوں۔ ٹھیک ہے میں بھی جیتے جیتے چہروں کے ہجوم میں سے ڈھونڈوں گا مگر کیا جاتا ہے۔ کیا پریشانی ہے ایسے کوئی ملتا ہے بھلا۔ ہونہہ دیکھا جائے گا یہاں تو کوئی بچہ کھو جائے کسی کا تو ڈھونڈتے پھرو۔ کس کس کی مدد لو تب کہیں ملتا ہے۔ چلو بھئی دیکھتے رہو بیٹھ کے“

خود سے اس مکالمے کے بعد وہ بے فکر ہو گیا۔ اس بار چہروں کے ہجوم کو ٹٹولنے کا شغل غیر شعوری نہیں تھا لیکن اسے یقین تھا کہ وہ اسے نظر نہیں آئے گی۔ اس

نے یہ نہیں سوچا کہ تعلقات بے در بے بھی ہو تے ہیں۔

ب وہ اس چہرے کو تلاش کرتا تھا۔ وہ لڑکیوں کو بہت غور سے دیکھتا تھا۔

اس یقین کے ساتھ کہ وہ اس چہرے کو پہچان بھی نہیں سکے گا۔ عجیب بات تھی' سے ہر چہرے پر اس چہرے کا گمان ہوتا تھا۔ ہر حسین چہرہ اسے وہی چہرہ لگتا تھا۔ اسے حیرت ہوئی لیکن پھر اس کی سمجھ میں یہ بھی آ گئی۔ وہ وید بہت پرانی تھی۔ اس نے سے پی یدداشت کے صفحے پر اپنے تصور کی لوح پر اتار لیا تھا۔ پھر شاید یوں ہوا ہو گا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اصل خد و خال مٹتے گئے ہوں گے اور تصور تب وہی خد و خال فراہم کرتا رہا ہوگا۔ اس کے تصور میں چہرہ تو اب بھی محفوظ تھا۔ مگر شاید وہ حقیقی چہرہ نہیں تھا جسے اس نے دیکھا اور چاہا تھا۔ یہ تو کوئی تصوراتی چہرہ تھا۔ بلکہ شاید کوئی خاکہ تھا.........خال و خط سے محروم خاکہ' جس میں ہر اس چہرے کے نقوش بھر دیتا' جو اسے حسین لگتا۔ اسی لئے تو ہر حسین چہرہ اس کا چہرہ لگتا تھا۔

اہی بخش یہ سوچ کر خوش ہوتا کہ اس لڑکی کے ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ وہ سامنے بھی آ جائے تو اسے نہیں پہچان سکے گا۔ وہ تو جیسے دل میں محبت ڈالنے والے سے کوئی جنگ لڑ رہا تھا اور جیتنے والا تھا۔ محبت تک تو ٹھیک تھا لیکن جستجو تو دیوانگی ہے وردیوانگی بہت نقصان دہ ہوتی ہے۔

لیکن یک دن وہی چہرہ اسے سچ مچ نظر آ گیا۔

یہ پہلی نظر کے تقریباً آٹھ ماہ بعد کی بات ہے۔ اس نے نظر شناسی ور اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ دل کی تال میں سے تین چار دھڑکنیں تو یقیناً غائب ہو گئی ہوں گی۔ وہ چند فٹ آگے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی ہم عمر یک ور لڑکی

بجی تھی۔

اس بار معاملہ بالکل مختلف تھا۔ پہلے وہ جب بھی حسین لڑکی کو دیکھتا تو سوچتا کہ یہ وہی ہے یعنی نورینی، اسے خیال آتا کہ اس کا تصور اس کے ساتھ بے ایمانی کر رہا ہے۔ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ وہ نہیں ہے۔ مگر اندر کوئی طاقت بحث کرتی کہ یہ وہی ہے۔ جتنی بے موقعوں پر اس کے اندر دو مختلف یقین ہوتے تھے۔ وہ ان کے درمیان ڈولتا رہتا۔ فیصلہ کرنا اس کے لئے ممکن نہ ہوتا لیکن وہ دو مختلف یقین ہونا بجائے خود ایک فیصلہ تھا۔ نفی کا فیصلہ۔ پھر وہ یہ سوچ کر خوش ہوتا کہ وہ سامنے آ بھی گئے تو وہ اسے نہیں پہچان سکے گا۔ اس خیال سے دل میں جو مایوسی کی لہر اٹھتی، اسے اس نے کبھی اہمیت نہیں دی تھی اس وقت وہ یہ کیسے سمجھ سکتا تھا کہ وہ دوسرا اہم وزن یقین دراصل عدم یقین تھا۔ یعنی شک کہہ لیجئے اور وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ کبھی کبھی شک اور عدم یقین، یقین سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ مگر اس بار اسے دیکھتے ہی اس کا دل سینے میں ناچنے لگا تھا۔ یہ وہی تھی۔ وہی آنکھیں وہی پیشانی، وہی رخسار، وہی ہونٹ اور وہی بال، اس بار اس کے وجود میں اس دوسرے یقین کا ---------- یعنی شک کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ وہ جان گیا تھا ------ اسے معلوم تھا کہ یہ وہی ہے۔

کیوں ---------- ایسا کیوں؟ تو کیا اس کا عکس دل پر مرتسم ہونے کی بجائے اس کے وجود کی کسی نامعلوم اور چھپی ہوئی گہرائی میں نقش ہو تھا خود سے بھی پوشیدہ اور اس پر نظر پڑتے ہی وہ اس کی آنکھوں میں ابھر آیا تھا دس موزند کرکے مطمئن ہو جائے۔

وہ سانسیں روکے اسے دیکھتا رہا جیسے وہ رنگوں کی بنی ہوئی کوئی گڑیا ہے، جو

سانسوں کی گرمی سے فضا میں تحلیل ہو جائے گی۔ اس کے ذہن میں نہ کوئی خوف تھا نہ مقام و مرتبے کے فرق کا تصور۔

گلے ہی لمحے اس کے یقین کی تصدیق ہو گئی۔ حالانکہ تصدیق کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

لڑکی نے اپنی ساتھی سے کہا "میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نائلہ۔ شام کو آنا شاپنگ کے لئے۔ تیز گرمی میں ٹھیک سے کوئی چیز پسند بھی نہیں کر سکو گی۔"

یہ وہ آواز تھی جو دو سو سے زائد دنوں سے اس کے کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ اس آواز کو تو وہ لاکھوں میں پہچان سکتا تھا۔

ٹھیک ہے سادی۔" دوسری لڑکی نے گہری سانس لے کر کہا۔

سادی؟ الہی بخش نے سوچا، سادی یہ کیا نام ہوا بھلا؟ پھر بھی یہ نام اسے اچھا لگا اس کی طرح مختلف اور دلچسپ۔

اسی لمحے لڑکی نے اس کی طرف دیکھا دونوں کی نظریں ملیں۔ دونوں کا تاثر بے حد مختلف تھا۔ ایک طرف وارفتگی اور محبت تھی تو دوسری طرف کچھ بھی نہیں تھا۔ جیسے لڑکی کسی درخت کو دیوار کو کسی بے جان چیز کو دیکھ رہی ہو۔

وہ محض ایک پل کی بات تھی۔ لڑکی پلٹی اور اپنی سہیلی کے ساتھ چل دی لیکن وہ مختصر سا پل اپنے اندر بہت بڑا پل تھا۔ وہ پل الہی بخش کو اداس کر گیا۔ اس نے ہر چیز کا ہر بات کا تعین کر دیا تھا۔ اس کی حیثیت بھی اسے یاد دلا دی تھی لیکن وہ وہاں بھی ایک خوشی میں چھپی ہوئی تھی ـــــــــ جیسے اس نے اسے پا لیا ہو۔

وہ بڑی محویت سے اسے دوسری لڑکی کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر

چانک سے کیا ہو یا، سے خود بھی نہیں پتا چلا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ مزدوروں کی ٹولی میں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ صبح ہی وہ کسی کام پر چلے گئے تھے۔ جو لوگ تھے ان میں کوئی بھی ں کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

ں نے اطمینان کی سانس لی اور اٹھ کر چل دیا۔ اس کے قدم خودکار انداز میں متحرک تھے۔ دیر تک اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کر رہا ہے ور کیوں کر رہا ہے۔ سے بس یہ حساس تھا کہ وہ چل رہا ہے۔

خاصی دور جا کر بات اس کی سمجھ میں آئی اور جب سمجھ میں آئی تو اس کے پورے جسم سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ زندگی میں کبھی وہ کسی لڑکی کا تعاقب کرے گا لیکن ایسا ہو رہا تھا وہ ایسا کر رہا تھا اور وہ اپنے فٹ پاتھ سے کافی آگے آ چکا تھا۔

اس بات کا حساس ہوتے ہی وہ چور بن کر رہ گیا۔ اسے لگتا تھا کہ ہر شخص ہر دکاندار ور ہر راہ گیر اسے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ وہ لڑکی کا تعاقب کر رہا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس بات پر لوگوں کے ہاتھوں مرمت شروع ہونے میں دو سیکنڈ بھی نہیں لگیں گے۔ مگر اس کے قدم کوشش اور خواہش کے باوجود نہیں رکے۔ اس نے چاہا کہ پلٹے اور اپنے ٹھیے کی طرف واپس چلا جائے لیکن سے خود پر ذرہ بھی اختیار نہیں تھا۔ اس وقت اس کی باگ ڈور کسی اور کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ اندر ہی اندر خوف سے لرزتا رہا۔ اس کے قدم بڑھتے رہے۔

دونوں لڑکیاں بائیں سمت مڑ گئی تھیں۔ آگے قطار سے بنگلے تھے۔ تیسرے یا چوتھے بنگلے کے گیٹ پر وہ دونوں رک گئیں۔ الٰہی بخش ان سے تھوڑا ہی پیچھے تھا۔ وہ

رکتا تو بیا مناسب بات ہوتی۔ اس نے اپنی رفتار بہت کم ---------- ہ نے
نام کرلی۔

نائلہ۔ آؤ نا میرے ساتھ۔ لڑکی نے اپنی سہیلی سے کہا۔

نہیں سادی میں اب چلوں گی۔

شام کو آؤ ں گی شاپنگ کے لئے؟

نہیں سادی۔ شام کو مجھے ممی کے ساتھ جانا ہے۔ اسی سے تو آج خریداری
کرنا چاہ رہی تھی۔

تو پھر شاپنگ کرتی ہیں۔

چلو کوئی بات نہیں پھر سہی اچھا سادی خدا حافظ۔

خدا حافظ نائلہ۔

سادی گیٹ کی طرف چل دی۔ دوسری لڑکی نائلہ آگے بڑھ گئی تی دیر میں
اہی بخش فاصلہ برابر کر کے ان سے آگے نکل گیا تھا۔ گیٹ کے پاس سے گزرتے
ہوئے اس نے خوف کے باوجود سرسری انداز میں گیٹ کی طرف دیکھا تھا۔ گیٹ کی
سائیڈ میں نام کی تختی لگی تھی ---------- شیخ مظہر علی نام کے نیچے بنگلے کا نمبر
ور علاقے کا نام لکھا تھا۔

اس لمحے الہی بخش کا دل اتنے زور سے ---------- ور اس نداز میں
دھڑکا کہ سے پہلے کبھی بیا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ وہ خوشی بھی ایسی تھی کہ سے یاد نہیں تا تھا
کہ کبھی وہ یسے خوش ہوا ہو۔ لگتا تھا کوئی بہت بڑا خزانہ مل گیا ہے۔ سے کوئی یک
نوکھی نعمت جو کبھی کسی کو نہیں ملتی۔ وہ جیسے گدا سے بادشاہ بن گیا تھا۔

سرشاری کی سی کیفیت میں وہ بہت دھیرے دھیرے آگے کی طرف چلتا رہا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہ دوسری لڑکی نائلہ اس کے پیچھے آ رہی ہے یا وہ بھی کسی بنگلے میں چلی گئی ہے۔ حالانکہ اسی کی وجہ سے وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ ورنہ اس کا مقصد تو پورا ہو چکا تھا۔

آگے سڑک مڑ رہی تھی۔ اب اسے خیال آیا کہ وہ دن بھر یونہی چلتا رہے گا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پلٹ کر دیکھا۔ پیچھے کوئی بھی نہیں تھا۔ سڑک سنسان تھی۔ دوسری لڑکی نہ جانے کب اپنے گھر میں چلی گئی تھی۔ اس کا گھر جاننے میں کوئی دلچسپی تھی بھی نہیں۔ اس نے ایک بار دائیں بائیں دیکھا اور پھر پلٹ کر واپس چل دیا۔ شیخ مظہر علی کے بنگلے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کے قدم رکے۔ گیٹ بند تھا۔ وہ چند قدم گیٹ کی طرف بڑھا۔ مگر فوراً ہی گھبرا کر پیچھے ہٹ آیا۔ اس کے بعد وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چل دیا۔

وہ اپنی جگہ جا بیٹھا۔ وہاں کسی نے اس کی غیر موجودگی کو محسوس نہیں کیا تھا۔ پھر بھی وہ خاصی دیر چور سا بنا بیٹھا رہا۔ اس کے بعد اسے یقین ہو گیا کہ کسی کو کچھ پتا نہیں چلا ہے وہ اپنی جگہ بیٹھا تصور میں کھویا رہا۔

اس بار اسے تصور میں دیکھنے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ وہ جیتی جاگتی تصویر تھی کہ ہاتھ بڑھاؤ اور چھو لو اور وہ پیارا سا ــــــــــــــ خوبصورت مگر عجیب سا نام ــــــــــــ سوری اور وہ بنگلہ جہاں وہ رہتی ہے وہ بنگلہ کتنا بڑا ہو گا' یہ وہ تصور نہیں کر سکا کتنا ہی بڑا ہو' اس سے وہ مرعوب تو نہیں ہو سکتا تھا' اس نے بہت بڑی زمین بہت دیکھی تھی جو ایک آدمی کی ملکیت ہوتی تھی آدمی چلتے چلتے تھک جائے لیکن زمین ختم نہ ہو۔

اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ کھانے کا وقت گزر چکا ہے۔ اسے بھوک ہی نہیں لگی۔ دھوپ کی دم توڑتی گرمی نے وقت گزرنے کا احساس دلایا تو اس نے چونک

کر ادھر ادھر دیکھا۔ شام کی چہل پہل شروع ہونے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ مزدوروں کی ٹولی واپس نہیں آئی تھی اور یقین تھا کہ اب وہ کل ہی آئیں گے۔ کام ختم کر وہ گھر ہی چلے جائیں گے۔

اس نے پھر سر جھکایا اور سادی کے تصور میں گم ہو گیا۔

شام ہوئی اور روز کی طرح بازار آوازوں سے بھر گیا۔ سینڈلوں کی کھٹ کھٹ قدموں کی چاپیں اور رقص کرتے ہوئے بچوں کی آوازیں لیکن اس روز یہ سب کچھ سے بالکل اچھا نہیں لگا۔ بلکہ وہ جھنجلا گیا۔ اس کے

تصور میں خلل پڑ رہا تھا۔ وہ ڈسٹرب ہو رہا تھا۔ اسے خیال ہی نہ آیا کہ اسی رونق کی وجہ سے ہمیشہ وہ دیر تک یہاں بیٹھا رہتا تھا یہ رونق اسے اچھی لگتی تھی اور اب وہی رونق سے بیزاری معلوم ہو رہی تی۔ وہ آوازیں جو اسے زندگی سے بھرپور لگتی تھیں اب بے معنی شور و غل لگ رہی تھیں ذہن سے سماعت مجروح ہوتی جا رہی تھی۔

اس کا جی چاہا کہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے اور چیخ کر کہے ------ بند کرو یہ شور و غل مگر اسے احساس ہو گیا کہ وہ فٹ پاتھ پر اپنی خلوت گاہ سجائے بیٹھا ہے۔ یہاں تو یہی کچھ ہو گا۔ خلوت تو بس اپنے گھر میں بند کمرے ہی میں مل سکتی ہے۔

یہ خیال آتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے اب رونق کی نہیں تنہائی کی ضرورت تھی۔ آدمی باہر کی دنیا میں رونق اس وقت تلاش کرتا ہے جب اس کے اندر ویرانی ہو، رونق کا نام و نشان نہ ہو۔ اندر دنیا کی دنیا آباد ہو جائے تو پھر باہر کی رونق بری

لگتی ہے۔ اندر کی محفلوں میں شرکت کرنے کے لئے اندر کی دنیا کی سیر کرنے کے لے تنہائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے دل کا ویرانہ تو اب جنت بن گیا تھا۔ بے رونق سے کیا۔

وہ پہلا موقع تھا کہ وہ اتنی جلدی گھر چلا گیا۔ گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی محفل سجا کر بیٹھ گیا۔ مگر شام ہوئی' سورج ڈوبا رزق کی تلاش میں نکلنے والے انسانی پرندے اپنے ٹھکانے پر آئے تو اسے احساس ہوا کہ یہ بھی گھر نہیں ہے۔ تنہائی یہاں بھی ہے۔ تو تنہائی ہوتی کہیں ہے..........ملتی کہاں ہے؟

بخشے..........تو کب آیا؟ کوئی پوچھ رہا تھا اس نے پوچھ رہا تھا کہ عام طور پر وہ سب سے آخر میں گھر آیا کرتا تھا۔

کیا بات ہے بخشو۔ جلدی آ گیا؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟ کسی اور نے پر تشویش لہجے میں پوچھا۔

میں کچھ ایسی ہی ہے۔ سر میں درد ہے۔ الٰہی بخش نے کہا۔

اس پر دوا کے سلسلے میں مشورے ملنے لگے۔ الٰہی بخش خاموشی چاہتا تھا لیکن اس کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ ممکن نہیں۔ مجبوراً اسے ہی کرنا پڑے گا۔ اسے سونے کا وقت تبھی ملے گا' جب وہ لوگ سو جائیں گے۔ اس

سے پہلے وہ جتنا جھنجلائے گا' جتنا چڑچڑا پن کرے گا' بات اتنی ہی خراب ہو گی' اس کا رویہ خلاف معمول ہوگا تو ساتھیوں کے ذہنوں میں سوالات کلبلائیں گے۔ وہ تجسس کریں گے اور یہ اچھا نہیں ہوگا۔

یار و۔۔۔۔۔۔۔۔میں کھانا کھا کر آتا ہوں پھر تاش کھیلیں گے۔ اس نے کہا اور گھر سے نکل آیا۔

کھانا کھا کر وہ واپس آیا اور تاش کھیلنے بیٹھ گیا۔ اس نے پتے اٹھائے۔ ہنٹ کی بیگم پر ساوی کا چہرہ تھا۔ ذرا رک جاؤ ساوی بیگم۔ اس نے خاموشی کی زبان میں اس سے کہا۔ یہ سو جائیں تو ہم تو خوب باتیں کریں گے۔

اس رات اسے بھری محفل میں تنہا ہونے کا ہنر بھی آ گیا۔ تصور میں ساوی تھی اور وہ تاش کھیل رہا تھا۔ کبھی کبھی غلط پتا چلنے پر اسے ٹوکا بھی گیا مگر سر درد کا بہانہ آڑے آ گیا۔ اس نے سوچا چند دنوں میں اسی طرح کھیلنے کی مشق بھی ہو جائے گی۔

اور جب سب سو گئے تو وہ ساوی کے ساتھ جاگتا رہا۔ وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی اور وہ اسے تکے جا رہا تھا۔

ارے۔۔۔۔۔۔۔۔۔تمہیں بولنا نہیں آتا کیا؟ منہ میں زبان نہیں ہے؟ وہ بولی

"منہ میں زبان بھی ہے اور اور بولنا بھی آتا ہے۔" اس نے جواب دیا "لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم سے کیا بات کروں۔

جیسے دوسروں سے بات کرتے ہو ویسے ہی مجھ سے بھی کرو۔

تم دوسروں سے بہت مختلف ہو۔ تمہارا مقام تمہارا مرتبہ اور ہے۔

وہ سر جھکا کر بیٹھ گئی اور وہ اسے تکتا رہا۔ نہ جانے کب کتنی دیر بعد اسے نیند آئی۔ آنکھ کھلی تو گھر دھوپ سے بھرا ہوا تھا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ وہ سورج نکلنے سے پہلے نہیں جاگا تھا۔ اسے کوئی اتنی پروا بھی نہیں

تھی۔کام پر تو دیر سے ہی جاتا تھا۔ہاں فٹ پاتھ کی تنہائی سے وہ ضرور محروم ہو گیا تھا۔

پھر چانک یک خلش اسے ستانے لگی۔اس کی فجر کی نماز قضا ہو گئی تھی۔اس کی تو کوئی

تلافی نہیں تھی ور سر میں عجیب سا بھاری پن تھا۔

وہ دن یک مختلف انداز میں شروع ہو رہا تھا۔نئے معمولات بن رہے تھے جنہیں

عرصے تک چلنا تھا۔

☆-------------------☆-------------------☆

نثار نے نکھیوں سے الہی بخش کو دیکھا' جو سر جھکائے کسی گہری سوچ میں گم تھا۔نثار اس

آنے والی نئی تبدیلیوں کو دیکھ رہا تھا اور حیران تھا۔یہ معما اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

اس نے الہی بخش کو پہلے دن سے دیکھا تھا۔اس میں تبدیلیاں ایسے آ رہی تھیں' جیسے وہ

بہت تیزی کے ساتھ کسی دور سے گزر رہا ہو۔

نثار نے زندگی سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر گزاری تھی۔سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر گزرنے

والی زندگی یک بہت بڑی تعلیم ہوتی ہے۔ایم اے کی ڈگری بھی آدمی کو تنا عقلمند اور

مردم شناس نہیں بناتی' جتنا سڑکیں بنا دیتی ہیں۔فٹ پاتھ پر بیٹھ کر آدمی بہت کچھ دیکھتا

ہے ور دیکھتے دیکھتے سمجھنے لگتا ہے۔خوشی ہو یا غم' اس کے ہر روپ سے وہ واقف ہو

جاتا ہے۔کچھ تو خود گزرتی ہے اور کچھ مشاہدہ سکھا دیتا ہے۔

نثار بھی بہت سمجھدار آدمی تھا۔وہ حساس بھی تھا۔اس لیے فٹ پاتھ پر بیٹھنے

والے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں بھی اس کا مشاہدہ بہت بہتر تھا۔اس نے الہی

بخش کو پہلے دن دیکھا تو اس کا تاثر تھا کہ وہ بہت برخوردار قسم کا آدمی ہے۔ سے وہ

یک ایسا شخص لگا' جو بے وقعتی کے احساس تلے دبا جا رہا ہو۔اس نے سوچا' شاید گھر

میں سے کوئی اہمیت نہیں دی جاتی ہوگی۔ ماں باپ دوسرے بیٹے بیٹیوں کے مقابلے میں اسے بے وقعت سمجھتے ہوں گے۔ بہن بھائی دیگر بہن بھائیوں کو اس پر فوقیت دیتے ہوں گے۔ اسی لئے اس کے اندر احساس کمتری کی حد کو پہنچا ہوا تکبر رہا ہے۔ پھر الہی بخش خوددار بھی تھا لیکن دوسروں کی عزت کرنا بھی جانتا تھا۔ یہ بات تو نثار سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ الہی بخش کو صرف عشق کرنا سکھایا گیا تھا..........بلکہ سکھانے کی کوشش کی گئی تھی۔ وہ عشق کرنا تو نہیں سیکھ سکا تھا کہ یہ سیکھنے والی چیز ہی نہیں۔ یہ تو ہو جاتی ہے اور ہو جائے تو آدمی کو سارے آداب خودبخود ہی آ جاتے ہیں ہیں اس کوشش کے نتیجے میں الہی بخش کو عزت کرنا ضرور آ گیا تھا اور وہ ہر شخص کی عزت کرتا تھا بغیر کسی تفریق کے۔

جس دن استاد قاسم کو رخصت کیا جا رہا تھا، الہی بخش پورے دن پوری رات ان لوگوں کے ساتھ رہا تھا۔ اس روز نثار نے اسے بہت غور سے اور بہت قریب سے دیکھا تھا۔ استاد قاسم نے مزدوری میں الہی بخش کا بھی حصہ لگایا تھا۔ نثار جانتا تھا کہ اس پر کسی بھی ساتھی کو کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن الہی بخش کو وہ پیشکش بری..........بہت بری لگی تھی۔ اس کے نزدیک اس پر اس کا حق نہیں تھا۔ اس لئے کہ اس نے سامان نہیں ڈھویا تھا۔ وہ رقم لینا اس کی خودداری کی توہین تھی۔ وہ فٹ پاتھ کا ساتھی ہونے کے ناتے ان کے ساتھ چلا آیا تھا۔ اس لئے بھی کہ قاسم کا وہ بہت احترام کرتا تھا۔ پھر بھی اس نے نہ چاہتے ہوئے وہ رقم قبول کر لی۔ یہ صرف عزت کی بات تھی۔ نثار نے خود کو الہی بخش کی جگہ رکھ کر سوچا تھا تو بات اس کی سمجھ میں آئی تھی۔ الہی بخش کے نزدیک وہ رقم لینا اس کی پکی بے عزتی تھی تو استاد قاسم کے اصرار کے باوجود اس رقم کو قبول نہ کرنا

نہ صرف قاسم کی بلکہ پوری ٹولی کی بے عزتی تھی۔اس لئے اس نے اپنی بے عزتی کو گوارا
کر کے وہ رقم لے لی تھی لیکن موقع ملتے ہی اس نے اپنی عزت بھی بحال کر لی تھی۔وہ
رقم اس نے اپنے پاس سے اضافہ کر کے لوٹا دی تھی۔نثار ہی کو تو وہ دی تھی اور کتنا اصرار
کیا تھا اس کے لیے اور اس طرح کہ کسی اور کو پتا بھی نہیں چلا تھا۔یہ الگ بات کہ نثار
نے سب کو بتا دیا تھا۔یوں ٹولی کے مزدور الٰہی بخش کی اور عزت کرنے لگے تھے۔

لیکن نثار کو ایک خلش رہی تھی۔کون جانے الٰہی بخش نے اپنی جیب میں کچھ
بھی نہ چھوڑا ہو۔سب کچھ استاد قاسم کے لئے دے دیا ہو۔الٰہی بخش جیسے آدمی سے یہ
بعید بھی نہیں تھا۔نثار کو ایک اور منظر بھی یاد تھا۔جب وہ لوگ ٹھیلا لے کر استاد قاسم
کے گھر پہنچے تو قاسم کی بچیاں بھی ٹھیلا دیکھنے کے لئے بے تاب ہو کر پردے کے پاس
آ گئی تھیں اس وقت الٰہی بخش کے سوا ہر مزدور کی نظریں پردے کی طرف اٹھی تھیں، چاہے
ایک پل کے لئے ہی ہو۔نثار کو وہ بات بری نہیں لگی تھی سب کا ردعمل فطری تھا۔مگر
اس میں میلا پن نہیں تھا لیکن الٰہی بخش نظریں جھکا کر بیٹھا رہا تھا۔

اور الٰہی بخش تو طارق روڈ کے فٹ پاتھ پر سرسراتے رنگین آنچلوں، چہکتے
جسموں اور ہلکورے لیتی خوشبوؤں کے درمیان بھی نظریں جھکائے بیٹھا رہتا تھا۔

پھر اس میں تبدیلی آئی۔وہ نظریں اٹھا کر نسوانی چہروں کو ٹٹولنے لگا تھا۔
مگر نثار کو اس کی وہ نظریں بھی بری نہیں لگیں۔ان نظروں میں بوالہوسی نہیں تھی۔ایک
تڑپ تھی۔تلاش تھی، جیسے وہ کسی کو ڈھونڈ رہا ہو۔ان دنوں وہ بہت بے چین اور کھویا
کھویا رہتا تھا۔کام ملتا تو وہ نمٹانے کی کوشش کرتا۔جیسے اپنا ٹھیا چھوڑنا اسے گوارا نہ ہو۔
جیسے وہ وہاں سے اٹھ گیا تو اس کی کوئی قیمتی چیز کھو جائے گی۔

ور اب اس میں ایک اور تبدیلی آئی تھی۔ اس نے نظریں اٹھانا پھر چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ پھر سر جھکائے بیٹھا رہتا تھا۔ اصو و نار کو یہ دیکھ کر یہ سوچنا چاہیے تھے کہ الٰہی بخش پھر پہلے جیسا ہو گیا ہے لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ بات نہیں ہے پہلے میں ور اب میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ پہلے کی جھکی ہوئی نظروں میں اس کا فطری شرمیلا پن تھا جبکہ اب وہ کبھی تقاقا نظریں اٹھاتا اور سامنے لڑکیوں اور عورتوں کا ہجوم ہوتا تو وہ اس کے سامنے رو دیکھتا محسوس ہوتا۔ اس کی نگاہوں میں بے نیازی اور طمانیت ہوتی۔ جیسے تلاش ختم ہو گئی ہے۔ جسے وہ ڈھونڈ رہا تھا وہ اسے مل گیا ہے۔ جیسے اب کسی سے کوئی واسطہ نہ ہو ور وہ سر جھکائے بیٹھا ہوتا تب بھی اس کے انداز میں اس کے چہرے پر طمانیت ہوتی وہ پہلے والی بے چینی وہ اضطراب ختم ہو گیا تھا۔

یک ور تبدیلی آئی تھی۔ اب کوئی کام ملتا تو وہ پہلے سے زیادہ تکرار اور تیزی سے بات کرتا۔ مثلاً کوئی آیا اور کہا کہ گھر میں رنگ و روغن کرنا ہے۔ درمیان میں تو وہ جرح کرنے لگا تھا۔ مزدوری ریٹ سے زیادہ مانگتا۔ کوشش کرتا کہ گاہک سے چھوڑ جائے۔ کوئی اور کاریگر دیکھ لے۔

ب وہ کہتا "کر دیں گے صاحب جی۔

کیا لو گے؟

وہی دیہاڑی صاحب جی۔۔۔ پچیس روپے روز۔

نہیں بھئی دیہاڑی کے چکر میں تم لوگ کام لمبا کر دیتے ہو۔ میں بہت بھگت چکا ہوں

تو پھر صاحب جی

تم چال کے گھر دیکھ لو پھر ٹھیکے کی بات کر لیں گے۔

اس کی کوئی ضرورت نہیں صاحب جی آپ میرے ساتھ بے انصافی تھوڑی کرو گے جو جی چاہے دے دینا۔

یہ تقریباً پندرہ دن پہلے کی بات تھی اور نثار جانتا تھا کہ اس کے بعد سے اب تک الٰہی بخش کو کوئی کام نہیں ملا ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ دیہاڑی والے مزدوروں کے ساتھ یہ بزم گرم چلتا رہتا ہے لیکن توازن قائم رہتا ہے۔ کام کے دو تین چھ دن بے کاری کے چار چھ دنوں کی تلافی کر دیتے ہیں۔ مگر نثار جانتا تھا کہ الٰہی بخش کی بے کاری لمبے عرصے سے چل رہی ہے۔ آخری کام بھی اسے دو ہفتے پہلے ملا تھا۔

ایک خیال نے نثار کو چونکا دیا۔ وہ اٹھا اور الٰہی بخش کے پاس چلا گیا۔ اس کے برابر میں آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے اس نے اسے پکارا لیکن الٰہی بخش اپنے آپ میں گم رہا۔ نثار نے اسے پھر پکارا۔ وہ اسے جھنجھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اتنی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے کسی شخص کو چونکانا کبھی نہیں چاہیے۔

بالآخر چوتھی پانچویں آواز پر الٰہی بخش کی محویت ٹوٹی اس نے سر اٹھایا۔ اس کی نظریں نثار سے ملیں۔

اس کی آنکھوں میں دیکھا تو نثار بیچ دہل کر رہ گیا۔

☆-----------☆------------☆

زندگی کے اس نئے اور مختلف دور میں الٰہی بخش بہت خوش تھا۔ فاقہ مستی کا تجربہ پہلی بار ہو رہا تھا۔ ایک تصور تھا" جو اسے ہر لمحہ سرشار رکھتا تھا۔ اسے کوئی فکر، کوئی پریشانی، کوئی دکھ نہیں تھا۔ اس کے پاس خوشی ہی خوشی تھی۔ وہ ہر حال میں خوش تھا۔

وہ خود بدل گیا تھا۔ زندگی بدل گئی تھی۔ دن رات بدل گئے تھے۔ معمولات بدل گئے تھے۔ تنہائی تنہائی نہیں تھی اور محفل محفل نہیں تھی۔ اسے کچھ بھی برا نہیں لگتا تھا۔ کوئی اس سے بات کرتا تو اسے اچھا لگتا۔ جھنجلاہٹ اس کے مزاج سے خارج ہو گئی تھی۔ وہ رات میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ تاش کھیلتا۔ خوب چہکتا' ہنستا بولتا۔ رات کو سب سو جاتے تو وہ دیر تک جاگتا۔ البتہ دیر تک سونے کی برائی پر اس نے جلد ہی دن میں قابو پا لیا تھا۔ نیند پوری ہوتی نہیں لگتی تھی۔ مگر اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اتوار کو چھٹی ہوتی اور وہ جی بھر کے سوتے۔

اسے حیرت ہوتی تھی پہلے اس کی وہ کمزوریاں تھیں۔ وہ نیند کا بہت پکا اور بھوک کا بہت کچا تھا۔ مگر اب یہ کمزوریاں دور ہو چکی تھیں۔ اسے عشق کی طاقت کو تسلیم کرنا پڑا۔ اس نے سمجھ لیا کہ عشق انسان کی ہر کمزوری دور کر کے اسے عجیب طاقت بخشتا ہے۔ عشق قناعت سکھاتا ہے۔ ہر حال میں خوش رہنا سکھاتا ہے اور وہ بہت خوش تھا۔

ہر روز نیند پوری کیے بغیر وہ معمول کے مطابق اٹھتا۔ فجر کی نماز ادا کرتا۔ اس کے بعد عام دنوں میں وہ کام پر چلا جاتا اور اتوار کا دن ہوتا تو نماز کے بعد دوبارہ سو جاتا۔ صبح سویرے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر وہ سوئے ہوئے گرد و پیش سے ہمیشہ کی طرح محظوظ ہوتا۔ پھر چہل پہل شروع ہوتی اور وہ کام ملنے کا انتظار کرتا رہتا۔

ایک نیا معمول اس کی زندگی میں شامل ہوا تھا۔ ہمیشہ کی طرح وہ اب بھی سوا بارہ بجے کھانے کے لیے اٹھتا۔ ڈیڑھ بجے وہ واپس آتا۔ اسے یہ دیکھ کر ہوتا تھا کہ وقفے میں اس نے اس بنگلے کے کتنے چکر لگائے ہیں' جس میں سادی رہتی ہے۔ کتنی بار

وہ جاتے ہوئے ور آتے ہوئے اس بنگلے کے سامنے سے گزرا ہے۔ وہ یک بار اس نے یہ سمجھنے کی کوشش کی کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔ پھر اس نے یہ سوچنا بھی چھوڑ دیا۔ تنا کافی تھا کہ س طرف جاتے ہوئے اس کے قدموں کی کیفیت رقص کی سی ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ساوی کا چہرہ ہوتا ہے اور اس کا دل ایسے دھڑکتا ہے جیسے کوئی نغمہ س رہا ہے۔ تنی خوبصورت کیفیت کا سبب معلوم کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس تمام عرصے میں س نے ساوی کو ایک بار بھی نہیں دیکھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ بنگلے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اگر اسے ساوی نظر آ گئی تو کیا ہوگا؟ وہ کیا کرے گا؟ سچ تو یہ ہے کہ اب سے ساوی کو دیکھنے کی آرزو بھی نہیں تھی۔ کم از کم وہ تو یہی سمجھتا تھا۔ جس کی تصویر ہر وقت نگاہوں میں بسی رہتی ہو، اس کی جستجو کیا معنی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اب پھر سر جھکا کر بیٹھتا تھا۔ اس کی آنکھیں اب رنگین رونقوں کو نہیں ٹٹولتی تھیں۔ بلکہ اب سے ساوی کی مانوس آواز اپنے قریب کہیں سے سنائی دے جاتی تو بھی وہ نظریں اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ شاید وہ سیر چشم ہو گیا تھا۔

یک اور نیا معمول بھی بنا تھا۔ کام نہ ملنے کی صورت میں اب وہ شام سے پہلے ہی گھر چلا جاتا تھا۔ طارق روڈ کی رونقوں میں اب اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ گھر کی تنہائی اس سے بدرجہا بہتر تھی۔ اسے مطالعہ کا شوق بھی ہو گیا تھا۔ کبھی کہیں سے شاعری کی کوئی کتاب مل جاتی تو وہ زیادہ ہی شوق سے پڑھتا۔ عام طور پر وہ ڈائجسٹ پڑھتا۔ کبھی کوئی ادبی ناول یا کتاب مل جاتی تو وہ بھی پڑھتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ اس کی دنیا وسیع ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا ذہن بھی دنیا کی طرح ہوتا جا رہا تھا۔ جو موجود تھا' نہیں دریافت کیے جانے کا منتظر تھا۔

ں وقت بھی وہ سادی کے تصور میں کھویا ہوا تھا۔ اسے پکارے جانے کا موہوم سا احساس ہو۔ مگر یوں جیسے قریب سماعت ہو۔ پکار بڑھتی گئی اور آواز کا حجم بھی بڑھتا گیا تو اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا اسے حیرت ہوئی نثار اس کے پہلو میں بیٹھا سے آواز دے رہا تھا۔ کیا بات ہے نثار بھائی اس نے سادگی سے کہا۔

نثار کچھ دیر جواب میں کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ الہی بخش نے چونک جو نظریں اٹھائیں تو اس کی آنکھوں میں اسے نقاہت نظر آئی۔ اس کے بد ترین خدشات کی تصدیق ہو گئی۔ اسے افسوس ہوا کہ اس نے پہلے یہ خیال کیوں نہیں کیا۔ اسے احساس جرم ستانے لگا۔ آنکھوں میں وہ نقاہت تو اس نے بہت دیکھی تھی.......... اپنے گھر میں بھی اور اپنی آنکھوں میں بھی۔ خاصی کوشش کر کے نثار نے خود کو سنبھالا۔ سوال یہ تھا کہ بات کیسے کی جائے۔ الہی بخش کی خودداری سے وہ خوب واقف تھا۔ معاملہ بہت نازک تھا۔

تجھ سے بات کرنے کو دل چاہ رہا تھا بخشے۔ نثار نے کہا اس نے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کن سوچوں میں گم رہتا ہے۔ "لگتا ہے میں مخل ہو رہا ہوں۔"

ارے نہیں نثار بھائی ایسی کوئی بات نہیں۔

اس دوران نثار بہت تیزی سے کوئی ترکیب سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سے مزید مہلت حاصل کرنے کے لئے ایک اور سوال اٹھایا۔ آج کل تو بہت جلدی گھر چلا جاتا ہے؟

ہاں نثار بھائی

گھر میں کیا دل لگتا ہو گا؟

پڑھنے میں دل لگنے لگا ہے نثار بھائی یہ دیکھو الٰہی بخش نے اپنے تھیلے میں سے ڈائجسٹ نکال کر دکھایا۔

اچھی بات ہے۔ نثار نے سر ہلا کر کہا۔ پھر بولا۔ یار بخشو آج میں کھانا تیرے ساتھ کھاؤں گا۔ یہ کہتے ہوئے وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

الٰہی بخش کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ تاہم اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ بھی تو بڑ وقت پڑ ہے نثار بھائی۔

الٰہی بخش کے چہرے کے تاثر نے نثار کے اندازے کی پکی تصدیق کر دی تھی۔ مگر پوری بات کرنے کے لئے بات آگے بڑھانا ضروری تھا۔ ایک بات کہنی ہے تجھ سے اس نے کہا۔ تو سوچے گا کہ میں بہت بے شرم آدمی ہوں لیکن یار بخشو آدمی جسے اپنا سمجھتا ہے اس سے تو بات کر سکتا ہے اس میں شرم کی بات نہیں۔ میں تجھے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھتا ہوں۔ تجھ پر تو حق ہے میرا نظریں جھکا کے ہی سہی تجھ سے تو سوال ڈال سکتا ہوں؟

نثار کے لہجے میں عاجزی اور بے بسی محسوس کر کے الٰہی بخش موم ہو گیا۔ تم مجھ سے ہر بات کر سکتے ہو نثار بھائی اس نے کہا۔ میرے تمہارے درمیان تعلق ہی ایسا ہے میں بھی تمہیں بڑا بھائی سمجھتا ہوں ہم ایک دوسرے کے سامنے کبھی شرمندہ نہیں ہو سکتے۔

بات یہ ہے بخشے کہ مجھے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔ تیرے سوا میں کسی سے سوال نہیں کر سکتا۔ میرا خیال ہے کہ ضرورت کے وقت تجھے بھی میرے سوا کوئی نظر نہیں آنا چاہیے۔

الہی بخش کو چکر تو پہلے سے ہی آ رہے تھے پر یوں لگا جیسے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ اسے تو فاقہ مستی میں احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ کتنے سخت وقت سے گزر رہا ہے۔ سترہ دن سے اسے کام نہیں ملا تھا اور اس سے پہلے وہ خود کام سے بچتا رہتا تھا۔ اس کے نتیجے میں جو پس انداز کیا تھا وہ بھی بیٹھے بیٹھے کھا لیا تھا۔ سترہ دن پہلے جو پیسے ملے تھے وہ اس نے گھر کے پاس جو ہوٹل تھا وہاں دے دیے تھے۔ اس ہوٹل میں وہ ناشتہ کرتا تھا اور اب تو باقاعدگی سے رات کا کھانا بھی کھانے اور کرنے کا خرچہ تین دن چل سکتا تھا۔ اسے امید تھی کہ اس دوران اسے کام مل جائے گا اور معاملات ٹھیک ہو جائیں گے لیکن اس کے بعد سے اب تک کام نہیں ملا تھا۔

الہی بخش کو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ کتنے دن سے وہ پیدل" ور جا رہا ہے۔ کتنے دن سے وہ صرف رات کے کھانے پر گزارہ کر رہا ہے۔ اس لئے کہ ہوٹل سے ادھار کھانا اس کی مجبوری تھی مگر اسے شرمندگی ہوتی تھی۔ ناشتہ کرنا بھی اس نے چھوڑ دیا تھا۔ اسے یاد نہیں تھا کہ کتنے دن سے اس کی جیب خالی ہے۔

چکر کے ساتھ پیٹ میں اینٹھن بھی ہونے لگی۔ تب اسے یاد آیا کہ آخری بار اس نے کھانا پرسوں رات کھایا تھا، اس کے بعد سے اب تک اس کے منہ میں کھیل بھی اڑ کر نہیں گئی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ پرسوں رات کھانے کے بعد وہ کھاتے میں ادھار لکھوانے گیا تو ہوٹل کے مالک نے پوچھ لیا کہ کیا اسے کام اب تک نہیں ملا ہے۔ حالانکہ ہوٹل والے کا لہجہ خراب نہیں تھا اور انداز دوستانہ اور ہمدردانہ تھا۔ پھر بھی الہی بخش کو ہتک کا احساس ہونے لگا۔ ناشتہ تو وہ ویسے بھی نہیں کرتا تھا۔ اگلے روز وہ رات کا

کھانا کھانے بھی نہیں گیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ ادھار چکائے بغیر وہاں نہیں جائے گا۔

ور اب نثار کہہ رہا تھا کہ اسے کچھ پیسوں کی ضرورت ہے۔ وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ آج وہ کھانا اس کے ساتھ ہی کھائے گا۔ گیارہ بج چکے تھے ور کام ابھی تک نہیں ملا تھا۔

ور نثار نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ کسی اور سے مدد نہیں مانگ سکتا۔ وہ سے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھتا ہے۔

یہ خیال کر کے الٰہی بخش کے حلق میں جیسے نمکین پانی کا کوئی چشمہ پھوٹا۔ پل بھر میں اس پانی کو اس کی آنکھوں کی طرف لپکنا اور جاری ہو جانا تھا۔ اس نے بہت تیزی سے اس کے آگے ضبط کا بند باندھا۔ پھر بھی آنکھیں نم تو ہو ہی گئیں۔ یہ بہت بڑی کامیابی تھی کہ وہ چھلکیں نہیں۔

تو خاموش کیوں ہو گیا بخشے۔ نثار نے اسے چونکا دیا۔

کچھ نہیں نثار بھائی۔ الٰہی بخش نے کہا۔ اللہ مالک ہے کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔ انشاء اللہ کھانا ہم ساتھ ہی کھائیں گے۔ اس لمحے اس کی زبان کو چھوئے بغیر دل سے دعا نکلی کہ کام مل جائے۔

جواب نہ دو گو استاد تو اچھا ہے۔ الٰہی بخش نے آہ بھر کے کہا۔ اس حساس نے ہی کا حفاظتی حصار توڑ دیا کہ نثار کو مدد کی ضرورت ہے اور وہ اس کی مدد نہیں کر سکتا۔ میری جیب تو نہ جانے کتنے دن سے خالی ہے۔ مگر فکر نہ کرو اللہ مالک ہے۔

تو اتنے دن سے کام کیسے چلا رہا ہے تو؟

کبھی کچھ نہ بتانے والے الٰہی بخش نے صرف شرمندگی میں ڈوبے ہونے کی وجہ سے نثار کو بتا پورا حال سنا دیا۔

نثار کی شرمندگی کی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ دل ہی دل میں خود کو برا بھلا کہتا رہا۔ یک فٹ پاتھ پر ساتھ بیٹھ کر بھی وہ اس سے اتنا بے خبر تھا جبکہ اسے معلوم تھا کہ اتنے دن سے سے کام نہیں ملا ہے۔ تو نے تو غیریت کی حد کر دی بخشے اس نے خفگی سے کہا مجھے کیوں نہیں بتایا۔

میر خیال ہے فٹ پاتھ پر سبھی کا حال ایک جیسا ہوتا ہے۔ ہی بخ نے سادگی سے کہا۔

پھر بھی لوگ ایک دوسرے کے کام آتے رہتے ہیں۔ نثار شرمندہ بھی تھا اور خفا بھی ---------- الٰہی بخش سے بھی اور اپنے آپ سے بھی۔ تجھے مجھ کو بتانا تو چاہیے تھا۔

لیکن نثار بھائی یہ ------------"

تو نہیں سمجھتا پڑوسی بھوکا رہے تو پڑوسی سے اللہ جواب طلب کرتا ہے۔ وعدہ کر آئندہ سک بات چھپائے گا نہیں۔ کوئی ایک آدمی تو ہر ایک کے لیے ایسا ہوتا ہے جس سے دل کی بات کی جا سکتی ہے۔ تو مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھ کر۔

الٰہی بخش حیرت سے سوچتا رہا کہ یہ نثار اتنا شرمندہ کیوں ہو رہا ہے۔ شرمندہ تو اسے ہونا چاہیے تھا۔

ادھر نثار سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ پیسے تو اس کی جیب میں اس وقت بھی تھے اور وہ الٰہی بخش کو دے سکتا تھا لیکن یہ ٹھیک نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس نے

ضرورت مند بن کر بات نہ کی ہوتی تو الٰہی بخش کبھی بچ نہ نکلتا۔ اب وہ اسے یوں پیسے نہیں دے سکتا تھا۔ آئندہ کے لئے بات خراب ہو جاتی۔ نثار جانتا تھا کہ الٰہی بخش کی طرح کیسے ہونا کتنی خوفناک بات ہے۔ آدمی دکھ سے یا بھوک سے سسک سسک کر مر جائے لیکن کسی طرح اظہار نہ کرے۔ وہ الٰہی بخش کو دکھ اور مصائب بانٹنا اور کسی کو اپنا سمجھنا سکھانا چاہتا تھا۔

لیکن نثار بھائی تم تو مجھ سے زیادہ پریشان ہو۔ تم تو بال بچوں والے ہو۔ الٰہی بخش کہہ رہا تھا۔

نثار نے چونک اسے دیکھا "تو فکر نہ کر۔ مجھے اپنے لئے بھی کچھ پیسوں کا بندوبست کرنا ہے تیرے لئے بھی کر لوں گا۔ تو بیٹھ میں آتا ہوں"۔

یہ کہہ کر نثار اپنی بات کا بھرم رکھنے یعنی پیسوں کا بندوبست کرنے کی غرض سے ایک طرف چلا گیا۔ پانچ منٹ بعد وہ آیا تو الٰہی بخش اپنی جگہ موجود نہیں تھا۔ نثار نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے الٰہی بخش اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں وہ تھیلا تھا جس میں وہ اپنے برش وغیرہ رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک خوش لباس آدمی بھی تھا۔

الٰہی بخش نثار کے پاس آ کر رکا۔ نثار بھائی مجھے کام مل گیا ہے۔ اب چلتا ہوں۔ کل ملاقات ہوگی۔ اس نے چہک کر کہا اور نثار سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ہاتھ ملانے کے دوران اس کے ہاتھ سے کوئی کاغذ کی چیز نثار کے ہاتھ میں منتقل ہو گئی۔ پھر الٰہی بخش تیز قدموں سے آگے بڑھ گیا۔

نثار نے حیرت سے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ وہ دس کا نوٹ تھا جو الٰہی بخش بہت

خاموشی سے سے تھما گیا تھا۔ چند لمحے تو نثار سناٹے کی سی کیفیت میں ساکت کھڑا رہا۔
پھر اس نے الٰہی بخش کو پکارنے کے لئے ہونٹ کھولے۔ مگر ایک احساس نے اسے
روک دیا۔ کسی کو مدد دینا سکھانے کے لئے ضروری ہے کہ اس سے مدد لی جائے۔ نثار
نے اس کا وہ نوٹ جیب میں رکھ لیا۔ یہ نوٹ وہ اگلے روز واپس بھی کر سکتا تھا اور یہ بتا
بھی سکتا تھا کہ بھائی کو بھائی سے مدد لینے میں عار نہیں ہونی چاہیے۔

ادھر تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے الٰہی بخش بہت خوش تھا۔ رزق دینے والے
نے اس کی شرم رکھ لی تھی۔ اس نے کسی سے مدد نہیں مانگی تھی لیکن نثار کے سامنے
اعتراف کرنے کے بعد وہ نثار سے کچھ لینے کو منع نہیں کر سکتا تھا اور وہ کچھ لینا بھی نہیں
چاہتا تھا۔ اللہ نے اس کی دل سے نکلی ہوئی دعا سن لی تھی۔ نثار کے جاتے ہی وکیل
صاحب آ گئے تھے۔ وکیل صاحب نے ایک بار پہلے بھی اس سے کام کرایا تھا اور اس
سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ قریب ہی وکیل صاحب کا بہت بڑا دو منزلہ مکان تھا۔
پچھلی بار انہوں نے اپنی تین دکانوں میں رنگ کرایا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ اگلی بار وہ اسے
پورے بنگلے کا کام دیں گے۔

وکیل صاحب نے اس سے کام کی بات کی تو اس نے کہا "وکیل صاحب ایک
بات کہوں برا تو نہیں مانیں گے؟

وکیل صاحب چونکے انہوں نے سوچا شاید یہ زیادہ مزدوری کی بات کرے
گا پھر بھی انہوں نے کہا بولو کیا بات ہے؟

صاحب جی مجھے پندرہ روپے پیشگی دے سکتے ہیں؟

وکیل صاحب نے جیب سے بیس روپے نکال کر اسے دے دیئے یوں

عزت رہ گئی۔

سو اب الٰہی بخش کا رواں رواں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا۔ شکر گزاری کے بعد توبہ کا وقت آیا۔ الٰہی بخش کی سمجھ میں آیا کہ پچھلے دنوں میں اس نے کام ٹھکرا ٹھکرا کر بہت ناشکرا پن کیا ہے۔ ورنہ اس پر یہ وقت ہی نہیں آتا اور اللہ نے تو اس ناشکرے پن کے باوجود اس کی حاجت روائی فرمائی ہے۔

بے شک وہ بڑا رحیم والا نہایت مہربان ہے اور اب تو سب تعریفیں اسی کے لئے ہیں۔

☆----------☆------------☆

وکیل صاحب کا کام دس دن میں ختم ہوا اور الٰہی بخش کے سارے دلدر دور ہو گئے۔ ہوٹل کا حساب چکتا ہو گیا اور جیب بھی بھاری ہو گئی۔ مگر اسے ایک بڑا سبق مل گیا تھا اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کام کو کبھی نہیں ٹھکرائے گا۔

لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے بارے میں اوپر کچھ اور فیصلہ ہو چکا ہے۔

اس روز وہ معمول کے مطابق سوا دو بجے اٹھا۔ کھانا کھا کر وہ سعدی کے گھر کی طرف چل دیا' جہاں وہ گزشتہ دس دن سے نہیں جا سکتا تھا۔ شاید اسی لئے اس روز اس کے قدموں میں دھمال کی سی کیفیت تھی۔

شیخ مظہر علی کے بنگلے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے خیال آیا کہ اگر کبھی اس بنگلے کا گیٹ اس کے لئے کھل جائے تو کیا ہو۔ اس نے فوراً ہی اس فضول خیال کو ذہن کے کسی نہاں خانے میں دھکیل دیا۔ نہ کبھی ایسا ہونا تھا نہ اس کی ایسی خواہش تھی۔

معمول کے مطابق وہ اس موڑ تک گیا' جہاں سڑک زاویہ قائمہ بناتے ہوئے دونوں جانب مڑتی تھی۔ وہاں سے وہ واپسی کے لئے پلٹا۔ وہ پلٹا تو ہمیشہ کی طرح شیخ صاحب کے بنگلے کے سامنے والے فٹ پاتھ پر تھا۔ یعنی اس کے اور بنگلے کے درمیان سڑک حائل تھی۔

وہ کوئی بیس گز چلا ہوگا۔ وہاں آئس کریم اور ٹھنڈی بوتلوں کی ایک چھوٹی سی دکان تھی وہ وہاں سے گزر رہا تھا۔ اسی وقت پانچ چھ سال کا ایک لڑکا ایک بوڑھے کی انگلی تھامے سڑک پار کر رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ دونوں ساتھ ہیں۔

اسی لمحے موڑ کی طرف سے کسی گاڑی کے ٹائر سڑک سے رگڑنے اور چرچرانے کی آواز سنائی دی۔ کچھ چرچراہٹ بریکوں کی وجہ سے بھی تھی۔

الٰہی بخش نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک سرخ رنگ کی کار موڑ مڑ کر اسی سڑک پر آ رہی تھی۔ گاڑیاں نوے درجے کے موڑ ایسی رفتار سے نہیں کاٹتیں۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ موڑ کاٹتے ہوئے گاڑی سڑک کی دوسری سائیڈ تک پہنچ گئی تھی اور اب وہ یوں سنبھل رہی تھی جیسے کوئی شرابی گرنے کے بعد اٹھ کر لڑکھڑاتے ہوئے سنبھلتا ہے۔ اس کی رفتار اب بھی بہت زیادہ تھی۔

الٰہی بخش کی نظریں سڑک کی طرف اٹھیں۔ بوڑھا اور بچہ اس وقت سڑک کے عین وسط میں تھے۔ انہوں نے گاڑی کی آواز بھی سن لی تھی اور بے قابو گاڑی ہی کی طرف متوجہ تھے پھر انہوں نے سڑک پار کرنے کی بجائے واپس آنے کا فیصلہ کیا۔ اس لئے کہ گاڑی رانگ سائیڈ پر آتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ پلٹے اور اسی طرف لپکے جہاں الٰہی بخش کھڑا تھا۔

ادھر گاڑی سنبھل کر اب درست سائیڈ کی طرف آ رہی تھی۔

الٰہی بخش کو صورت حال کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔ گاڑی کی جو رفتار تھی اس سے ان تک پہنچنے میں گاڑی کا ایک سیکنڈ کا وقت بھی نہ لگتا۔ ان دونوں کے پاس نہ سب پلٹنے کی مہلت تھی اور نہ وہ گاڑی سے بچ کر ادھر آ سکتے تھے۔

فیصلہ کرنے کی بھی مہلت نہیں تھی۔ گاڑی اسی رفتار سے چنگھاڑتی چلی آ رہی تھی۔ دونوں نے بھی دیکھ لیا تھا اور اب خوف سے اپنی جگہ جم کر رہ گئے تھے۔ الٰہی بخش نے تیزی سے جست لگائی اس کے دونوں ہاتھ آگے کی طرف پھیلے ہوئے تھے۔ اسے صرف احساس ہوا کہ گاڑی بالکل اس کے سر پر آ پہنچی ہے۔ آخری کوشش کے طور پر اس نے اپنے ہاتھ پھیلا کر دھکیلے۔ اس کے ہاتھ دو جسموں سے ٹکرائے۔ ساتھ ہی گاڑی اس کے جسم سے ٹکرائی۔ اس نے خود کو فضا میں اڑتا محسوس کیا۔ سڑک پر گرنے تک وہ اپنے حواس میں تھا مگر پھر اسے کسی بات کا ہوش نہیں رہا۔

☆-----------☆-------------☆

آنکھ کھلی تو وہ جنت میں تھا۔

اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ وہ لیٹا ہوا تھا۔ ساری روشنی سے اس کی پیشانی صاف کر رہی تھی۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کی پیشانی پر زخم ہے جس سے خون رس رہا ہے لیکن یہ احساس فوراً ہی معدوم ہو گیا۔ خوشی تکلیف سے زیادہ بڑی تھی۔ پھر بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے اور یہاں تک کیسے پہنچا ہے۔ اتنا اسے یاد تھا کہ اس نے ایک بڈھے اور بچے کو بے قابو کار سے بچانے کی کوشش کی تھی اور خود گاڑی کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔

تم یہ من مانی کرتی ہو سعدیہ۔ کسی نے کہا؛ اگر آنے والا ہے وہ دیکھ لے گا۔ تو خواہ مخواہ ڈ کٹر دکھ رہی ہو۔

الٰہی بخش نے سر گھما کر دیکھا اور اس خاتون کو بھی پہچان لیا۔ اس نے پہلی بار ساوی کو دیکھا تو یہی

س کے ساتھ تھی۔ وہ یقیناً اس کی ماں تھی۔ پھر اسے ایک اور خیال آیا۔ ساوی کا نام سعدیہ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پیارا نام ہے سعدیہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ لیکن ساوی کتنا اچھا لگتا ہے۔

آپ بھی کمال کرتی ہیں امی ساوی نے کہا؛ ڈ کٹر کے انتظار میں یونہی چھوڑ دیا جائے۔ کم از کم زخم کی صفائی تو کی جا سکتی ہے۔

چھا بھئی جو جی چاہے کرو۔

الٰہی بخش لیٹے لیٹے یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کس حد تک زخمی ہے۔ اس نے ہاتھ ہلائے' ٹانگوں کو حرکت دی۔ گھٹنوں کے نیچے کچھ تکلیف ہو رہی تھی اس کے علاوہ سر اور پیشانی بھی دکھ رہے تھے اور کہیں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ یہ حیرت انگیز بات تھی کیونکہ وہ گاڑی کے عین سامنے تھا۔ اصولاً گاڑی کو اس کے اوپر سے گزر جانا چاہیے تھا یک ہی بات سمجھ میں آتی تھی۔ آخری لمحے میں ڈرائیور گاڑی کو اس سے دور کاٹنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ گاڑی کی سائیڈ سے ٹکرایا ہوگا اس سے وہ فضا میں اچھلا تھا ور سر کے بل گرا تھا۔ یعنی خدا نے کرم کیا تھا بہت سستے میں جان چھوٹ گئی تھی۔ جان چھوٹ گئی تھی اور انعام کتنا بڑا تھا۔ یہ طے تھا کہ اس وقت وہ ساوی کے گھر میں ہے' جس کے گیٹ سے گزرنے کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

لو۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر بھی آ گیا۔ اب ہٹ جاؤ' ساری کی ماں کی آواز

نے اسے چونکا دیا۔

وہی بڈھا شخص ڈاکٹر کا بیگ اٹھائے ہوئے تھا جسے اس نے دھکیلا تھا اس

کے پیچھے ڈاکٹر تھا' ساری اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اب الٰہی بخش نے دیکھا کہ وہ پلنگ کی

سائیڈ میں ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ بیٹھیے ڈاکٹر صاحب اس نے مترنم آواز میں کہا۔

ڈاکٹر نے اس سے پوچھا کہ تکلیف کہاں کہاں ہو رہی ہے۔ پھر اس نے

سے چیک کیا۔ تشویش کی کوئی بات نہیں بیگم صاحبہ اس نے ساری کی ماں سے کہا۔

معمولی چوٹیں ہیں۔ البتہ سر کی اندرونی چوٹ خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ میں دوائیں لکھ

رہا ہوں۔ منگو لیں۔ مریض کو آرام کی ضرورت ہے ہاں اسے قے ہوئی متلی کی

شکایت کرے تو مجھے فوراً بلوا لیجیے گا۔ بیگم صاحبہ نے ڈاکٹر کو فیس دی۔ ڈاکٹر چلا گیا۔ بیگم

صاحبہ نے ڈاکٹر کا لکھا نسخہ بڈھے شخص کو دیا۔ جاؤ کرمو چاچا یہ دوائیں لے آؤ۔

کرمو کے جانے کے بعد الٰہی بخ کی طرف مڑیں تو الٰہی بخش ہے تمہارا نام؟

جی بی بی صاحبہ

رہتے کہاں ہو؟

اعظم بستی میں

یہ کہاں ہے؟ انہوں نے پوچھا پھر بے نیازی سے کہا' خیر۔۔۔۔۔ ہو گی

کہیں۔ یہ بتاؤ ماں باپ کے ساتھ رہتے ہو؟

جی نہیں وہ سب تو ایبٹ آباد میں ہیں۔ میں یہاں اکیلا رہتا ہوں۔

یہ اور بھی اچھا ہے کیونکہ تمہیں کل تک تو یہاں رہنا ہوگا ماں باپ ہوتے تو

ور پریشانی ہوتی۔

الہی بخش کو ان کا لہجہ اور انداز اچھا نہیں لگا لیکن اسے اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

تم کرتے کیا ہو؟ اس بار سوال سادی نے کیا تھا۔

رنگ و روغن کا کام کرتا ہوں۔ اس نے سادی کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ یہیں قریب ہی فٹ پاتھ پر بیٹھتا ہوں ---------- کیپٹے بیرٹی کے سامنے۔

سادی کی آنکھیں ایک پل کو چمکیں۔ ہاؤ ویری رومینٹک۔ اس نے ستائش آمیز لہجے میں کہا۔

ٹھیک کہتی ہیں آپ زندگی ہے ہی بہت رومانوی چیز۔ الہی بخش نے سادگی سے کہا۔

سادی کی آنکھیں پھیل گئیں پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔

جی نہیں میٹرک کے بعد تعلیم چھوڑ کر زندگی کی رومانویت کو جینے کے لئے نکل کھڑا ہوا تھا۔

بیگم صاحب کی پیشانی کی شکنیں اور گہری ہو گئیں۔ اب چلو بھی سادی انہوں نے ترش لہجے میں کہا۔

ہر ایک سے باتیں کرنے کھڑی ہو جاتی ہو۔

سادی بیگم صاحب کے ساتھ چل دی۔ دروازے پر پہنچنے کے بعد اس نے پلٹ کر الہی بخش کو دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں معذرت تھی۔ بیگم صاحب اس وقت تک باہر نکل چکی تھی

۔سنو الٰہی بخش کرمو چاچا تمہارا خیال رکھے گا لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ گرمی محسوس ہو تو
فوراً کرمو چاچا کو بتا دینا۔ یہ بہت ضروری ہے۔

وہ دونوں چلی گئیں۔ الٰہی بخش نے آنکھیں موند لیں۔ ساوی واپس آگئی۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟ اس نے خودکلامی کی۔

عشق کی تربیت دی جا رہی ہے تمہیں اس کے اندر سے کسی نے کہا۔

یہ کیسا عشق ہے کہ میں کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا؟

عشق میں کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

س نے پھر آنکھیں موند لیں۔ ساوی پھر آگئی۔ اس نے اس کی پیشانی
پر ہاتھ رکھ دیا۔ نہ جانے کیسے ---------- لیکن زندگی میں پہلی بار وہ دن میں
ہی سو گیا۔

☆----------☆-------------☆

اس بار آنکھ کھلی تو کرمو چاچا اس کے پاس بیٹھے تھے۔ ان سے بات ہوئی تو اسے اندازہ
ہوا کہ وہ درحقیقت توقعات کا اسیر ایک ایسا شخص ہے، جسے کوئی انجانی قوت کسی خاص
سمت میں لئے جا رہی ہے۔

یہ بات کھلنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ بڈھا کرم دین بھی ایبٹ آباد کا رہنے
والا ہے۔ تو ایبٹ آباد میں کہاں رہتا ہے بیٹے۔

بانڈہ ہنگ میں چاچا اور تم؟

میں شیخ بانڈہ کا ہوں۔ کرم دین کا لہجہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ باپ کا تیرے کیا نام ہے؟

پیر بخش۔

پتا چلا کہ کرم دین اس کے باپ کو بہت اچھی طرح جانتا ہے۔برسوں------

برسوں پہلے دونوں ایک ہی سکول میں پڑھتے تھے۔دیر تک کرم دین پیر بخش کے

بارے میں معلوم کرتا اور اپنے اور اس کے لڑکپن کی باتیں کرتا رہا۔پھر اس نے بڑی

شفقت سے کہا تو تو ویسے ہی میرے لئے بیٹے کی طرح ہے۔میری جان بچا کر تو مجھے

بیٹے سے زیادہ عزیز ہو گیا ہے۔

کیسی باتیں کرتے ہو چاچا۔الٰہی بخش نے شرمساری سے کہا۔

اور وہ بچہ جو میرے ساتھ تھا وہ اس گھر کا اکلوتا بیٹا ہے---------بہ

لاڈلا وہی بچہ ہیں ان لوگوں کے سا وہی بی بی اور اظہر بیٹا۔

بچے کو چوٹ تو نہیں آئی؟

خراش بھی نہیں آئی وہ تو اللہ نے تجھے رحمت کا فرشتہ بنا کر بھیج دیا ورنہ

میرے اور اس کے بچے کا سوال ہی نہیں تھا۔کرم دین کہتے کہتے رکا۔پھر بولا۔یہ اظہر

بابا بڑی منتوں مرادوں کا بچہ ہے۔تجھے اندازہ ہی نہیں کہ تو نے ان لوگوں پر کتنا بڑا

احسان کیا ہے----------

احسان کرنے والی تو اللہ کی ذات ہے چاچا۔الٰہی بخش نے تخت لہجے میں

اس کی بات کاٹ دی۔

ٹھیک ہے لیکن عزت تو وسیلے کی بھی ہوتی ہے۔یہ بہت اچھے لوگ ہیں۔کسی کا احسان

کبھی نہیں بھولتے۔

پر بیگم صاحبہ تو ایسے بات کر رہی تھیں جیسے میں کوئی مصیبت یا بوجھ ہوں۔مگر مجھے

-----الٰہی بخش نے بمشکل خود کو روک لیا۔یہ حقیقت تھی کہ اگر اس گھر میں سادگی نہ

ہوتی تو فوراً ہی وہاں سے نکل جاتا۔

بس بیگم صاحب ہی کی ہیں۔کرم دین نے ٹھنڈی سانسیں لے کر کہا۔کبھی کبھی تو لگتا ہے کہ ہم جیسوں کو انسان ہی نہیں سمجھتیں وہ۔پر صاحب بہت اچھے ہیں اور بچے بھی بڑی عزت دیتے ہیں۔بیگم صاحب کو شاید پیسے کا گھمنڈ ہے۔سب نوکروں سے ایسے ہی بات کرتی ہیں۔

پر میں نوکر تو نہیں ہوں ان کا

چھوڑ ان کی بات صاحب آئیں تو دیکھنا اب تو یہ دوا کھا لے

الہی بخش نے پانی کے ساتھ گولی نگل لی تو یہ ہے اس کا بنگلہ---------

وہ بڑبڑایا۔

بنگلا کہاں چچا۔یہ تو میرا کوارٹر ہے ایک حصے میں نوکروں کے لئے کوارٹر بنا دیے ہیں۔بنگلا تو بہت بڑا ہے۔کل دیکھنا۔

الہی بخش نے ادھر ادھر دیکھا۔میں یہاں سوؤں گا تو تم کیا کرو گے؟اس نے پوچھا

چارپائی تو یہاں ایک ہی ہے۔

تو اس کی فکر نہ کر۔

چاچا---------میں گھر ہی نہ چلا جاؤں۔اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔

بے کار کی باتیں نہ کر۔صاحب سے ملے بغیر تو نہیں جا سکتا۔چلا گیا تو صاحب بہ خفا ہو گا مجھ سے۔یہ بات نہ ہوتی تو بیگم صاحب نے ہی چلتا کر دیا ہوتا تجھے۔

الہی بخش یہ سن کر مسکرایا۔تو یہ بات ہے۔

میں نے کہا نا کہ صاحب بہت اچھا آدمی ہے۔

دیر تک وہ گھر کی کراچی کی اور ایبٹ آباد کی باتیں کرتے رہے۔ پھر کرمو کھانا لے آیا دونوں نے ساتھ بیٹھ کر کھایا کھانے کے دوران الٰہی بخش نے پوچھا۔ تم یہاں کیا کرتے ہو چاچا؟

میں مالی ہوں اور باہر سے سودا سلف بھی لاتا ہوں۔ پورے پندرہ سال سے ہوں یہاں ۔ صاحب بہت اعتبار کرتے ہیں مجھ پر۔ مجھے نوکری چھوڑ کر جانے ہی نہیں دیتے۔ وہاں میرے بیٹے اب اپنے پاؤں پر کھڑے ہیں۔ وہ مجھے بلاتے ہیں کہ اب مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ پر صاحب مجھے نہیں چھوڑتے۔ سال دو سال میں کچھ دن بچوں کے ساتھ گزار آتا ہوں۔

کھانے کے بعد الٰہی بخش نے دوا لی اور تھوڑی ہی دیر بعد اسے نیند آ گئی۔

☆------☆------------☆

شیخ مظہر علی رات دس بجے گھر پہنچے۔ شام کو انہوں نے گھر فون کر کے بتا دیا کہ ایک اہم میٹنگ کی وجہ سے وہ آج میں دیر ہو جائے گی۔ کھانے پر ان کا انتظار نہیں کیا جائے۔ وہ پہنچے تو سادی انہیں جاگتی ملی۔ اس نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ پاپا آپ تو جلدی آ گئے۔

کیا بات ہے بیٹی واپس چلا جاؤں؟ تمہیں میرا آنا اچھا نہیں لگا؟۔ شیخ صاحب نے صوفے پر بیٹھ کر پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا۔

آپ جانتے ہیں پاپا کہ یہ بات نہیں۔ سادی ٹھنک کر بولی۔ آپ نے کہا تھا کہ دیر سے گھر آئیں گے۔ ہم نے کھانا کھا لیا۔ اتنی دیر تو ہم انتظار کر سکتے تھے۔ ساتھ ہی کھا لیتے کھانا صرف دس ہی تو بجے ہیں۔

شیخ صاحب مشفقانہ انداز میں مسکرائے۔ مجھے اور دیر بھی ہو سکتی تھی۔ یہ تو اتفاق ہے کہ میں جلدی چلا آیا۔

کھانا لگواؤں آپ کے لئے؟

بھوک نہیں ہے البتہ کافی پلوا دو

سادی اٹھ کر گئی اور ملازمہ جمیلہ کو کافی کے لئے کہہ آئی۔ وہ پھر باپ کے پاس آ بیٹھی۔

تمہاری ممی کہاں ہیں؟ شیخ صاحب نے پوچھا۔

وہ اپنے بیڈ روم میں۔ سر میں درد ہو رہا تھا۔ نیند کی گولیاں لے لی ہیں۔

سر کے درد کا علاج نیند کی دوا لے کر سو جانا تو نہیں۔ شیخ صاحب نے کہا۔ مگر وہ بات کہاں سنتی ہیں۔

سادی کو ان کے لہجے میں بے بسی پر دکھ ہونے لگا۔ اس نے تو بچپن سے ہی ماں باپ کو لڑتے جھگڑتے دیکھا تھا۔ امی کے مزاج میں سرکشی بہت تھی۔ وہ پاپا کی کوئی بات نہیں مانتی تھیں۔ پاپا میں بھی برداشت کا مادہ نہیں تھا۔ شکر تھا کہ مار پیٹ کی نوبت نہیں آتی لیکن ممی اور پاپا میں کئی کئی دن تک بات چیت بند رہتی تھی۔ پھر اظہر کی پیدائش کے بعد پاپا بہت متحمل مزاج ہو گئے اور امی چڑچڑی اور بد دماغ ہو گئیں۔ شاید اس لئے کہ پاپا اب ان سے لڑتے بھی نہیں تھے۔

اور اظہر کہاں ہے؟ شیخ صاحب نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے پوچھا۔ جمیلہ چند لمحے پہلے کافی کی پیالی ان کے سامنے رکھ گئی تھی۔

سادی نے ان کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں گھری ہوئی تھی۔

بیٹی اظہر کہاں ہے؟ شیخ صاحب نے دہرایا۔ انہیں حیرت ہو رہی تھی۔ اظہر ہر حال میں ان کا انتظار کرتا تھا۔ چاہے رات کے بارہ بج جائیں۔

اظہر؟ سادی نے چونک کر سر اٹھایا۔ وہ سو رہا ہے پاپا۔ ڈاکٹر نے سے ٹرینکولائزر دیا تھا۔

اب کے چونکنے کی باری شیخ صاحب کی تھی۔ کیوں بھئی کیا ہوا ہے؟ خیریت تو ہے؟ انہوں نے پر تشویش لہجے میں پوچھا۔

تو کیا امی نے آپ کو نہیں بتایا؟

کیا نہیں بتایا؟ شیخ صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے۔

سادی کو اس بار امی کے رویے پر شدید غصہ آیا۔ اس کا خیال تھا کہ امی نے فون پر پاپا کو حادثے کے متعلق بتا دیا ہوگا اسے تو حیرت ہوئی تھی کہ پاپا فوراً ہی دوڑے کیوں نہیں آئے۔ پھر اس نے سوچا۔۔۔۔۔۔۔ شاید اس لیے کہ اظہر کو خراش بھی نہیں آئی ہے۔

پاپا۔۔۔۔ اظہر آج ایک جان لیوا حادثے میں بال بال بچا ہے۔"

شیخ صاحب اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ وہ سیڑھیوں کی طرف لپکے لیکن سادی نے انہیں پکار لیا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں پاپا۔ اسے خراش بھی نہیں آئی ہے۔ اس وقت وہ بے خبر سو رہا ہوگا۔ صبح دیکھ لیجئے گا اسے۔

تم سچ کہہ رہی ہو۔ شیخ صاحب کے لہجے میں التجا تھی۔

ہاں پاپا آپ آرام سے بیٹھ کر کھانا کھائیں۔ اظہر کو معمولی سی چوٹ بھی آئی ہوتی تو میں ایسے سکون سے بیٹھنے دیتی آپ کو؟ سادی کے لہجے میں شکایت تھی۔ بات درست تھی شیخ صاحب نے خجالت سے بیٹی کو دیکھا وہ اپنی جگہ واپس آ بیٹھے۔ ہوا کیا تھا؟ انہوں نے

پوچھ کافی کی پیالی کو وہ بھول ہی گئے تھے۔

تفصیل تو مجھے نہیں معلوم پاپا کرسو چاچا بتا سکتے ہیں۔ مجھے اتنا معلوم ہے کہ یک اجنبی انہیں بچاتے ہوئے زخمی ہوگیا تھا۔ اس کو بھی معمولی چوٹیں آئیں۔

ے بھی تمہاری ممی نے کچھ احسان کر کے نکال دیا ہوگا؟ شیخ صاحب کے لہجے میں تلخی تھی۔

، وہ تو بھی تھا ان کا سیلن میں نے انہیں روک دیا۔ وہ کرسو چاچا کے کوارٹر میں ہے۔

تم بہت پیاری بیٹی ہو میری۔ شیخ صاحب نے اٹھتے ہوئے کہا میں ذرا سے دیکھ آؤں۔

پاپا میں جمیدکو بھیک کو انہیں یہیں بلوا لیتی ہوں.......

نہیں سادی بیٹی مجھے خود جانا چاہیے۔ یہ کہہ کر شیخ صاحب باہر چلے گئے۔ سادی پھر اپنی سوچوں میں گم ہوگئی۔ ممی اور پاپا کتنے مختلف ہیں ایک دوسرے سے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ دو فرد جنہیں یک دوسرے کے ساتھ زندگی گزاری ہوتی ہے وہ خوفناک حد تک یک دوسرے کے برعکس کیوں ہوتے ہیں۔ اب تو اسے شادی سے خوف آتا تھا۔ سے یقین تھا کہ اس کے ساتھ بھی یہی ہوگا۔

دھر ہلکی سی دستک پر کرم دین نے دروازہ کھولا تو شیخ صاحب کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

صاحب جی آپ؟ مجھے بلوا لیا ہوتا۔

میں اس سے ملنے آیا ہوں۔ شیخ صاحب نے کہا وہ اندر داخل ہوگئے۔ انہوں نے سوئے ہوئے الہی بخش کو غور سے دیکھا۔ وہ بہت خوش رو جوان تھا۔ چہرہ ناک نقشہ کشادہ پیشانی اور پیشانی پر بہت گہرے زخم کا نشان انہیں حیرت ہوئی کہ وہ نشان بدنما

نہیں لگ رہا تھا۔ بلکہ لگتا تھا کہ وہ اس کے وجود کا ایک اہم حصہ ہے۔ ارے -------- یہ تو سو رہا ہے۔ انہوں نے دھیمی آواز میں کہا۔

جی صاحب جی

تم ذرا میرے ساتھ آؤ کرمو

کرم دین دروازہ بھیڑ کر ان کے پیچھے نکل آیا۔ وہ اسے باغیچے میں لے گئے وہاں گارڈن چیئرز پڑی تھیں وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ مجبور کرمو نیچے گھاس پر بیٹھ گیا۔

ب مجھے سب کچھ بتاؤ۔

کرم دین نے بتایا کہ کس طرح وہ اظہر بابا کے ساتھ سڑک پار کر رہا تھا کہ وہ گاڑی موڑ سے اس طرف آئی۔ آواز سے اندازہ ہو گیا تھا کہ گاڑی کی رفتار خطرناک ہے۔

گاڑی مڑتے ہوئے آپ کے گھر والی سائیڈ پر تھی صاحب جی رفتار بہت تیز تھی ور فاصلہ کم۔ ہم اس وقت سڑک کے بیچ میں تھے۔ اظہر بابا ڈر کر پلٹے کہ دوسری طرف واپس چلے جائیں میں بھی ان کے ساتھ پلٹا۔ اتنی دیر میں گاڑی نے رخ بدل لیا دوسری سائیڈ پر صاحب جی ہم دونوں ڈر کے مارے کھڑے کے کھڑے رہ گئے ہل بھی نہیں سکے ور گاڑی تیزی سے ہماری طرف آ رہی تھی۔ کھڑے رہنے میں تو پھر بھی شاید بچت ہو جاتی مگر اظہر بابا آگے کی طرف جانے والے تھے اور میں انہیں روک بھی نہیں سکتا تھا۔ بس صاحب جی ایسے میں یہ الٰہی بخش فرشتہ بن کر آیا۔ اس نے جھپٹ کر ہم دونوں کو دھکا دیا۔ ہم گر گئے۔ یہ گاڑی کی لپیٹ میں آیا وہ تو شکر ہے کہ ڈرائیور نے عین وقت پر گاڑی کو دوسری طرف گھما دیا۔ ورنہ یہ کچلا جاتا صاحب جی۔ پھر بھی یہ بے ہوش ہو گیا تھا میں نوکروں سے تھوڑ کر اسے کوارٹر میں لے آیا۔ ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا۔ وہ بولا ہے

معمولی چوٹیں ہیں کل تک ٹھیک ہو جائیں گی۔

شیخ مظہر علی کے جسم میں واضح طور پر تھرتھراہٹ نظر آئی اور وہ گاڑی؟

وہ نہیں رکی صاحب میرا خیال ہے بریک فیل ہو گئے تھے اس کے۔

شیخ صاحب تصور میں کرم دین کا بیان کیا ہوا پورا منظر دیکھ رہے تھے۔ واقعی اللہ نے بڑا کرم کیا۔ اس لڑکے کے لئے کچھ کرنا چاہیے۔ ان کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

صاحب جی بعد میں پتا چلا کہ یہ اپنے ایبٹ آباد کا ہی ہے اس کے باپ کو میں جانتا ہوں برسوں سے۔

ہم شیخ صاحب نے پر خیال لہجے میں کہا تو پھر کیا ہونا چاہیے۔

صاحب جی آپ ایک ڈرائیور رکھنے کو کہہ رہے تھے۔ کرم دین نے یاد دلایا۔

شیخ صاحب نے سعدیہ سے اس کے لئے کار خریدنے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ کم از کم فی الحال نہیں چاہتے تھے کہ سعدیہ ڈرائیو کرے۔ اس لئے ڈرائیور کی ضرورت تھی۔ ڈرائیور رکھے بغیر وہ کار نہیں خریدنا چاہتے تھے اور یہ ان کی فطرت تھی کہ اعتبار بہت دیکھ پرکھ کر کرتے تھے اور جب کرتے تو اندھا اعتبار کرتے تھے۔

تمہارا مطلب ہے کہ یہ لڑکا ڈرائیونگ جانتا ہے؟

ہزارے میں تو بچپن میں ہی ڈرائیونگ آ جاتی ہے صاحب کرم دین نے فخریہ لہجے میں کہا۔

شیخ صاحب چند لمحے سوچتے رہے۔ نہیں ابھی یہ مناسب نہیں۔ انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا یہ بتاؤ کہ یہ کام کیا کرتا ہے؟

رنگ و روغن کا بہت اچھا کاریگر ہے صاحب۔

ورنہ تم سے ڈرائیورہٹانا چاہتے ہو؟شیخ صاحب کے لہجے میں ملامت تھی۔اگر وہ ٹھیک ہوگیا ہوتو کل شام اسے میرے پاس لے آنا میں جلدی گھر آ ؤں گا دیکھیں گےشیخ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔اب تم آرام کرو۔

☆-------------☆---------------☆

اگلی صبح ناشتے کی میز پر شیخ صاحب تنھے اظہر سے ملے۔انہوں نے اظہر سے بھی حادثے کی تفصیل سنی۔پپی پاپا گاڑی ہم پر چڑھنے والی تھی کہ انہوں نے ہمیں دھکا دے دیا۔اظہر نے جو نقشہ کھنچا وہ اور خوفناک تھا۔
شیخ صاحب نے ملامت بھری نظروں سے بیوی کو دیکھا۔اور آپ نے فون پر مجھے یہ بتانا ضروری بھی نہیں سمجھا۔
"کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔رخسانہ بیگم نے بے پروائی سے کہا۔
جب تک کوئی مر نہ جائے آپ کے خیال میں حادثہ سنگین نہیں ہوتا۔شیخ صاحب نے سرد لہجے میں کہا۔یہ تو بڑی خطرناک بات ہے----------اللہ کو ناراض کرنے والی۔
رے یہ لوگ بڑھا چڑھا کر سنا رہے ہیں۔
چلیے ٹھیک ہے۔شیخ صاحب نے کہا۔پھر چند لمحے کے توقف کے بعد بولے میں بہت دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ اس گھر کو رنگ و روغن کی ضرورت ہے۔
صاف کیوں نہیں کہتے کہ اب فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے اس رنگ ساز کا احسان چکا ئیں

لگے۔ رخسانہ بیگم نے ترش سے کہا۔

تو احسان ماننا کوئی بری بات ہے؟

احسان کیسا۔ ٹھیک ٹھاک ہے وہ۔ ماتھے پر ذرا سی خراش آئی ہے بس۔

پھر وہی بات وہ مر جاتا یا اپاہج ہو جاتا تب آپ اس کا احسان مانتیں۔ شیخ صاحب نے گہری سانس لے کر کہا یہ بھی سن لیجئے کہ یہ کوئی احسان کا صلہ نہیں ہوگا۔ وہ کام کرے گا اور محنت لے گا۔ احسان تو عمر بھر نہیں اتارا جا سکتا۔ یہ سب چھوٹے پن کی باتیں ہیں۔

کرتے رہیں جو جی میں آئے مجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔ میرے خیال میں چھوٹے لوگوں کو ذرا سی بات پر سر پر بٹھا لینا چھوٹا پن ہے جسے آپ بڑائی سمجھتے ہیں۔

رخسانہ بیگم نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا اور ناشتے کی میز سے اٹھ گئیں۔

شیخ صاحب نے بات کو بڑھانا مناسب نہیں سمجھا۔ جانتے تھے کہ اس سے تلخی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

☆----------☆--------☆

ناشتے کے بعد کرم دین ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر نے اچھی طرح معائنہ کر کے کہا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ دن میں تین بار مرہم لگایا جائے۔ پیشانی کا زخم دو تین دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔

چاچا اب میں چلتا ہوں۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد الٰہی بخش نے کہا۔

نا بیٹے صاحب جی سے ملے بغیر تو نہیں جا سکتا۔

وہ یک مہینے نہ ملیں تو کیا میں یہیں پڑا رہوں گا؟

وہ تو کل رات ہی تجھ سے ملنے آئے تھے۔تو سو رہا تھا۔ تجھے دیکھا اور چلے گئے۔

الٰہی بخش کے دل میں ان دیکھے شیخ صاحب کے لئے قدر و منزلت کا جذبہ پیدا ہوا۔ اچھا

---------تو مجھے جگا لیا ہوتا۔

انہوں نے جگانے نہیں دیا۔ آج شام وہ تجھ سے ملیں گے۔

ٹھیک ہے چاچا۔ پر ابھی مجھے باہر جانا ہے۔ الٰہی بخش نے کہا۔ ایک گھنٹے میں واپس آجاؤں گا۔

کرم دین نے بے اعتباری سے اسے دیکھا۔ دیکھ تو ملے بغیر چلا گیا تو میری بڑی بے عزتی ہوگی۔

ارے چاچا تم میرے لئے ابا جیسے ہو میں تمہاری بے عزتی کرا سکتا ہوں الٰہی بخش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ جن لوگوں کے ساتھ میں رہتا ہوں کل سے میرے لئے پریشان ہو رہے ہوں گے۔ انہیں جا کر بتا تو آؤں کہ میری فکر نہ کریں۔ میں خیریت سے ہوں۔"

تو چلا جا۔ پر دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھانا ہے۔ کرم دین نے کہا۔

الٰہی بخش کو نہیں معلوم تھا کہ اس کے ساتھ رہنے والے کہاں کہاں کام کرتے ہیں۔ اس نے سوچا جا کر نثار کو بتا دے گا۔ کرامت اس کے پاس آتا رہتا ہے۔ نثار سے بتا دے گا۔ وہ فٹ پاتھ پر پہنچا تو پتا چلا کہ اس کے متعلق باتیں ہو رہی ہیں۔ سب پریشان تھے کرامت بھی آیا ہوا تھا۔ اب اسے خیال آیا کہ وہ تو گزشتہ روز دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے نکلا تھا اور اس کے بعد واپس ہی نہیں گیا تھا۔ وہ لوگ تو کل سے اس کے لئے پریشان تھے۔ اسے ڈھونڈتے بھی پھرے تھے۔ پھر نثار نے اس کے بدلے ورپینٹ

کے خالی ڈبے سامنے پان والے کی دکان پر رکھ دیئے تھے۔ وہ سب الہی بخش کو گھیر کر بیٹھ گئے۔ الہی بخش نے انہیں سب ماجرا سنایا۔ کرامت مطمئن ہو کر چلا گیا۔

بات تو جب ہے کہ تجھے اس بنگلے میں نوکری مل جائے۔ نثار نے کہا

کیسی باتیں کرتے ہو نثار بھائی۔ الہی بخش بولا۔ میں یہ فٹ پاتھ نہیں چھوڑنا چاہتا۔

بے وقوف نہیں تو۔ بے یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ پکار کی بات اور ہے یک تاریخ کو لگی بندھی رقم ہاتھ میں۔ یہاں کیا ہے ایک دن کام مل گیا تو چار دن چھٹی ور یک دن فاقہ۔

نہیں نثار بھائی یہ فٹ پاتھ کی زندگی بڑی رومینٹک ہے۔ الہی بخش نے کھوئے لہجے میں کہا۔ کسی کو یہ زندگی بڑی رومینٹک لگتی ہے۔

نثار کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ تو کتابیں بہت زیادہ پڑھنے لگا ہے۔ اس نے الہی بخش پر آنکھیں نکالیں۔

وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر الہی بخش بنگلے کی طرف چل دیا۔ وہاں کرم دین باغیچے میں کیاریاں ٹھیک کر رہا تھا۔ اس نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ بتا دیا اپنے ساتھیوں کو؟

ہاں چاچا

دیکھ مجھے لگتا ہے کہ اب تو اس گھر سے نہیں جائے گا

کیا بات کرتے ہو چاچا

میرا اندازہ تو یہی ہے بیٹے

اتنے میں ساوی گیٹ سے اندر آئی۔ وہ کالج سے واپس آئی تھی۔ اور کالج کی سفید یونیفارم میں بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ انہیں بیٹھا دیکھ کر وہ ان کی طرف چلی آئی۔ کیسے

ہوا۔الہی بخش اس نے پوچھا۔تکلیف بڑھی تو نہیں؟

الہی بخش کو حسوس ہوا کہ وہ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے اس نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔میں بالکل ٹھیک ہوں بی بی ابھی باہر بھی گیا تھا۔

بہت اچھی بات ہے مجھے تمہاری بڑی فکر تھی۔سادی نے سادگی سے کہا پھر بولی میرا نام سعدیہ ہے۔سب سادی کہتے ہیں مجھے۔

مجھے معلوم ہے بی بی الہی بخش نے کہا۔اسے اپنا دل ڈھول کی طرح بجتا محسوس ہو رہا تھا۔جس کی آواز سب کو سنائی دے رہی ہو۔کیسی بات تھی یہ۔وہ کہہ رہی تھی کہ اسے اس کی فکر ہے۔وہ دعوت دے رہی تھی کہ وہ سعدیہ یا سادی کہہ کر اسے پکارے۔۔۔۔۔کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں اس نے خود کو ٹوکا۔

تو پھر سیدھی پکارا کرو مجھے

الہی بخش کہنا چاہتا تھا کہ وہ تو ایک ایسا پنچھی ہے جو سفر کے دوران تھک کر پل دو پل کے لئے اس شاخ پر بیٹھ گیا ہے اور اب اسے اڑ جانا ہے۔یہاں یہ مسئلہ کب ہے کہ اسے پکارا جائے لیکن اس نے کہا کچھ نہیں۔

سادی کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ صدر دروازے سے اسے امی نے آواز دے لی۔

سعدیہ۔۔۔۔۔۔۔۔کالج سے آ گئی ہو تم؟

جی امی ابھی آئی ہوں۔سادی نے کہا اور الہی بخش سے مزید کچھ کہے بغیر اس طرف چلی گئی۔

سادی بی بی بہت اچھی ہیں۔کرم دین نے کہا۔

الہی بخش نے اس پر بھی کچھ نہیں کہا۔وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کرم دین کے اس جملے کو ہزار

گنا بہتر بنانے والے لفظ بھی وضع کیے گئے ہیں۔؟ کیا یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ سادی بی بی کتنی اچھی ہیں؟

☆---------☆---------☆

اس روز شیخ صاحب ساڑھے پانچ بجے گھر آ گئے۔ باتھ روم سے ہو کے لباس تبدیل کر کے اور چائے پینے کے بعد تازہ دم ہو کر انہوں نے کرمو کو بلوایا۔ کرمو اس الٰہی بخش کو میرے پاس لے آؤ۔ انہوں نے کہا۔ ہاں ۔۔۔۔۔۔ تم اسے یہاں چھوڑ کر چلے جانا۔

جی بہتر صاحب جی۔

شیخ صاحب اس وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ تھوڑی دیر بعد کرمو الٰہی بخش کو وہاں لے آیا۔ شیخ صاحب نے اٹھ کر بڑے تپاک سے الٰہی بخش سے مصافحہ کیا۔ آؤ بیٹھو یہاں میرے پاس۔ انہوں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

کرم دین نے پوچھا میں جاؤں صاحب؟

ہاں تم جاؤ۔ شیخ صاحب نے کہا اور پھر الٰہی بخش کی طرف متوجہ ہوئے۔ تم بیٹھے کیوں نہیں ابھی تک۔

الٰہی بخش نے جھجکتے ہوئے کہا میں یہیں ٹھیک ہوں صاحب۔ وہ کمرے کی آرائش سے مرعوب ہو گیا تھا۔ ایسی آرائش تو اس فلیٹ کی بھی نہیں تھی جہاں وہ اس دن مزدوروں کی ٹولی کے ساتھ گیا تھا جبکہ وہ بھی مرعوب کر دینے والی تھی۔

نہیں بھئی بیٹھ جاؤ آرام سے۔ شیخ صاحب نے زور دے کر کہا۔ دیکھو زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ مگر اللہ کسی کے وسیلے سے احسان کرتا ہے تو اس وسیلے کا احترام

بھی ضروری ہے اصل میں وہ احترام بھی قدر ہی کے لئے ہے تم بیٹھ جاؤ مجھے تم سے مل کر خوشی ہو رہی ہے۔ اللہ نے تمہارے ذریعے میرے بیٹے کو از سر نو نئی زندگی دی۔ جواب میں میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ تمہیں تھوڑی دیر عزت تو دے سکتا ہوں۔ انہوں نے تھوڑی دیر پر خاص طور پر زور دیا۔

الٰہی بخش کی جھجک دور ہو گئی۔ اسے شیخ صاحب اچھے لگے وہ مختلف انداز میں بات کر رہے تھے۔ انہوں نے رسماً بھی اس کے احسان پر زور دے کر اسے شرمندہ نہیں کیا تھا۔ وہ ان کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ بیٹھ گیا کیا دھنس گیا کیونکہ جتنی تیزی سے وہ دھنسا تھا وہ ڈر گیا لیکن پھر اسے آرام کا احساس ہونے لگا۔

یہ بتاؤ کیا پیو گے؟ شربت یا چائے؟ شیخ صاحب نے پوچھا

کچھ۔۔۔۔۔۔۔کچھ بھی نہیں صاحب جی الٰہی بخش نے گڑبڑا کر کہا۔

دیکھو الٰہی بخش تم بات سمجھ نہیں رہے ہو۔ شیخ صاحب نے ناصحانہ انداز میں کہا تم اس وقت میرے مہمان کی حیثیت سے یہاں بیٹھے ہو اور مہمان میزبان سے برتر ہوتا ہے۔ تم جہاں کے ہو وہاں تو مہمان نوازی ہمارے ہاں سے بڑھ کر کی جاتی ہے اور یہ اللہ کا حکم بھی ہے۔ یہ ذہن میں رکھو کہ تم میرے مہمان ہو ملازم نہیں۔

اس بار انہوں نے ملازم پر بطور خاص زور دیا۔ اب بول کیا پیو گے؟

چائے پی لوں گا صاحب جی۔

شیخ صاحب نے جمیلہ کو آواز دے کر چائے لانے کو کہا۔ پھر الٰہی بخش سے بولے یہ صاحب جی کیا ہوتا ہے میرا نام شیخ مظہر علی ہے۔ صاحب تو بس میرے گھر کے ملازم ہی کہتے ہیں مجھے۔

الٰہی بخش کے کانوں میں سادی کی آواز گونجی ۔۔۔۔۔۔۔میرا نام سعدیہ ہے۔ سب لوگ سادی کہتے ہیں مجھے۔

جمیلہ چائے لے آئی۔ الٰہی بخش جلد از جلد پیالی خالی کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ اب تم کیسے ہو؟ شیخ صاحب نے پوچھا۔

جی؟ سادی کے تصور میں الجھے ہوئے الٰہی بخش کی سمجھ میں پہلے تو بات ہی نہیں آئی پھر اس نے کہا اب میں بالکل ٹھیک ہوں اور اب میں جانا چاہتا ہوں۔

میں تو چاہتا تھا کہ تم ہمیں چند روز میزبانی کا موقع دو لیکن زبردستی کچھ چیز نہیں ہوتی۔ ہو سکتا ہے تمہارے کام کا حرج ہو رہا ہو۔ ٹھیک ہے، تم آج ہی چلے جانا لیکن پہلے کچھ دیر اپنے بارے میں باتیں کرو مجھ سے۔"

الٰہی بخش یک لخت پرسکون ہو گیا۔ شیخ صاحب عجیب آدمی تھے۔ رسمی باتوں کا سرسری تذکرہ کرتے تھے۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر بندھے ہونے کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ شیخ صاحب اس سے اس کے بارے میں پوچھتے رہے۔ اس کے ماں باپ، گھربار، تعلیم، کام ۔۔۔۔۔۔۔انہوں نے بھی کچھ پوچھ ڈالا۔

تھوڑی دیر بعد الٰہی بخش نے کہا۔ سر ۔۔۔۔۔۔۔اب مجھے اجازت دیجئے۔"

ہاں ۔۔۔۔۔۔۔ٹھیک ہے۔ شیخ صاحب نے اٹھ کر اس سے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ دیکھو میاں اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے تو تمہیں فرشتہ رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ لیکن میں ہر وقت احسان کی رٹ لگانے کا قائل نہیں۔ ہاں ایک بات پوری سچائی سے کہہ رہا ہوں۔ اس گھر کو ہمیشہ اپنا ہی گھر سمجھنا۔ جب ملنے کو جی چاہے چلے آنا۔ کبھی کسی وقت ۔۔۔۔کل یا اس سے بیس سال بعد، میں تمہارے کسی کام آسکوں تو اپنا بزرگ سمجھ کر بے

تکلف میرے پاس چلے آنا۔ میں انشاءاللہ تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔

الٰہی بخش کو پناول پگھلتا محسوس ہوا۔ اتنا کچھ کبھی بھی دیا۔ انہیں عزت دینا اور عزت کرنا آتا ہے۔ شکریہ سر میں یاد رکھوں گا۔

الٰہی بخش دروازے پر پہنچا تھا کہ شیخ صاحب کی آواز پر اس کے قدم ٹھٹک گئے۔

اس نے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ جی سر؟

یہاں آؤ پانچ منٹ اور بیٹھو۔

الٰہی بخش جا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔

بھئی معاف کرنا۔ میں نے تمہاری بات توجہ سے نہیں سنی تھی۔ تم پینٹر ہو؟

الٰہی بخش نے اثبات میں سر ہلایا۔ جی سر۔

جو کچھ میں نے تم سے کہا وہ اپنی جگہ۔ میں اپنی بات مکمل بھی کر چکا ہوں۔ مجھے اچانک خیال آیا ہے کہ ایک کاروباری بات تم سے کر لی جائے۔

کاروباری بات؟ اور مجھ سے؟ الٰہی بخش نے حیرت سے سوچا۔

میں چھ مہینے سے سوچ رہا ہوں کہ پورے گھر کو دوبارہ پینٹ کرانا ہے۔ شیخ صاحب کہہ رہے تھے اب تم نعمت کی طرح آ گئے ہو تو کیوں نہ تم سے کچھ فائدہ ہی اٹھا لوں۔

الٰہی بخش شیخ صاحب کی فہم و فراست کا قائل ہو گیا۔ اصولاً اسے جواب میں کہنا چاہیے تھا کہ جو کچھ میں نے کیا وہ خدا کی مرضی کے تحت سرزد ہوا۔ انہیں احسان سمجھ کر اس کا صلہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن اس کے سامنے وہ شخص بیٹھا تھا جس نے ابتدا میں ہی کہہ دیا تھا کہ احسان اللہ کا ہے۔ البتہ وسیلے کی حیثیت سے اس کا احترام کیا جا رہا ہے۔ اور اب وہ کہہ رہا تھا کہ وہ پینٹر ہے تو وہ اس سے فائدہ ہی کیوں نہ اٹھا لے

پیے شخص سے یہ بات کیسے کی جا سکتی ہے ------؟

ذرا اس ڈرائنگ روم کی دیواریں دیکھو اور انصاف سے کہو کہ یہ موجودہ پینٹ کیا اس کے شایان شان ہے۔ رنگ و روغن ہونے کے بعد یہ کیسا لگے گا؟ شیخ صاحب نے جیسے اس کے خیالات پڑھ لئے۔ ایک بار پھر انہوں نے اپنی فہم فراست کا ثبوت دیا تھا۔ الہی بخش نے ڈرائنگ روم کی دیواروں کا جائزہ لیا۔ شیخ صاحب کی شرط تھی کہ جواب انصاف سے دینا ہے۔ وہ ٹال نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے انصاف سے کہا ۔ آپ درست فرماتے ہیں سر دیواروں کو واقعی تازہ پینٹ کی ضرورت ہے۔

تو چلو میں تمہیں پورا گھر دکھا دوں"

الہی بخش نے گھر دیکھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس نے سارا گھر ابھی دیکھ لیا۔ گھر کی سادگی اور خوبصورتی نے اسے بہت متاثر کیا۔ اس نے بڑی چاہت سے گھر کا چپہ چپہ دیکھا جیسے وہ زیارت کے قابل کوئی متبرک مقام ہو۔

شیخ صاحب سے پھر نیچے لے آئے۔ اب اپنی اجرت بتاؤ۔ وہ بولے الہی بخش ہچکچایا تو انہوں نے کہا ۔ دیکھو یہ کاروباری بات ہے ہمارے تعلقات سے الگ۔ انہوں نے تعلقات پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اس میں نہ شرماؤ نہ میں تمہیں اجرت زیادہ دوں گا نہ کم ۔ جو حق ہے وہ لو گے۔

آپ کام ٹھیکے پر دیں گے یا دیہاڑی پر کرائیں گے۔ الہی بخش رنگساز الہی بخش بن گیا۔

دیہاڑی پر شیخ صاحب نے بلا جھجک کہا

دیہاڑی پچیس روپے ہوگی میٹریل آپ کا

شیخ صاحب نے کچھ نوٹ نکال کر اسے دیئے۔ یہ ہزار روپے ہیں۔ پینٹ وغیرہ اور دوسری

چیزیں تمہیں لاؤ گے۔ آخر حساب دے دینا اور ضرورت پڑے تو بیگم صاحب سے لے لینا۔

کلر آپ پسند کرلیں سر۔ میں کارڈ لا کر دکھاتا ہوں آپ کو

اس کی ضرورت نہیں ہے مجھے رنگوں کی تمیز نہیں۔ تم خود رنگ پسند کر لینا۔ میں اسے رنگ کرنے والے کی ذمہ داری سمجھتا ہوں۔ پچھلی بار بھی میں نے یہ کام پینٹر کے سپرد کیا تھا لیکن اس نے مجھے مایوس کیا۔ امید ہے تم مجھے خوش کر دو گے۔

ذمے داری بہت بڑی ہے سر لیکن مجھے یقین ہے کہ میں آپ کو خوش کر دوں گا الٰہی بخش نے اعتماد سے کہا۔

بس جاؤ اور کل سے کام شروع کر دو۔

الٰہی بخش جانے لگا تو شیخ صاحب نے آواز دی۔ سنو اگر کوئی حرج نہ سمجھو تو مجھے اپنی پیشانی کے اس زخم کے بارے میں بتاؤ۔

الٰہی بخش سوچ میں پڑ گیا۔ کیا بتائے اس زخم کے بارے میں۔ اسے تم عقیدت کہیں نشان عشق۔ آپ کا کام پورا کرنے کے بعد بتاؤں گا سر۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ بشرطیکہ آپ اس وقت بھی جاننا چاہیں۔

ٹھیک ہے الٰہی بخش میں انتظار کرلوں گا۔

☆---------☆---------☆

بارہ دن بعد پورا بنگلہ یوں جگمگا رہا تھا جیسے ابھی تعمیر ہوا ہو۔ الٰہی بخش نے اپنے رنگوں کے انتخاب سے ثابت کر دیا تھا کہ رنگ ساز بھی فنکار ہوتے ہیں۔ شیخ صاحب بہت خوش تھے۔ الٰہی بخش ان کی آزمائش پر پورا اترا تھا۔ اس نے ان کے اندر کے کی تائید

کر دی تھی۔

شیخ صاحب میں انسان کو ایک نظر میں پہچان لینے کی قدرتی صلاحیت تھی لیکن انہوں نے اس پہلی نظر کے فیصلے پر کبھی اعتبار نہیں کیا تھا۔ اعتبار وہ آزمائش کے بغیر کبھی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ الٰہی بخش آزمائش سے گزرنے کے درمیان ہی قابلِ اعتبار بہت ہو گیا تھا۔

بظاہر شیخ صاحب نے کرم دین کی تجویز مسترد کر دی تھی کہ الٰہی بخش کو ڈرائیور رکھ لیا جائے لیکن درحقیقت انہوں نے اسے الٰہی بخش کی آزمائش شروع کر دی تھی۔

بنگلے کا رنگ و روغن کا ٹھیکہ ہی اس کی آزمائش تھا۔

الٰہی بخش کام شروع کر چکا تھا۔ ایک دن شیخ صاحب نے اپنے ایک دوست سے جو قریب ہی رہتے تھے۔ اس سلسلے میں بات کی۔ یار وکیل صاحب یہاں اچھے رنگ و روغن کرنے والے ہی نہیں ملتے انہوں نے کہا۔

یہ وہی وکیل صاحب تھے جن کے ہاں الٰہی بخش دوبارہ کام کر چکا تھا۔

بات تو سچ ہے شیخ صاحب لیکن مجھے قسمت سے بہت اچھا کاریگر مل گیا تھا۔ وہ کیبنٹ برئی کے سامنے نٹ پاتھ پر بیٹھتا ہے۔ الٰہی بخش ہے نام اس کا۔

شیخ صاحب نے اپنے تاثرات کو چھپانے کی بھرپور کوشش کی۔ بڑی قسمت سے اچھے کاریگر مل جائے تو وہ ایسے کمال کھینچ لیتا ہے۔ دیہاڑی پر کام کرو تو کام لمبا کر دیتے ہیں۔ ٹھیکے پر دو تو حساب میں گھپلا کر دیتے ہیں۔

الٰہی بخش کا یہی تو کمال ہے۔ وکیل صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ایسا ایماندار آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ٹھیکے پر کام کرنے والا مزدور جتنا کام ڈیڑھ دن میں کرتا ہے

الہی بخش یک دن کی دیہاڑی میں کر دیتا ہے۔

یقین نہیں آتا۔

میں خود دوبارہ اس سے کام کرا چکا ہوں۔

اس کے بعد شیخ صاحب نے خود مشاہدہ کیا۔ الہی بخش صبح نو بجے کام شروع کرتا تھا۔ چھ بجے کام روک دیتا تھا یہ معمول کے مطابق تھا لیکن اس کے کام کی رفتار بہت تیز تھی اور اس کے کام میں غیر معمولی۔۔۔۔۔۔۔ بلکہ فنکارانہ صفائی تھی۔

بارہویں دن وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ الہی بخش شیخ صاحب کو حساب دے رہا تھا۔ پینٹ کے ڈبے کی یہ قیمت تو نہیں۔ شیخ صاحب نے اعتراض کیا۔

الہی بخش کے چہرے کی رنگ متغیر ہوگئی۔ اس سے کم قیمت پر مجھے تو نہیں مل سکتا سر۔

شیخ صاحب عتماد سے مسکرائے انہوں نے اپنا ہوم ورک بہت اچھی طرح کیا تھا۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں انہوں نے کہا میری معلومات کے مطابق ڈبہ یک سو دس روپے کا ملتا ہے تم نے اٹھ نوے روپے کا کیسے لے لیا؟

ب کے الہی بخش بھی مسکرایا۔ دکان والے مجھے جانتے ہیں میں ہمیشہ وہیں سے لیتا ہوں۔ وہ مجھے کنسیشن دیتے ہیں۔

شیخ صاحب بہت خوش ہوئے عام طور پر کاریگر زیادہ رقم کی رسید ہوتے تھے ور پیسہ بچاتے تھے۔ انہوں نے حساب لگایا تو پتا چلا کہ الہی بخش نے ن کو کم از کم ڈیڑھ سو روپے کی بچت کرائی ہے۔ انہوں نے اس کی اجرت دی۔ سو روپے انعام کے طور پر دیئے۔ پھر بولے۔ دیکھو الہی بخش میں بزنس مین ہوں۔ نقصان کا سودا کبھی نہیں کرتا۔ یہ ندر آدمی کو پنا بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس لئے کہ اس میں بھی میرا ہی فائدہ

ہے۔میری بات غور سے سنو میں چاہتا ہوں کہ تم میرے لئے کام کرو۔

الہی بخش ہنسنے لگا۔رنگ وروغن کا کام کرنے والے کو ملازم رکھ کر آپ کو کیا فائدہ ہوگا

سر؟

میں تمہیں اس حیثیت میں ملازمت کی پیش کش تو نہیں کر رہا ہوں تمہیں ڈرائیونگ آتی

ہے؟

جی سر-------

تو بس میں تمہیں ڈرائیور رکھنا چاہتا ہوں۔شیخ صاحب نے کہا۔سعدیہ کے نئے گاڑی

انہوں نے دودن پہلے خریدی تھی۔

مجھ پر تو یہ احسان ہوگا سر

مگر فائدہ زیادہ مجھے ہوگا خیر------میں تمہیں نو سو روپے تنخواہ دوں گا۔رہنے

کے لئے کوارٹر کھانا گھر سے ہی ملے گا۔تم صرف سعدیہ کا گاڑی ڈرائیو کرو گے بولو

منظور ہے۔

الہی بخش کیا بولتا۔وہ تو گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔وہ ساری کی گاڑی وہ اسے ہر جگہ لے جایا

کرے گا۔اتنی قربت---------اتنا بڑا اعزاز یہ تو اس کے خواب وخیال

میں بھی نہیں تھا یہ قسمت میرے ساتھ کیا کھیل کھیل رہی ہے کہاں پہنچا دیا ہے مجھے؟ اور

کہاں تک لے جایا جائے گا؟ مگر پھر اسے خیال آیا کہ وہ ناشکر پن کر رہا ہے یہ تو

اس کی توقع سے بہت زیادہ مل رہا ہے------

اس کی خاموشی سے شیخ صاحب نے یہ نتیجہ نکالا کہ اسے تنخواہ پر اعتراض ہے۔

دیکھو میاں پچیس روپے روز کے حساب سے تمہیں مہینہ بھر بھی کام ملے تو ساڑھے

سات سو روپے ملیں گے۔ میں تمہیں نو سو دے سکتا ہوں اس سے زیادہ نہیں دے سکتا۔

آپ غلط سمجھ رہے ہیں سر۔ یہ تنخواہ تو میری سوچ سے بھی زیادہ ہے۔

بس تو ٹھیک ہے۔ کل مجھے زرقی دے دو اور کام شروع کر دو۔

تھینک یو سر۔

جاؤ کرمو تمہیں تمہارا کوارٹر دکھا دے گا۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔

الٰہی بخش اٹھنے لگا تو شیخ صاحب نے کہا۔ ذرا ٹھہرو۔ تمہیں یاد ہے تم نے مجھ سے ایک

وعدہ کیا تھا؟

سر مجھے یاد نہیں۔

میں یاد دلاتا ہوں۔ وہ وعدہ تمہارے پیشانی کے زخم کے متعلق تھا۔

----------وہ----------

الٰہی بخش ہچکچایا،

بتانا نہیں چاہتے تو زور نہیں دوں گا۔

نہیں سر ایسی کوئی بات نہیں۔ میں ایسا وعدہ کبھی نہیں کرتا جو پورا نہ کر سکوں مگر آپ کا

وقت ضائع ہوگا۔

تم سناؤ۔

یہ بیماری کا صلہ ہے یا عشق کا حاصل آپ خود ہی سن کر فیصلہ کر لیجئے گا۔

الٰہی بخش نے کہا اور کچھ سوچنے لگا۔ اس کی آنکھیں کہیں دور دیکھتی محسوس ہو رہی تھیں۔

وہ برسوں پیچھے چلا گیا تھا۔ اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

☆----------☆----------☆

ان دنوں الٰہی بخش فوجیوں کی بیرکس میں رنگ و روغن کا کام کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کئی کاریگر تھے۔ وہ سبھی اس سے شاکی تھے۔ جبکہ فوجی خوش رہتے تھے۔ ان کے نزدیک وہ ایک مثالی مزدور تھا۔ اس متضاد رویے کی وجہ مشترک تھی۔
الٰہی بخش کم سخن اور کم آمیز تھا۔ کام کے وقت میں وہ صرف کام کرتا تھا۔ یہ نہیں کہ کبھی چائے پینے میں لگ گیا یا کبھی سگریٹ سلگائی' وہ دوسرے مزدوروں کی طرح گپ شپ میں بھی نہیں لگتا تھا۔ پھر اس کے کام کی رفتار بھی اپنے ساتھیوں سے زیادہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ دوسروں سے گنا کام کرتا تھا اس بنا پر فوجی عزت کرتے تھے۔ وہ دوسرے مزدوروں کو لعن طعن کرتے تھے کہ وہ الٰہی بخش کی طرح کام کیوں نہیں کرتے۔ کئی بار مزدوروں کو تنبیہ کی جا چکی تھی کہ انہوں نے اپنی کارکردگی نہیں بڑھائی تو انہیں نکال دیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس پر ساتھی کاریگر اس سے خفا تھے۔
ایک دن کھانے کے وقفے میں ساتھیوں نے اسے گھیر لیا۔ او بھائی الٰہی بخش تو اتنا کام کیوں کرتا ہے؟ ایک نے کہا۔
یہ سوال ہی الٰہی بخش کی سمجھ سے باہر تھا۔ اس نے کہا۔ تو کیا کام نہ کیا کروں؟
کام کریں ہماری طرح۔ ہم بھی تو کام کرتے ہیں
بھائی تمہاری میری رفتار میں فرق ہے بس اتنی سی بات ہے۔
تیرے لئے اتنی سی بات ہے ایک اور کاریگر بولا لیکن اس کی وجہ سے ہم پر تو مصیبت آئی رہتی ہے۔
تو میں کیا کروں؟ الٰہی بخش نے بے بسی سے کہا
اپنی رفتار کو ہمارے برابر لے آ۔ تیسرے نے مشورہ دیا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ الٰہی بخش نے حیرت سے پوچھا۔

دیر تک یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ پہلے نے جھنجھلا کر کہا۔ تھوڑی دیر میں گپ شپ کر لیا کرو۔

پیسے مجھے گپ شپ کرنے کے نہیں کام کرنے کے ملتے ہیں!۔

ہمیں بھی معلوم ہے پر اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔

تمہیں نہیں پڑتا ہوگا۔ الٰہی بخش نے درشت لہجے میں کہا۔ حلال کی کھانا چاہتا ہوں۔

تو کیا ہم حرام کی کھاتے ہیں؟ ایک کاریگر آپے سے باہر ہونے لگا۔

یہ مجھے نہیں معلوم نہ مجھے اس کی فکر ہے۔ الٰہی بخش نے باپ کا سمجھایا دہرایا۔ میں صرف اپنی فکر کرتا ہوں۔

دیکھ بھائی مان جا۔ ایک اور کاریگر نے بڑے تحمل سے کہا۔ تیری وجہ سے ہم ذلیل ہوتے ہیں۔ ہماری روزی کھوٹی بھی ہو سکتی ہے۔

کیا میں تمہاری وجہ سے اپنی عاقبت خراب کروں؟ الٰہی بخش نے کرخت لہجے میں کہا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔

سب کاریگر بنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ دیکھ الٰہی بخش دریا میں رہ کر مگرمچھ سے دشمنی نہیں چلتی۔ ایک جوشیلے مزدور نے تنبیہ کی۔

بات سنو میں انچارج صاحب کو سمجھا دوں گا کہ میری اور تمہاری رفتار میں فرق ہے۔ اسے مسئلہ نہ بنائیں۔ ورنہ میں کام ہی چھوڑ دوں گا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ مجھے میرے باپ نے ہمیشہ رزق حلال کمانے کی تاکید کی ہے۔

اس پر سبھی کاریگر بوکھلا گئے۔ جانتے تھے کہ انچارج سمجھ جائے گا کہ وہ لوگ الٰہی بخش کو

تنگ کر رہے ہیں اور وہ الٰہی بخش کو کام بھی نہیں چھوڑنے دے گا۔ چاہے باقی سب کی چھٹی کرا دے۔ نہیں بھئی الٰہی بخش تجھے بات کرنے کی ضرورت نہیں پہلے نے کہا۔

اچھا ہوتا کہ تو ہماری بات مان لیتا۔ ایک اور بولا

چلو میں کام چھوڑ دیتا ہوں۔ الٰہی بخش نے بے بسی سے کہا۔ اللہ رزق دینے والا ہے۔

یہ غلطی بھی نہیں کرنا۔ تیسرا بولا وہ بھی جانتے تھے کہ انچارج کو پتا چل جائے گا کہ ان لوگوں نے الٰہی بخش پر دباؤ ڈالا ہے۔ پھر ان کا روزگار بھی جائے گا اور وہ بلیک لسٹ بھی ہو جائیں گے۔ ٹھیک ہے یار جو جی چاہے کرو ہم کچھ نہیں کہتے۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ تین چار دن بعد انچارج نے ایک کاریگر کی چھٹی کر دی۔ اسے شکایت تھی کہ وہ پورا کام نہیں کر رہا ہے۔ تم سب لوگ سدھر جاؤ۔ اس نے دیگر کاریگروں سے کہا۔ دیکھو الٰہی بخش بھی تو کام کرتا ہے۔

سر جی آپ مجھے بیچ میں نہ لائیں۔ الٰہی بخش نے انچارج سے بڑی عاجزی سے کہا۔ مجھے اللہ نے زیادہ رفتار دی ہے تو اس میں ان لوگوں کا قصور نہیں۔ یہ اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرتے ہیں اور میں اپنی صلاحیت کے مطابق کام کرتا ہوں۔

بات اللہ کی دی ہوئی رفتار کی نہیں انچارج نے کرخت لہجے میں کہا یہ حرام خور ہیں جان بوجھ کر کم کام کرتے ہیں۔

سر جی پھر میں کام چھوڑ دیتا ہوں۔

کام چھوڑ کر تو دیکھ۔ گھر سے اٹھوا لوں گا تجھے۔

اگلے روز کاریگر بہت پریشان تھے۔ ان کا ایک ساتھی نکالا جا چکا تھا اور اب کسی کی باری بھی آ سکتی تھی۔ وہ تیز ہاتھ چلانے کی کوشش کر رہے تھے مگر مسئلہ یہ تھا کہ انہیں اس کی

عادت نہیں تھی انہوں نے الٰہی بخش سے بات کرنا چھوڑ دیا۔ ان کے خیال میں وہ بد
رنگ تھا۔

ان میں ایک سید کاریگر بھی تھا۔ اس کا نام سلیمان شاہ تھا۔ وہ بھی کم آمیز تھا۔ کسی سے
زیادہ بات نہیں کرتا تھا۔ اس روز سب کھانے کے لیے نکلے تو انہوں نے سلیمان شاہ کو
پکڑ لیا۔ دیکھو شاہ جی یہ الٰہی بخش کیا کر رہا ہے ہمارے ساتھ۔ لال خان نے بات
شروع کی۔

کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟ سلیمان شاہ نے پوچھا۔

کل اصغر کی چھٹی کرا دی اس نے۔

اچھا مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔ سلیمان شاہ گزشتہ روز کام پر نہیں آیا تھا۔ ہوا کیا؟

وہی شکایت شاہ جی کہ ہم لوگ کام چوری کرتے ہیں۔

تو اس سے الٰہی بخش کا کیا تعلق؟

سب اسی کی وجہ سے ہوا ہے۔ لال خان نے کہا۔ اس وقت وہی سب کی نمائندگی کر رہا
تھا۔ وہی تو ایمان داری کا چرچا کرتا رہتا ہے۔ باقی سب تو حرام خور ہیں۔

سلیمان شاہ نے کچھ نہ کہا۔ اور یہ سچ تھا۔ سلیمان شاہ بھی اکل حلال کا قائل تھا۔

گستاخی معاف شاہ جی، شکور بولا۔ الٰہی بخش کے سامنے تو ہم بھی حرام خور ہیں۔

ہم ایک دیوار کرتے ہیں۔ آپ ڈیڑھ کرتے ہو اور الٰہی بخش دو دیواریں نمٹا دیتا ہے۔

تو کیا ہوا میں حرام خوری تو نہیں کرتا۔ الٰہی بخش کا ہاتھ تیز چلتا ہے اس سے وہ زیادہ کام
کر لیتا ہے۔

ہاتھ تیز نہیں چلتا شاہ جی وہ ہمیں ذلیل کرنے کے لیے تیز ہاتھ چلاتا ہے۔ لال خان

بولا۔ ہمارا تو کچھ نہیں پر شاہ جی آپ تو عزت والے لوگ ہیں۔ الٰہی بخش کو سمجھا دینا۔ الٰہی بخش تو صاف کہتا ہے کہ اس کے سوا سب بے ایمان اور حرام خور ہیں۔ شکور نے آگ لگانے کی کوشش کی۔

سلیمان شاہ آگ بگولا ہو گیا۔ کس کی مجال ہے کہ میرے بارے میں ایسی بات کہے۔

زبان سے کہنا ضروری تو نہیں ہوتا یار۔ محمد نے کہا۔ الٰہی بخش اپنے عمل سے یہی کہہ رہا ہے۔

اور کسی دن نمبردار صاحب بھی کہہ دیں گے۔ لال خان بولا۔

چپ بس کرو۔ کچھ کھانا کھانے دو۔ سلیمان شاہ غرایا لیکن اس سے کھانا نہیں کھایا گیا۔ بے ایمانی اور حرام خوری کا طعنہ اس کے لیے بہت بڑا تھا۔

الٰہی بخش کو ان سب باتوں کا کچھ علم نہیں تھا۔ وہ شام کام سے فارغ ہو کر بازار چلا گیا۔ بازار میں بھی زیادہ دیر نہیں لگی۔ امید تھی کہ مغرب سے پہلے وہ گھر پہنچ جائے گا۔ چھکی دھوپ میں ماڑی کے کچے راستے پر تیز قدم بڑھاتا چل رہا تھا کہ دائیں جانب کے کھیتوں کی طرف سے اچانک ہی سلیمان شاہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر گھمبیرتا تھی اور ہاتھ میں کلہاڑی۔

الٰہی بخش نے چونک کر اسے دیکھا اور جھک کر سلام کیا۔ سلیمان شاہ کی وہ بہت عزت کرتا تھا۔ اس لیے کہ سلیمان شاہ خود بھی بہت محنتی اور ایماندار آدمی تھا۔ اس میں غرور بھی نہیں تھا۔ جس سے سادات عام طور پر مالا مال ہوتے ہیں۔ سلام علیکم الٰہی بخش نے کہا۔

سلیمان شاہ نے روکھے لہجے میں سلام کا جواب دیا۔ پھر بولا۔ الٰہی بخش تجھ سے ضروری

بات کرنی تھی۔ اس لئے یہاں تیرے انتظار میں کھڑا ہوں۔

مجھے کھر سے بلوایا ہے شاہ جی۔ الٰہی بخش بولا خیر۔۔۔۔۔۔۔۔حکم کریں کیا بات ہے۔

پہلے تو ایک بات پوچھنی ہے تجھ سے بتا تیرے خیال میں میں بے ایمان اور حرام خور ہوں کام چوری کرتا ہوں؟

توبہ توبہ۔ الٰہی بخش نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ آپ کی ایمان داری تو مثالی ہے۔

سلیمان شاہ کچھ نرم پڑ گیا۔ تو چاہتا ہے کہ دوسرے مجھے بے ایمان اور حرام خور سمجھیں؟

کسی بات کرتے ہیں شاہ صاحب میں بہت گنہگار ہوں لیکن ایسے گناہ کرنے والا آدمی نہیں۔

تو پھر تو مجھ سے زیادہ کام کیوں کرتا ہے؟ سلیمان شاہ نے کڑے لہجے میں کہا۔

دیکھیں شاہ جی مقررہ وقت میں آپ بھی ایمانداری سے کام کرتے ہیں اور میں بھی۔ کام کی مقدار سے اس کا کیا تعلق؟

الٰہی بخش تو بس میری بات سمجھنے کی کوشش کر۔

شاہ جی آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ الٰہی بخش نے بے حد رسان سے کہا۔ دیکھیں دوسرے لوگ آپ سے بھی کم کام کرتے ہیں۔ اگر وہ آپ سے مطالبہ کریں کہ انہیں بے ایمانی کے الزام سے بچانے کے لئے آپ اپنی استعداد سے کم کام کریں تو آپ کیا کریں گے؟

کسی کی مجال ہے کہ مجھ سے یہ بات کرے۔ سلیمان شاہ کو جلال آ گیا۔

بات مجال کی نہیں ہے۔ آپ صرف فرض کریں۔

دیکھ الہی بخش میں تجھے حکم دے رہا ہوں کہ اب تو مجھ سے زیادہ کام نہیں کرے گا۔

سرکار یہ حکم مانوں گا تو میں بے ایمان نہیں ہو جاؤں گا۔ میرے حلال رزق میں حرام نہیں مل جائے گا۔ سرکار اللہ کا حکم تو سب سے بڑا ہے۔

میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ سلیمان شاہ نے گرج کر کہا۔ تجھے میری بات ماننا ہو گی۔ ورنہ اس نے کلہاڑی بلند کر لی۔

دیکھیں شاہ جی آپ اپنی ذمے داری کا بھی خیال کریں۔ الہی بخش نے عاجزی سے کہا میں تو آپ کے سامنے اپنے بچاؤ کے لیے بھی ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ اس سے کہ میرے باپ نے مجھے یہی سکھایا ہے۔ تو میرا بچاؤ بھی آپ ہی کی ذمہ داری ہے اور آپ آل رسول ﷺ ہیں آپ مجھے بے ایمانی اور حرام خوری کے لیے کیسے کہہ سکتے ہیں؟

لیکن مشتعل سلیمان اب کچھ سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میں تیرا لیکچر نہیں سنوں گا الہی بخش اس نے کہا۔ مجھے ہاں یا نہ میں جواب دے۔

مجھے موت کا خوف نہیں ہے شاہ جی۔ اب الہی بخش کا لہجہ بھی سخت ہو گیا۔ اللہ جانتا ہے کہ میں آپ کو زبردستی سے روکنے کی طاقت بھی رکھتا ہوں لیکن بزرگوں کی روایت اور لحاظ کا تقاضہ ہے کہ میں کچھ نہ کروں۔

جواب دے ہاں یا نہ

جواب آپ کو معلوم ہے میں آپ کی یہ بات نہیں مانوں گا۔

سلیمان شاہ کا کلہاڑی والا ہاتھ نیچے آ رہا تھا الہی بخش نے سر اٹھا کر اسے دیکھا ایک لمحے کو اس کے جی میں آئی کہ ہاتھ بڑھا کر کلہاڑی کو پکڑ لے ـــــــــــ وہ ایسا کر بھی سکتا تھا مگر اس کے اندر ایسی کوئی تحریک نہیں تھی۔ وہ سر جھکانے لگا یہی بہتر تھی کہ

کلبلا رہی اس کے چہرے پر نہیں البتہ اس کی پیشانی میں اتر گئی۔

سلیمان شاہ نے فوارے کی شکل میں ابلتے خون کو دیکھا تو اس کا حوصلہ جواب دے گیا غصہ سرد ہو گیا۔ اب اسے صرف یہ خیال تھا کہ وہ بہت خطرناک حرکت کر بیٹھا ہے اور نہ جانے اس کا انجام کیا ہو گا۔

الٰہی بخش چکراتا ہوا نیچے بیٹھتا گیا۔ اس کا ایک ہاتھ سختی سے اپنی پیشانی پر جما تھا۔ جیسے خون روکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مگر خون کہاں رکتا ہے۔ گاڑھا گاڑھا خون اس کی بھنچی ہوئی انگلیوں کے درمیان سے بھی رس رہا تھا۔ سلیمان شاہ نے جو خون کا فوارا چھوٹتے دیکھا تو اس کے اوسان جواب دے گئے۔ اسے احساس ہوا کہ وہ تو بہت ہی سنگین حرکت کر بیٹھا ہے۔ اضطراری طور پر وہ پلٹا اور بھاگ کھڑا ہوا۔

جانے وہ چند لمحے تھے کہ کئی گھنٹے۔ بہر حال الٰہی بخش وہیں پڑا رہا۔ پھر سے قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ ارے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ تو بہت زخمی ہے کسی نے کہا۔ الٰہی بخش کو وہ آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔ کسی نے اسے سہارا دے کر بٹھا دیا۔ خون رکنا تو مشکل ہے۔ اسی آواز نے کہا۔ چادر کس کر باندھ دیتا ہوں۔ آگے اللہ کی مرضی۔ اس کے سر پر چادر کس کر باندھ دی گئی۔ بخشے۔۔۔۔۔۔۔۔ تو چل سکتا ہے؟ اس دوسری آواز نے پوچھا۔

الٰہی بخش اثبات میں سر ہلا رہا تھا کہ پہلی آواز نے دوسری کو ڈانٹ دیا۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔ اسے اٹھا کر لے جانا پڑے گا۔

انہوں نے الٰہی بخش کو اٹھایا۔ اسی دوران الٰہی بخش کے ہوش وحواس اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ اسے کس طرح لے کر گئے۔ ہوش آیا تو وہ ہسپتال میں تھا

یہ پولیس کیس ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔ پہلے تھانے لے کر جاؤ۔ رپورٹ درج کرو۔ پھر پٹی ہوگی۔

چاہے اس دوران یہ مر جائے۔ پہلی آواز نے تلخ لہجے میں کہا۔

ہاں چاہے یہ مر جائے۔ قانون تو قانون ہے۔

عجیب قانون ہے۔ سزا مارنے والے کو ملنی چاہیے۔ یہاں سزا اسے مل رہی ہے جس کے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ آپ کے اس قانون سے ظالم کا کیا بگڑے گا۔ ہاں مظلوم بچ بھی سکتا ہو تو بھی مر جائے گا۔

قانون میں نے نہیں بنایا۔ ڈاکٹر نے نرم لہجے میں کہا۔ میں اس کے خلاف کروں گا تو مصیبت میں پھنسوں گا۔

ورمر گیا تو آپ کے ضمیر پر بوجھ نہیں ہوگا؟

ڈاکٹر سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے الٰہی بخش کی پیشانی پر بندھا ہوا صافہ کھول کر زخم کا معائنہ کیا اور نرم پڑ گیا۔ خون پہلے ہی بہت ضائع ہو چکا تھا۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ٹھیک ہے۔ میں مریض کی پٹی کرتا ہوں۔ تم ایک کام کرو۔ تھانہ یہاں قریب ہی ہے۔ ایس ایچ او شاہ صاحب میرے دوست ہیں۔ ان سے جا کر کہو کہ میں نے انہیں بلایا ہے۔ میرا نام ڈاکٹر جمیل ہے۔ فاضل تھانے چلا گیا۔ ڈاکٹر الٰہی بخش کے لیے مصروف ہو گیا۔

☆--------------☆--------------☆

چند گھنٹے بعد الٰہی بخش تھانے میں ایس ایچ او اسرار شاہ کے سامنے بیٹھا تھا۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ اسے ہسپتال میں داخل ہونے کی ضرورت نہیں۔ زخم گہرا ضرور ہے لیکن

خطرناک ہرگز نہیں۔ اس نے بتایا تھا کہ زخم مہلک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ دماغ پر بھی اثر پڑ سکتا تھا۔ بینائی' سماعت یا قوت شامہ بھی ختم ہو سکتی تھی لیکن ایسا ہوا نہیں۔ البتہ زخم کے معاملے میں احتیاط کرنا ہوگی اور پٹی باقاعدگی سے کرانا ہوگی۔

اب کیسا محسوس کر رہے ہو؟ ایس ایچ او نے مشفقانہ لہجے میں الٰہی بخش سے پوچھا۔

ٹھیک ہوں شاہ جی بس ذرا کمزوری ہے۔ چکر آتے ہیں' الٰہی بخش نے جواب دیا۔

ابھی تمہاری دوائیں آ جائیں گی۔ یہ بتاؤ بات کر سکتے ہو مجھ سے؟

جی شاہ صاحب

احمر شاہ نے پیڈ سامنے کھسکایا اور پنسل سنبھال لی۔ تمہیں کس نے مارا ہے؟

سلیمان شاہ نے

احمر شاہ چونکا۔ سلیمان شاہ اس کا دور کا رشتے دار ہوتا تھا۔ سوال کر کے اس نے اس بات کی تصدیق بھی کر لی۔ ہوا کیا تھا؟

الٰہی بخش نے پوری تفصیل بتا دی۔

احمر شاہ نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ تمہیں انصاف ملے گا۔ بے فکر رہو۔ پھر اس نے آواز لگائی' بہرام خان۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تین کانسٹیبل ادھر بھیج دو۔

چند لمحے بعد تین کانسٹیبل اس کے سامنے کھڑے تھے۔ فوراً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تم تینوں جاؤ اور سلیمان شاہ کو پکڑ لاؤ۔ ہتھکڑی لگا کر لانا ہے اسے۔ رعایت کوئی نہیں کرنی۔ یہ کہہ کر وہ ان تینوں کو سمجھانے لگا۔ الٰہی بخش بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ اسے انصاف مل سکے گا۔ سادات کی ویسے ہی اتنی عزت ہے کہ کوئی ان پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔ پھر یہاں تو منصف خود بھی سادات ہی میں سے تھا۔ ایسے میں

انصاف کی امید وہ کیا کرتا۔

تینوں کانسٹیبل چلے گئے۔ تم یہاں بیٹھ سکتے ہو؟ ابرار شاہ نے پوچھا۔ طبیعت زیادہ خراب ہو تو گھر چلے جاؤ۔

میرا رکنا ضروری ہے شاہ جی سرکار؟

ضروری تو نہیں لیکن رک جاؤ میں تمہیں انصاف کا تماشہ دکھاؤں گا۔

میں رکوں گا شاہ جی۔ الٰہی بخش نے زخمی لہجے میں کہا۔ اس کا دل بہت دکھ ہوتا۔ اس نے سیماب شاہ کو کتنی معقولیت سے بات سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن سیماب شاہ کو نام ونسب کا گھمنڈ نے اندھا کر دیا تھا۔ اس نے یہ تک خیال نہیں کیا کہ اس کا حکم اللہ کے حکم سے متصادم ہے اور اللہ کے حکم سے بڑھ کر کوئی حکم نہیں۔ الٰہی بخش جانتا تھا کہ اس کی کوئی غلطی نہیں۔ رتی برابر بھی نہیں۔ تالی ایک ہاتھ سے بجی ہے۔ سیماب شاہ نے زیادتی کی ہے اور اسے سر اس کے سامنے ملنی چاہیے۔۔۔۔۔۔۔۔

اسی لمحے اس کا باپ پیر بخش بڑبڑایا ہوا ابرار شاہ کے کمرے میں داخل ہوا۔ کیا ہوا میرے بیٹے۔ وہ الٰہی بخش کی طرف لپکا۔ یہ کیسے ہو گیا۔ مجھے فاضل نے بتایا ہے کر۔

الٰہی بخش پتھر کا بت بنا اسے دیکھتا رہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

زخم گہرا ہے لیکن خطرناک نہیں۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہارا بیٹا بچ گیا۔ ابرار شاہ نے کہا۔

پیر بخش نے چونک کر اسے دیکھا، اسے سلام کیا' معاف کرنا مائی باپ' اس پریشانی میں آپ کا خیال ہی نہیں رہا۔ وہ پھر الٰہی بخش کی طرف مڑا کس نے مارا ہے تجھے۔ مجھے بتا میں اس کا خون پی جاؤں گا۔

نہیں پی سکو گے بابا۔ الٰہی بخش نے سرد لہجے میں کہا۔ سلیمان شاہ نے میرے سر پر

کلہ زی دری ہے۔

پیر بخش کے چہرے پر زلز لے کا تاثر ابھرا۔یہ۔۔۔۔۔۔۔۔یہ کیسے ہوسکتا ہے۔بیٹے

تجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔

ایسا ہی ہوا ہے بابا مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔مارنے سے پہلے وہ دیر تک مجھ سے باتیں

کرتا رہا تھا۔

بیٹے۔۔۔۔۔۔اندھیرے میں تو ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا ہوگا۔پیر بخش نے ڈوبتے لہجے

میں کہا۔

بابا۔۔۔۔۔۔اندھیرا نہیں تھا اور میں نے کہا نا کہ پہلے اس نے مجھ سے باتیں کی

تھیں۔

پیر بخش کا چہرہ ایسا پیلا ہوگیا جیسے کسی نے اس کے جسم کا پورا خون نچوڑ لیا ہو۔

جاؤ بابا اب اس کا خون پی جاؤ۔اس نے بلاوجہ مجھے مارا ہے۔الہٰی بخش نے کہا۔

پیر بخش نے جیسے سنا ہی نہیں۔وہ مراد شاہ کی طرف مڑا۔سائیں بابا پرچا تو نہیں کاٹا

ہے آپ نے؟

ابھی تو نہیں کاٹا ہے۔کاٹنے والا تھا کہ تم آگئے۔

اللہ کا شکر ہے۔پیر بخش نے دل کی گہرائیوں سے کہا۔صاحب جی یہ پرچا نہیں کاٹئے۔

کاٹنا تو اس میں شاہ جی کا نام درج نہ کیا۔

یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

حمزہ ورنہ معصوم دکھ دیتا

نہیں حمزہ ورنہ معصوم نہیں۔الہٰی بخش نے احتجاج کیا۔میں سیمان شاہ کو جانتا ہوں۔

تو چپ رہ۔ پیر بخش نے اسے ڈپٹا پھر وہ ابرارشاد کی طرف مڑا۔ صاحب جی خدا کے لئے پرچا نہ کاٹنا۔ اس نے التجا کی۔

پرچا تو کٹے گا بڑے میاں ابرارشاد نے کہا۔ یہ سنگین معاملہ ہے۔

پیر بخش تیزی سے اٹھا اور اپنی پگڑی ایس ایچ او کے قدموں میں ڈال دی۔ صاحب جی میری عزت کا خیال کریں۔

ابرارشاد کے چہرے پر حیرت تھی۔ آپ مجرم کو بچانے کی بات کرتے ہیں جبکہ جرم آپ کے سگے بیٹے کے خلاف ہوا ہے؟

کوئی جرم نہیں ہوا صاحب جی۔ یہ تو گھر کی بات ہے۔ آقا اور غلام کا معاملہ ہے۔ آقا غلام کو مارے تو یہ جرم نہیں ہوتا۔ پیر بخش نے کہا اور پھر گڑگڑانے لگا۔ صاحب جی میری عاقبت بچا لو صاحب جی حضور ﷺ کی اولاد کے خلاف مدعی بنوں گا تو قیامت کے دن ان کے پاؤں پکڑ کر شفاعت کے لئے کیسے کہوں گا صاحب جی کیا منہ لے کر جاؤں گا صاحب جی۔

ابرارشاد سناٹے میں آ گیا۔ پیر بخش کے لہجے میں ایسی شدت تھی کہ وہ دہل کر رہ گیا تھا۔ الٰہی بخش جو خاموشی سے یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ اب چپ نہ رہ سکا۔ ابا .... میں مر بھی سکتا تھا۔ جا کر ڈاکٹر سے پوچھ لو۔

سیں تو مر تو نہیں بیٹے اللہ نے تجھے اسی لئے بچایا کہ تجھے اٹھنے والا ہاتھ نبی پاک ﷺ کی اولاد کا تھا۔

نہیں ہو نبی ﷺ کی اولاد پر کسی انسان کا خون معاف نہیں ہے۔

پیر بخش دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار پیٹنے لگا۔ کم قسمت بک۔ اپنے قد سے بڑی بات

چھپی نہیں ہوتی ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ اور وہ بھی اتنی بڑی بات۔

چھوٹے میاں اگر تمہارا بیٹا مر جاتا تو تم کیا کرتے؟ ابرارشاہ نے پوچھا میں تب بھی

کہتا کہ پرچا نہ کٹے۔ میں بیٹے کا خون معاف کر دیتا۔

لیکن پرچا تو کٹے گا بڑے میاں

میں نے پگڑی آپ کے قدموں میں ڈال دی ہے صاحب جی

مگر تمہارا بیٹا پرچا کٹوانا چاہتا ہے اور میں بھی مجرم کو رعایت دینے کے حق میں نہیں

ہوں۔

میں اس کا باپ ہوں صاحب جی۔ پیر بخش نے افسردگی سے کہا۔ اس کی بات میری بات

سے بڑی تو نہیں۔

اس کی بات زیادہ بڑی ہے بڑے میاں۔ ایس ایچ او نے سرد لہجے میں کہا یہ مدعی ہے'

تم نہیں فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہے۔

پیر بخش بے بسی کے احساس سے نڈھال ہو کر رو گیا۔ خدا کے لئے صاحب جی۔

دیکھو بڑے میاں میں بھی سید ہوں۔ ابرارشاہ نے کہا اور یہ ملازمت میرے لئے پل

صراط ہے۔ میں کسی کو رعایت دینے کا قائل نہیں۔ پھر یہ تو قانون کا معاملہ ہے۔ مدعی

جو چاہے' رپورٹ درج کرا سکتا ہے۔

پیر بخش الہی بخش کی طرف مڑا۔ دیکھ بیٹے میں تیرا باپ ہوں لیکن اس معاملے میں

تیرے پاؤں بھی پڑ سکتا ہوں۔

یہ بے کار ضد نہ کرو۔ اسے سزا ملنی ہی چاہیے۔ الہی بخش بولا۔

اب کیا یہ بات تو نے کے لئے اپنی پگ تیرے قدموں میں ڈالنی پڑے گی۔ پیر بخش

نے دل گرفتگی سے کہا۔ کاش تو مر جاتا تب مدتی میں ہی ہوتا۔ کاش ایسا ہی ہوا ہوتا۔
الہی بخش کے جسم میں واضح طور پر تھرتھری دوڑ گئی ٹھیک ہے لا۔ میں اس کے نام کا پرچا
نہیں کٹوتا۔

پیر بخش اس کی طرف بڑھا۔ میں تیرا شکر گزار ہوں بیٹے ------ اس نے بیٹے
کے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہا لیکن بیٹے نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ تو مجھ سے خفا ہے بیٹے
اس بات پر۔ پیر بخش نے افسردگی سے کہا۔ لیکن حشر کے دن تو سرخرو ہوگا بیٹے تب
میری بات تیری سمجھ میں آئے گی۔ مہرارشاد اپنی آنکھوں کی نمی چھپانے کی کوشش کر رہا
تھا۔ ٹھیک ہے بڑے میاں تم جیت گئے۔ اس نے کہا لیکن اس سید زادے کو یک سبق
میں نے دے ہی دیا ہے۔ عزت کا سبق جو صرف بے عزتی سے ملتا ہے۔ ابھی وہ
ہتھکڑیاں لگائے ہوئے یہاں آئے گا اور راستے میں سب اس کا تماشہ دیکھیں گے۔
یہ سن کر پیر بخش کا چہرہ دھواں ہو گیا۔ یہ آپ نے کیا کیا شاہ جی۔ اس نے تڑپ کر کہا ہم
گنا ہگار تو کہیں کے نہیں رہے۔ اس نے ملامت آمیز نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔ سچ
ہے کہ اولاد سب سے بڑی آزمائش ہوتی ہے۔ اولاد آدمی کو جہنم رسید بھی کر دیتی
ہے۔ یہ کہہ کر وہ تیزی سے کمرے سے چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد مہرارشاد نے حیرت سے کہا۔ تمہارا باپ اس دنیا کا آدمی تو نہیں
لگتا۔

ابو کا خیال ہے کہ میں اس کا بیٹا نہیں۔ کسی نے بدل دیا تھا مجھے۔ الہی بخش نے تلخی سے
کہا۔

☆.........☆.............☆

پیر بخش ہانپتا کانپتا پہاڑی کے کچے راستے پر چلا جا رہا تھا۔ اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ کوئی اس کا دل مٹھی میں لے کر بھینچ رہا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر بس یک دعا تھی۔ سلیمان شاہ کی رسوائی سے پہلے وہ اس تک پہنچ جائے۔ اس کا ہتھکڑیوں والا تماشہ نہ شروع ہوا ہو۔

لیکن دعائیں ایسے کہاں قبول ہوتی ہیں۔

اسے دور سے پولیس والوں کے ساتھ سلیمان شاہ آتا دکھائی دیا۔ ایک پولیس والا آگے چل رہا تھا دو اس کے دائیں بائیں تھے۔

پیر بخش کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اسے لگا کہ سامنے کربلا ہے اور وہ بد عہد کوئی ہے۔ جس نے نبی ﷺ کے چہیتے نواسے کو پیاس کے صحرا میں دھکیل دیا ہے۔ اس کے دل میں بس ایک خیال تھا، قیامت کے دن وہ کس منہ سے حضور ﷺ کے حضور پیش ہوگا۔ آپ ﷺ پوچھیں تو کیا جواب دے گا۔۔۔۔۔۔۔

وہ بے تاب ہو کر ایسا دوڑا کہ زندگی میں کبھی نہیں دوڑا تھا۔ وہ ان کے پاس پہنچ کر رکا اور بے تابانہ سلیمان شاہ کے ہتھکڑی لگے ہاتھ چومنے لگا۔ شاہ جی۔۔۔ میرے سرکار۔ آپ کو آپ کے بزرگوں کی قسم ہمیں معاف کر دینا۔

سلیمان شاہ کا بے تاثر چہرہ پتھر کا بنا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اسے جیسے گرد و پیش کا ہوش ہی نہیں تھا۔ توہین اور بے عزتی کے احساس نے اسے شل کر کے رکھ دیا تھا۔

مجھے پتا نہیں تھا شاہ جی ورنہ یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ وہ میرا بدنصیب بیٹا کچھ نہیں جانتا۔ اس نے اپنی عاقبت خراب کی اور میری بھی۔۔۔

چونک سلیمان شاہ جیسے کسی سحر سے آزاد ہو گیا۔ نہیں چاچا پیر بخش۔ غلطی میری تھی۔

ابی بخش کی نہیں۔ میں نے ظلم کیا ہے۔ میری آنکھوں پر پٹی پڑ گئی تھی۔

نہیں شاہ جی پٹی تو میرے بیٹے کی عقل پر پڑی تھی۔

وہ باہٹو یک طرف۔ آگے چلنے والے نوروز خان نے پیر بخش کو ڈپٹ کر کہا ' ہمیں تھانے پہنچنا ہے۔

ہٹتا ہوں۔ آپ ان کی ہتھکڑیاں تو کھول دو۔

دماغ خراب ہوا ہے۔ نوروز خان بگڑ گیا۔ تھانیدار صاحب کا حکم ہے۔ یہ ہتھکڑیاں تو اب وہی کھول سکتے ہیں۔ ہٹ جا بابا۔

کیوں گناہ کرتے ہو حوالدار۔ ان کے ہاتھ کھول دو۔ یہ بھاگنے والے نہیں میں ضمانت دیتا ہوں ان کی۔

لو ضمانت دینے والے کو دو دیکھو ذرا۔ نوروز خان نے حقارت سے کہا۔

میرا حق ہے یہ۔ پیر بخش کا لہجہ بدل گیا۔ جس سے ان کا جھگڑا ہوا ہے وہ میرا ہی بیٹا ہے۔

نوروز خان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ وہ ہتھکڑیاں کھول دیتا لیکن جانتا تھا کہ ابرار شاہ کتنا سخت اور اصول پرست آدمی ہے۔ چنانچہ اس نے نرم لہجے میں کہا۔ بابا جی یہ میرے اختیار سے باہر ہے۔ مجھ کو معافی دو۔

پھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔ چلو ہتھکڑیاں مجھے لگا دو۔ پیر بخش بولا۔

بابا۔ جان چھوڑ دو میری۔ میں مجبور ہوں۔ تھانیدار تو مجھے جان سے مار دے گا۔

شاہ جی کے ہتھکڑیاں لگی رہیں گی تو میں اپنی جان دے دوں گا۔ یہ کہہ کر پیر بخش نے زمین سے سر ٹکرانا شروع کر دیا۔ تینوں کانسٹیبل بوکھلائے ہوئے اسے دیکھتے رہے۔

سلیمان شاہ نے سے سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس پر تو جیسے جنون طاری ہو گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی پیشانی سے خون نکلنے لگا۔ کھول دو یارا! جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ نوروز خان نے اپنے ساتھیوں سے بے بسی سے کہا۔ پھر وہ پیر بخش کی طرف مڑ۔

چل۔۔۔۔۔۔۔اٹھ جا بابا

☆۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔☆۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔☆

راضی نامہ ہو چکا تھا۔ الٰہی بخش اور اس کا باپ جا چکے تھے۔ راضی نامہ مکمل طور پر یکطرفہ تھا۔ ابرار شاہ نے کوشش کی تھی کہ الٰہی بخش کا دوا دارو کا خرچ سلیمان شاہ برداشت کرے اور اس کے علاوہ بھی کچھ نقد رقم دے لیکن پیر بخش نے انکار کر دیا۔ الٰہی بخش یہ کہہ کر الگ ہو گیا کہ اس نے معاملہ باپ پر چھوڑ دیا ہے۔

چچا۔۔۔۔۔۔۔۔اب میں جاؤں؟ سلیمان شاہ نے ابرار شاہ سے پوچھا۔

ذرا بیٹھو! مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔ ابرار شاہ نے کہا۔

جب سے سلیمان شاہ تھانے آیا تھا، مسلسل کھڑا ہوا تھا۔ ابرار شاہ نے سے بیٹھنے نہیں دیا تھا۔ یہی نہیں اس نے ابرار شاہ کو چچا کہہ کر پکارا تھا تو اسے ڈانٹ سننا پڑی تھی۔ ابرار شاہ نے صاف کہہ دیا تھا کہ رشتے داری گھر میں ہوتی ہے تھانے میں نہیں۔ یہاں وہ ایس ایچ او ہے اور وہ ملزم۔

سو اب سلیمان شاہ بیٹھتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ ابرار شاہ نے کہا۔ بیٹھ جاؤ سلیمان اس وقت تم ملزم نہیں ہو۔ میرے چھوٹے ہو۔ مجھے تم کو کچھ سمجھانا ہے۔

سلیمان شاہ بیٹھ گیا۔

تمہیں اندازہ ہے کہ تم کتنی بڑی مصیبت میں پھنس گئے تھے؟

جی چچا میں جانتا ہوں۔

یہ 307 کا کیس تھا اور میں پرچا کاٹ دیتا۔تمہاری جگہ میرا بیٹا ہوتا تو میں اس کے ساتھ بھی رعایت نہ کرتا

جانتا ہوں چچا اور مجھے آپ پر فخر ہے۔میرے دل میں آپ کی عزت اور بڑھ گئی ہے۔

میں تمہیں یہ سمجھانا چاہتا ہوں بیٹے کہ یہ لوگ آل رسول ﷺ ہونے کے ناتے ہمارا جو احترام کرتے ہیں تو یہ ہم پر بھی فرض ہے۔ہمیں خود کو محترم بنانا چاہیے۔وہی صفت پیدا کرنا چاہئیں اور ان عقیدت مندوں کی عزت بھی کرنا چاہیے۔میں جانتا ہوں تم اچھے کردار کے لڑکے ہو۔کوئی برائی نہیں تم میں۔پھر بھی۔۔۔۔۔۔

چچا۔۔۔۔۔۔۔آپ یقین کریں میں ابتدا ہی سے شرمندہ ہوں اور میں چاہتا تھا کہ مجھے پٹنے کی سزا ملے۔

جانتے ہو تم سے یہ غلطی کیوں ہوئی؟

چچا میں بے ایمانوں کے اکسانے میں آ گیا تھا۔

اور اس کا سبب یہ تھا کہ تمہیں اپنے نام ونسب پر غرور ہے۔گھمنڈ ہے اور یہ دنیا کی بد ترین چیز ہے۔اللہ کو سب سے زیادہ ناپسند ہے۔آدمی غرور کس چیز پر کرے جبکہ سبھی کچھ اللہ کا دیا ہوا ہے۔اسی لئے تو سب تعریفیں اس کے لئے ہیں۔اس کی دی ہوئی عزت پر گھمنڈ کرنا چھوڑ دو۔اچھے اور مثالی انسان ہو۔اس لئے کہ یہ عزت کرنے والے عقیدت مند ہم سے یہی توقع کرتے ہیں۔مجھے امید ہے کہ آئندہ تم کبھی اس حیثیت میں یہاں نہیں آؤ گے۔"

چچا انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔

☆--------☆--------☆

یہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ جرگہ کس نے بلایا۔ گاؤں میں سادات کی کثرت تھی۔ سارے بڑے اکٹھے ہوئے۔ مسئلہ وہی تھا۔۔۔۔۔الہٰی بخش کے ساتھ سلیمان شاہ کی زیادتی۔

میں مانتا ہوں کہ سلیمان نے بہت زیادتی کی۔ سلیمان شاہ کے باپ عرفان شاہ نے کہا۔ خود سلیمان بھی بہت شرمندہ ہے۔

سب لوگ سلیمان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ یہ سچ ہے بزرگو مجھے شروع ہی میں احساس ہو گیا تھا میں تو معافی مانگنے والا تھا لیکن چاچا پیر بخش نے روک دیا۔

چلو یہ بڑی اچھی بات ہے کہ تمہیں غلطی کا احساس ہو گیا۔ گاؤں کے سب سے بڑے افسر شاہ نے کہا۔ اور غلطی پر معافی مانگنے پر بڑائی بھی ہے لیکن بیٹا صرف معافی سے کچھ نہیں ہوتا۔ تلافی بھی ضروری ہے۔

میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا دادا۔ سلیمان شاہ نے کہا۔

پیر بخش نے پرچا نہیں کٹنے دیا۔ ورنہ کچہری کے چکر لگتے۔ پیسہ لگ خرچ ہوتا اور ہو سکتا ہے کہ تمہیں سزا بھی ہو جاتی۔ پھر اس نے تمہیں زبانی معافی تک نہیں مانگنے دی۔ راضی نامہ کرنے کا کوئی صلہ بھی نہیں لیا۔

ہاں جی شاہ صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ کسی نے تائید کی۔

اور الہٰی بخش نے یہ سب کچھ تمہارے لئے نہیں کیا۔ افسر شاہ نے مزید کہا۔ تم جانتے ہو کہ کس حوالے سے اس نے تمہاری عزت کی۔ ورنہ تم کیا ہو اور یہ بھی سن لو کہ اس نے

صرف پر احسان نہیں کیا۔ ہم سب پر کیا ہے اور ہمیں اس کا صلہ دینا چاہیے۔

آپ حکم کریں دو۔ سلیمان شاہ نے کہا۔

میں چاہتا ہوں کہ تم اسے پچاس روپے دو۔ پچاس روپے ہم سب اکٹھے کر کے دیں گے اور بھی جو جس کی توفیق ہوگی۔ وہ دے گا۔ ہم سب الٰہی بخش کی عیادت کو جائیں گے اور یہ سب اسے دیں گے۔

سلیمان شاہ سوچ میں پڑ گیا۔ پچاس روپے چھوٹی رقم نہیں تھے۔ پھر بولا۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر لیکن اس وقت تو میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ مجھے پیسے دس دن بعد ملیں گے۔

میں تمہیں قرض دوں گا۔ دس دن بعد واپس دے دینا۔ افسر شاہ نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ پھر وہ دوسروں کی طرف مڑے۔ آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟

سب متفق تھے۔ بات طے پا گئی۔

☆——————☆——————☆

پیر بخش کو اطلاع مل گئی کہ سادات کا جرگہ اس کے گھر آ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس نے بیوی کو بتایا۔ بیٹوں سے باہر چھڑکاؤ کر کے چارپائیاں باہر لگانے کو کہا اور خود ان کے استقبال کے لئے دوڑ گیا۔

جرگہ گاؤں کی حدود میں داخل ہی ہوا تھا کہ پیر بخش وہاں پہنچ گیا۔ اس نے سب کی دست بوسی کی اور پھر افسر شاہ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ سرکار۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟ اس نے لجاجت سے پوچھا۔

تمہیں یہ خیال کیوں آیا پیر بخش۔

آپ لوگوں نے کیوں تکلیف کی۔ حکم دیا ہوتا تو میں خود حاضر ہو جاتا۔

نہیں آ سکتا تو ہمیں ہی تدبیر بخش' فسر شاہ بولے

مجھے کیوں گناہگار کیا شاہ جی۔

ہم تمہارے بیٹے کی عزت پرسی کو آئے ہیں۔

مجھے کہہ دیا ہوتا میں اسے خود آپ کے پاس لے آتا

عیادت گھر جا کر کی جاتی ہے پیر بخش۔ بیمار کو گھر نہیں بلوایا جاتا۔ فسر شاہ نے نرم لہجے

میں کہا اور یہ نبی کریم ﷺ کی سنت ہے۔

یہ سن کر پیر بخش گنگ ہو کر رہ گیا۔ وہ بڑے احترام سے انہیں گھر لایا وہاں دوسرے بیٹے

الہی بخش کو باہر لے آئے تھے۔ الہی بخش بھی ان کی پیشوائی کو آگے بڑھا اور دست بوسی

کی۔ الہی بخش .... تم سکون سے چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔ تم بیمار ہو....

فسر شاہ نے شفقت سے کہا۔

الہی بخش نے بے بسی سے باپ کی طرف دیکھا اور بولا۔ آپ لوگوں کے سامنے یہ

گستاخی کیسے کر سکتا ہوں۔

یہ ہمارا حکم ہے۔ ہمارا احترام کرتے ہو تو یہ حکم بھی ماننا پڑے گا۔

پیر بخش کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ادھر الہی بخش مستفسرانہ نظروں سے

دیکھ رہا تھا شاہ جی سرکار .... اسے اس پر مجبور نہ کریں۔ وہ گڑگڑایا۔

یہ تو تمہارے احترام کی آزمائش ہے۔ فسر شاہ نے کہا اور الہی بخش کا ہاتھ تھام کر اسے

چارپائی کی طرف لے گئے۔ چلو .... بیٹھ جاؤ۔ وہ اس کے بیٹھنے کے بعد اس

کے ساتھ ہی چارپائی پر بیٹھے۔ اب بتاؤ طبیعت کیسی ہے؟

سب نے الٰہی بخش کی عزت پرسی کی۔ پھر اپنی لائی ہوئی چیزیں اسے دیں۔ ان میں چار مرغیاں ڈیڑھ درجن انڈے اور پکھو گھی کھسن تھا۔ پیر بخش نے بہت حجت کی لیکن وہ چیزیں اسے لینا پڑیں۔ البتہ پیسوں کے معاملے میں وہ اڑ گیا۔ یہ ضد نہ کریں سرکار۔ ورنہ میں جان دے دوں گا۔ اس نے کہا۔ پیسے اس نے قبول نہیں کئے۔ مگر ایک اور سخت مرحلہ اس کا منتظر تھا۔ سلیمان شاہ نے الٰہی بخش سے کہا۔ میں دل کی گہرائیوں سے شرمندہ ہوں اور تم سے معافی چاہتا ہوں الٰہی بخش۔

اس وقت پیر بخش کا جی چاہا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

شاہ جی لوگوں کے جانے کے بعد اس نے الٰہی بخش سے کہا۔ یہ سب تیری وجہ سے ہوا ہے بیٹے ہم بہت گنہگار ہو گئے۔

با۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھے معاف کر دو مرشد میرے اختیار میں تو نہیں تھا۔ الٰہی بخش نے تلخ لہجے میں کہا۔ اس لمحے اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب وہ یہاں نہیں رہے گا کراچی جائے گا۔

☆۔۔۔۔۔۔۔۔☆۔۔۔۔۔۔۔۔☆

تو یہ ہے اس زخم کی کہانی۔ شیخ صاحب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

جی سر خواہ مخواہ آپ کا وقت ضائع ہوا۔ الٰہی بخش نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ شیخ صاحب سے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

میں وقت کبھی ضائع نہیں کرتا الٰہی بخش۔ انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔ میرا وقت بہت قیمتی ہے۔

جی سر۔

اچھا اب تو جا کر آرام کرو۔ کل صبح نو بجے ڈرائی کے لئے تیار رہنا۔ پھر پرسوں سے تمہاری ڈیوٹی سعدیہ کے ساتھ ہوگی۔ گڈ نائٹ۔

گڈ نائٹ سر۔ الٰہی بخش کو عجیب سا لگا۔ یہ لفظ اس نے پہلی بار بولا تھا۔

☆---------☆----------☆

وہ الٰہی بخش کی زندگی کا یادگار دن تھا جب وہ پہلی بار ساری کو کالج چھوڑنے گیا۔

اس صبح وہ معمول کے مطابق سویرے اٹھا۔ فجر کی نماز ادا کر کے وہ باغیچے میں آ گیا۔ وہ بہت حسین صبح تھی---------یا اسے حسین لگ رہی تھی۔ گھاس پر ننگے پاؤں چلتے ہوئے اسے اپنے اندر روشنی سی اترتی محسوس ہوئی۔ وہ گہری گہری سانسوں کے ساتھ پھیپھڑوں میں خوشبو سے بوجھل ہوا کو اتارتا رہا۔ اس صبح وہ بہت خوش تھا۔ کچھ دیر ٹہلنے کے بعد وہ رمو کے پاس بیٹھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔

ساڑھے چھ بجے وہ اٹھ کر اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔ کپڑے بدل کے تیار ہو کے وہ باہر آیا تو نئی چمکتی کار کو اور چمکانے میں مصروف ہو گیا۔ چمکانا کیا! درحقیقت وہ اسے پیار

سے سہارا تھا۔ قسمت کی بات ہے' اسے باقاعدہ چلانے کو پہلی کار ملی تھی ----- بالکل نئی چمچماتی کار۔

اسے بتایا گیا تھا کہ سادی ساڑھے سات بجے آیا کرے گی لیکن وہ پہلا دن تھا۔ شاید اس لئے وہ سوا سات بجے ہی آ گئی۔ شیخ صاحب اور بیگم صاحبہ اس کے ساتھ تھے' تم تیار ہو؟ شیخ صاحب نے الٰہی بخش سے پوچھا۔

جی سر جی۔

اس کے لئے یونیفارم کا بندوبست بھی کرو۔ بیگم صاحبہ نے اسے کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ڈرائیور کو ڈرائیور ہی نظر آنا چاہیے۔ سادی چاہے گی تو یہ بھی ہو جائے گا۔ شیخ صاحب بولے۔

نہیں پاپا اس کی ضرورت نہیں۔ سادی نے کہا۔ میں تماشہ نہیں بننا چاہتی۔

اس میں تماشے کی کیا بات ہے؟ بیگم صاحبہ کا منہ بن گیا۔ اس سے تو شان کا پتا چلتا ہے۔

مجھے نہیں چاہیے ایسی شان۔ سادی نے جھنجلا کر کہا۔

بیگم صاحبہ نے نظر انداز کر کے الٰہی بخش کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ گاڑی ذرا احتیاط سے چلانا۔ پتا نہیں' تمہیں گاڑی چلانی آتی بھی ہے یا نہیں۔

شیخ صاحب کا چہرہ تمتما اٹھا' میں کل ٹرائل لے چکا ہوں۔ یہ بہت اچھی ڈرائیو کرتا ہے۔

آپ کی ٹرائل کا مجھے تو اعتبار نہیں۔ پینٹ کرنے والے کو ڈرائیور بنا دیا۔

الٰہی بخش کا چہرہ تپنے لگا۔ اسے احساس ہو گیا کہ بغیر کسی وجہ کے بیگم صاحبہ اس سے چڑتی ہیں اور وہ وہاں زیادہ عرصہ کام نہیں کر سکے گا۔ اس نے دھیرے سے کہا۔ سر

۔۔۔۔۔۔بیگم صاحب مجھ سے متفق نہیں تو۔۔۔۔۔۔

شیخ صاحب نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ پھر وہ رخسانہ بیگم کی طرف مڑے۔ آپ کو پریشان کیا ہے؟

کارنی ہے آپ بہت خطرناک سول لے رہے ہیں۔۔۔۔۔

میرے سے پرانی بیٹی نئی کار سے زیادہ اہم ہے۔ میں اس معاملے میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں پوری طرح مطمئن ہوں۔

آپ صرف حساب تارنے کی خاطر۔۔۔

اس بار شیخ صاحب کا تحمل جواب دے گیا۔ بس رخسانہ بیگم انہوں نے بلند آواز میں کہا۔

آپ میری نرمی سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائیں۔ اب میں ایک لفظ بھی نہیں سنوں گا۔

جہنم میں جائیں۔ رخسانہ بیگم نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا اور وہاں سے چلی گئیں۔

شیخ صاحب نے کندھے جھٹکے اور الہی بخش سے بولے۔ بیگم صاحب کی باتوں کا مائنڈ نہ کرنا میں بھی نہیں کرتا برداشت تو کرنا پڑتا ہے۔

میں کیا مائنڈ کروں گا سر بے حیثیت آدمی ہوں۔

شیخ صاحب نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ انہوں نے سعدیہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا وقت ہو گیا ہے جاؤ بیٹی خدا حافظ۔

الہی بخش نے پچھلا دروازہ کھولا اور ساوی کے بیٹھنے کے بعد اسے بند کر دیا۔ پھر وہ گھوم کر اگلے دروازے کی طرف آیا۔

خدا حافظ پاپا ساوی نے کہا۔

☆۔۔۔۔۔۔۔۔☆۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔☆

وہ خوشبو کا پہلا سفر تھا۔

الہی بخش گاڑی کو باہر سڑک پر لے آیا تھا۔اس نے بیک ویو مرر میں دیکھا۔وہاں سادی نہیں تھی۔الہی بخش نے عقب نما آئینے کو درست کر کے اسکی پوزیشن میں لانے کی کوشش بھی نہیں کی کہ اس میں سادی نظر آئے۔اس کے لئے اتنا ہی بہت کافی تھا کہ وہ گاڑی میں اس کے ساتھ تھی۔

سادی اس کی رہنمائی کر رہی تھی۔وہ اس کی ہدایت کے مطابق گاڑی چلا رہا تھا۔اس کی خوشبو اس کی روح سے باتیں کر رہی تھی۔کوئی بیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد سادی نے کالج کے گیٹ کے سامنے گاڑی رکوا دی۔

تم یک بجے مجھے لے جانے کے لئے آ جانا۔سادی نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

بی بی۔۔۔۔۔۔۔۔ یک بات بتائیں گی؟

میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں سعد یہ ہوں تم مجھے سادی بھی کہہ سکتے ہو۔

میں۔۔۔۔۔۔۔نہیں بی بی یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔

تو چلو اپنی بات بھی رکھ لو اور میری بھی۔تم مجھے سادی بی بی کہہ لیا کرو۔

یہ ٹھیک ہے سادی بی بی۔

اب پوچھو کیا بات ہے؟

یہ علاقہ کون سا ہے سادی بی بی کیا نام ہے اس کا؟

یہ فریئر روڈ ہے۔

ٹھیک ہے جی۔وہ میں پہلی بار اس طرف آیا ہوں۔

تم فکر نہ کرو میں تمہیں پورا شہر دکھا دوں گی۔اب میں جاؤں؟

الٰہی بخش نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ اس سے اجازت مانگ رہی تھی یا اس کا مذاق اڑا رہی تھی؟ لیکن اس کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ جواب طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ خدا حافظ سادی بی بی۔

میری چھٹی ایک بجے ہوتی ہے لیکن کبھی دیر ہونے لگے تمہیں تو تیز ڈرائیو نہ کرنا میں پانچ دس منٹ انتظار بھی کر سکتی ہوں۔

جی سادی بی بی۔

اچھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔خدا حافظ

الٰہی بخش اسے گیٹ کی طرف جاتے دیکھتا رہا۔ کتنی پیاری لڑکی تھی وہ۔ کتنی مٹھاس تھی اس کے لہجے میں اور کتنی اپنائیت۔ لوگ نوکروں سے ایسے بات تو نہیں کرتے۔ ذرا بھی غرور نہیں ہے۔ کاش۔۔۔۔۔۔۔ یہ لڑکی ایبٹ آباد کے کسی غریب گھرانے کی ہوتی۔

اسے اس کی کتنی فکر تھی کہ تیز ڈرائیونگ کو منع کر رہی تھی' کون جانے' اسے ڈرائیور کی فکر ہے یا پجیرو گاڑی کی۔ اس کے اندر سے کسی نے کہا۔ اس سے آگے اس سے سوچا نہیں گیا۔ اس نے خود کو یاد دلایا کہ سادی اس کے لیے نہیں ہے۔ یہ تو اس حد تک کہ وہ اس کی خوشبو سے باتیں کر سکتا ہے۔ اس کی قربت پر خوش ہو سکتا ہے۔ اس سے آگے تو اسے خواب دیکھنے کا حق بھی نہیں۔

وہ کسی رستے سے واپس گیا جس سے سادی اسے لائی تھی۔

ٹھیک ایک بجے وہ کالج پہنچ گیا۔ سادی گاڑی میں آ بیٹھی۔ رستے میں ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔

گلا روز ذرا مختلف تھا۔ ساوی ساڑھے سات بجے اکیلی باہر آئی۔ الٰہی بخش گاڑی صاف کر رہا تھا۔ گڈ مارننگ الٰہی بخش۔ ساوی نے کہا۔ الٰہی بخش تھوڑا سا حیران ہوا۔ پھر اس نے بھی جواب میں گڈ مارننگ ساوی بی بی کہا۔ اس دن کے بعد یہ معمول میں شامل ہو گیا۔

ساوی گاڑی میں بیٹھ گئی تو الٰہی بخش ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ چلیں ساوی بی بی۔ اس نے کہا اور بے ارادہ نظریں اٹھائیں لیکن آئینے میں ساوی کا عکس دیکھ کر وہ ہڑبڑا گیا۔ ساوی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

یہ کیا؟ اس نے سوچا۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ عقب نما شیشے کی پوزیشن تو وہی کل والی تھی۔ البتہ ساوی اس بار دوسرے کونے میں بیٹھی تھی۔ الٰہی بخش کی نظریں جھک گئی۔

چلو الٰہی بخش۔ ساوی نے آہستہ سے کہا۔

الٰہی بخش نے گاڑی سٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی۔

اس روز الٰہی بخش نے جب بھی نظریں اٹھا کر عقب نما آئینے میں دیکھا ساوی کو کھڑکی سے باہر دیکھتے پایا لیکن ہر بار اسے یہ احساس ہوا کہ اس سے پہلے ساوی عقب نما شیشے میں ہی دیکھ رہی تھی اور اس کی نظریں اٹھتے دیکھ کر اس نے سر گھما لیا ہے۔

پھر اچانک ساوی نے پوچھا۔ یہ تم بیک ویو مرر میں کیا دیکھتے ہو؟

الٰہی بخش بوکھلا گیا۔ جج۔۔۔۔۔۔۔جی۔۔۔۔۔کک۔۔۔۔۔۔کچھ نہیں۔۔۔۔۔۔

کچھ بھی نہیں۔

پھر بھی کچھ تو ہوگا۔

بس تعلق سے نظر ہٹ جاتی ہے۔ الہی بخش نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ورنہ میں
تو اس شیشے کو دیکھتا بھی نہیں۔

یہ تو بہت بری بات ہے پھر تم اچھے ڈرائیور تو نہیں ہو سکتے۔

میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا سادی بی بی۔

گاڑی میں یہ شیشہ لگا ہے تو اس کا کوئی مقصد کوئی استعمال بھی ہوگا۔ یہ آرائش کے
لیے تو نہیں نا۔

ہاں جی۔ اس سے ڈرائیور پیچھے کا ٹریفک دیکھتا ہے اس پر نظر رکھتا ہے۔

پر تم تو پیچھے کے ٹریفک پر نظر نہیں رکھتے۔

یہ کیسے ممکن ہے سادی بی بی۔ پیچھے کے ٹریفک پر نظر نہ رکھو تو کسی بھی وقت کوئی
ایکسیڈنٹ ہو جائے۔

تو جب میں نے پوچھا تھا کہ تم اس شیشے میں کیا دیکھتے ہو تو تم نے کہا تھا کہ کچھ بھی نہیں
دیکھتے سادی نے شوخ لہجے میں کہا۔

اس بار الہی بخش بری طرح گڑبڑا گیا۔ وہ جی سادی بی بی میں آپ کی بات سمجھا ہی نہیں
تھا۔

میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ اس شیشے کو بھی دیکھتے رہا کرو۔ میں نہیں چاہتی کہ کوئی حادثہ ہو۔

آپ بےفکر رہیں سادی بی بی۔

اس روز سادی کو کالج چھوڑ کر کوٹھی واپس آتے ہوئے الہی بخش اسی گفتگو پر سوچتا رہا۔
اب وہ اس شیشے میں سادی کو دیکھ سکتا تھا۔ اسے پیچھے کے ٹریفک پر نظر جو رکھنی تھی۔

☆------☆----------☆

خوشبو کے اس سفر میں دن پر لگا کر اڑتے رہے۔

اب سفر خاموشی میں نہیں ہوتا تھا۔ ان کے درمیان ایک طرفہ بے تکلفی اور ایک طرفہ گفتگو کا رشتہ قائم ہو گیا تھا۔ ایک طرفہ اس لئے کہ الٰہی بخش کے پاس نہ کہنے کو کچھ تھا نہ پوچھنے کو۔ اس کی فطرت میں تجسس تو بہت تھا لیکن اس نے اس پر قابو پانے کا طریقہ جان لیا تھا۔ یہ تو اسی وقت ہو گیا تھا جب باپ اسے عشق کی تلقین کیا کرتا تھا اور وہ مزاحمت کرتا تھا۔ بات کچھ یوں ہے کہ عشق احترام سکھاتا ہے اور احترام تجسس سے روکتا ہے۔

چنانچہ ساوی اس سے سوال کرتی رہتی تھی اور وہ جواب دیتا تھا۔ سوالات سے اندازہ ہوتا تھا کہ ساوی کو اس کے بارے میں تجسس بہت ہے۔ وہ اس سے اس کے شہر، اس کے گاؤں کے بارے میں پوچھتی، ان کے رہن سہن ان کے رسم و رواج کے بارے میں سوال کرتی۔ اس کے لئے وہ جیسے پریوں کا دیس تھا۔ بہت سی باتوں پر اسے یقین نہ آتا۔ خاص طور پر وہاں کے معاشرے میں عورت کا جو مقام اور کردار تھا، وہ اسے اداس کر دیتا۔ دوسری طرف وہ اس علاقے کے قدرتی حسن کے متعلق سن کر بہت خوش ہوتی۔ ہائے ---------- وہ تو سچ مچ خوابوں کی سرزمین ہے۔ وہ گہری سانس لے کر کہتی ------ کاش ----- میں بھی کسی ایسی جگہ رہ سکتی۔

الٰہی بخش کی سمجھ میں نہ آتا کہ یہ خوابوں کی سرزمین کا کیا مطلب ہے۔ وہ جنت آباد میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں ہی اس خوبصورتی میں کھولی تھیں۔ اس کے لئے وہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اسے تو کراچی زیادہ اچھا لگتا تھا۔ وہاں رہنا آسان نہیں ہے ساوی بی بی۔ اس نے کہا۔

کیا مطلب؟

وہاں کی زندگی رومینٹک بہت ہے۔الٰہی بخش نے پچھلے حوالے سے کہا۔

میں اب بھی نہیں سمجھی؟

وہاں روزگار نہیں ہے۔اس لئے تو ہم لوگ یہاں فٹ پاتھ پر بیٹھنے کو اپنے گھر پر ترجیح دیتے ہیں۔وہاں کی ہماری زندگی یہاں کی زندگی سے بھی زیادہ رومینٹک ہے۔

ساوی کو وہ حوالہ یاد آگیا اور وہ شرمندہ ہوگئی۔تمہیں اس دن بری لگی تھی میری بات؟

نہیں ساوی بی بی۔مجھے تو اچھا لگا تھا مگر میں نے یہ ضرور سوچا تھا کہ آپ وہ زندگی خود گزاریں تب بھی وہ آپ کو رومینٹک لگے گی؟

بہت مشکل سوال ہے۔شاید کسی دن میں تمہیں اس کا جواب دے سکوں۔ساوی نے کہا اور پھر گفتگو کا رخ بدلا۔اتنا خوبصورت علاقہ ہے تمہارا۔اس کی وجہ سے کم از کم ایک بہت بڑی بچت تو ہوگی۔

کیسی بچت ساوی بی بی

تمہاری شادی ہوگی تو ہنی مون پر تمہارا زیادہ خرچ نہیں ہوگا۔

ہنی مون ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ کیا ہوتا ہے؟

ساوی ہنی مون کے متعلق سمجھانے لگی۔

ہمارے ہاں یہ بھی نہیں ہوتا۔الٰہی بخش نے اس کی بات سننے کے بعد سادگی سے کہا۔ ہمارے ہاں تو میاں بیوی ساتھ بھی نہیں بیٹھتے کبھی۔خود میں نے اپنے باپ اور ماں کو کبھی ایک ساتھ بیٹھے نہیں دیکھا۔

ساوی بھونچکا رہ گئی۔کیوں بھئی؟

ہمارے ہاں شرم و لحاظ بہت ہے' کنبے کا کنبہ ساتھ رہتا ہے۔ لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ ورنہ لوگ بے شرم کہتے ہیں اور ایسے لوگوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔

یہ تو کوئی اچھی بات نہیں۔ سادی نے کہا۔ میں نے قرآن پاک میں پڑھا کہ شوہر اور بیوی ایک دوسرے کا لباس ہیں۔ اس سے قریبی کوئی رشتہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لمحے الٰہی بخش کو وہ بہت بے شرم لگی۔ اسے افسوس ہوا۔ اس کے ذہن میں سادی کا جو تصور تھا وہ بھی مجروح ہوا لیکن اس نے حوالہ قرآن پاک کا دیا تھا۔ پھر بھی اس نے دھیرے سے کہا۔ اللہ نے شرم و حیا کو بہت اہمیت دی ہے۔ اس کی بہت تلقین کی ہے اور پھر تنہائی اور محفل کے الگ الگ آداب ہوتے ہیں۔

میں صرف اس بات پر اعتراض کر رہی ہوں کہ میاں بیوی کا دوسروں کے سامنے ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھنا بے شرمی تو نہیں ہوتا۔ خیر یہ تمہارے ہاں کا قاعدہ ہے تو مجھے اس سلسلے میں کچھ نہیں کہنا چاہیے۔ یہ کہتے کہتے سادی کے لہجے میں بے رخی آ گئی۔

الٰہی بخش خاموش ہو گیا۔ اس نے تو صرف محبت کی تھی۔ اگر سادی کو پانے کی آرزو کی ہوتی تو کچھ اسے سمجھانے کی' کچھ خود سمجھنے کی کوشش بھی کرتا لیکن ایک تو وہ جانتا تھا کہ وہ زمین پر کھڑا ہے۔ جبکہ سادی آسمان پر چمکنے والا چاند ہے جس سے وہ محبت کر سکتا ہے' جسے وہ دیکھ سکتا ہے لیکن اس تک پہنچ نہیں سکتا۔ اسے ہاتھ بڑھا کر چھو نہیں سکتا۔ دوسرے، اسے جس عشق کی گھٹی پلائی گئی تھی اس میں ملنے اور وصال کا کوئی تصور نہیں تھا۔

سعدیہ نے اس کی خاموشی کو ناراضی پر محمول کیا۔ وہ بولی۔ ناراض ہو گئے کیا؟

نہیں سادی بی بی آپ سے میں کبھی ناراض نہیں ہو سکتا آپ کچھ بھی کہہ لیں کچھ بھی کر لیں۔

بہت بڑی بات کہہ رہے ہو۔ کبھی ایسا ہوا تو یاد ضرور دلاؤں گی۔

ایسا کبھی نہیں ہوگا سادی بی بی۔ الٰہی بخش نے بڑے اعتماد سے کہا۔

چلو۔۔۔۔۔۔۔۔دیکھیں گے۔

ایک اور موقعے پر سادی نے اس سے پوچھا۔ تمہاری بیوی بھی تمہاری ساتھ ایسے ہی
رہے گی' جیسے تمہارا قاعدہ ہے؟

جی سادی بی بی۔ آدمی اپنے ہاں کے رواج تو نہیں توڑ سکتا۔

سعدیہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ اور جو تمہاری شادی کسی شہری لڑکی سے ہوگئی تو؟

الٰہی بخش کی نظریں بے ساختہ اٹھیں۔ اس نے عقب نما میں دیکھا۔ سادی پہلے ہی سے
دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کو دونوں کی نظریں ملیں۔ پھر الٰہی بخش سامنے دیکھنے لگا۔

تم نے جواب نہیں دیا

یہ کیسے ہوسکتا ہے سادی بی بی

ہو کیوں نہیں سکتا۔ جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔

وہ تو ٹھیک ہے پر میرے ساتھ ایسا نہیں ہوسکتا۔

کیوں۔۔۔۔۔۔۔ تمہارے ساتھ کیوں نہیں ہوسکتا؟

بس میرا دل بتاتا ہے کہ میرے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔ الٰہی بخش نے پوری سچائی سے کہا۔

اس کا دل واقعی یہی کہتا تھا۔

اور فرض کرو ایسا ہوگیا۔ پھر؟

الٰہی بخش چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا تو اس لڑکی کو میرے لیے دیہاتی بننا ہوگا۔

حالانکہ تمہیں اس کی خاطر شہری بن جانا چاہیے۔ سادی نے کہا۔ سوچتی ہوں تم شہری بن

کر کیسے لکھو گے۔

کیا بھی نہیں لکھوں گا۔ اس لئے کہ میں گاؤ نہیں۔ الٰہی بخش نے بریک لگاتے ہوئے کہا گاڑی کالج کے گیٹ کے سامنے رک گئی۔

اچھا الٰہی بخش خدا حافظ ایک بجے

ٹھیک ہے سادی بی بی۔ خدا حافظ

الٰہی بخش موجودہ وقت کا تقابل اس وقت سے کرتا' جب اس نے سادی کو دیکھا تھا۔ اس نے ملا نہیں تھا تو سے محسوس ہوتا کہ وہ بڑے خسارے میں ہے۔ اب سادی اس کی نظروں کے سامنے ہوتی تھی بہت قریب ہوتی تھی۔ مگر اب سرشاری کی کیفیت نہیں ہوتی تھی۔ جس میں اسے کچھ بھی یاد نہیں رہتا تھا' جس میں بھوک پیاس کا احساس بھی مٹ جاتا تھا۔ کوئی تکلیف تکلیف نہیں رہتی تھی۔ وہ خوش رہتا تھا۔ خوش اور مست و بے خود۔

ب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ قربت محبت کو کم کر دیتی ہے۔ محبوب نظروں کے سامنے نہ ہو تو اس کا تصور بڑا ہوتا ہے۔ اس میں صرف خوبیاں ہی خوبیاں ہوتی ہیں۔ اس کی خامیوں کا علم نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس کا مرتبہ بلند ہی رہتا ہے۔

تو کیا سادی کا مرتبہ کم ہو گیا ہے؟ اس نے سوچا اور اس سوال پر دیر تک سوچتا رہا۔ سادی کا مرتبہ کم تو نہیں ہوا تھا۔ مگر یہ تھا کہ پہلے وہ عام انسان نہیں لگتی تھی۔ جیسے کوئی خاص ہستی ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ آسمان سے اتری ہوئی۔ اب وہ ایک لڑکی لگتی تھی' جس پر وہ نکتہ چینی بھی کر سکتا تھا۔

الٰہی بخش خود کو ٹٹولتا رہا۔ سادی بہت اچھی' بہت پیاری لڑکی تھی۔ مگر اسے یہ بات اچھی

نہیں گئی تھی کہ وہ بے حجابانہ اس سے وہ گفتگو بھی کر لیتی تھی جو اس کے خیال میں معیوب تھی۔ بلکہ شاید وہ اس سے ہر موضوع پر بات کر سکتی تھی۔ جبکہ ایسا صرف دوستوں کے درمیان ہو سکتا ہے۔

یہ سوچتے ہوئے ابھی بخش کو خیال آیا کہ وہ ایک اہم بات نظر انداز کر رہا ہے۔ یہ اپنی اپنی تربیت' پنے ماحول اور اپنی سوسائٹی کے رسم و رواج کی بات ہوتی ہے کہ کیا معیوب ہے ور کیا نہیں۔ اس بنیاد پر کوئی کسی پر بے شرمی کا فتویٰ نہیں لگا سکتا۔ یوں تو ساوی بھی ں پر اعتراض کر سکتی ہے۔ حویلی یہاں بیت الخلا ہر گھر میں ہوتا ہے جبکہ گاؤں میں لوگ رفع حاجت کے لئے باہر جاتے ہیں۔ تو شہر کے لوگ سے بے شرمی قرار دیں گے۔ ن کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئے گی کہ اتنی زمین ہوتے ہوئے گھر میں بیت الخلاء کی گنجائش کیوں نہیں نکالی جا سکتی۔

پھر سے یک ور خیال آیا۔ بزارے میں نوکروں کے ساتھ ایسا سلوک بھی نہیں ہوتا۔ تنی بے تکلفی سے بات کرنا تو دوسری بات ہے کوئی نوکر کو اپنے پاس بھی نہیں بٹھاتا۔ نوکروں وک مسہری نہیں لگایا جاتا تو جب یہ بات بزارے سے متصادم ہونے کے باوجود سے بری نہیں لگتی تو دوسری باتیں بری نہیں لگنی چاہئیں۔

پھر سے یک ور خیال آیا۔ اسے ساوی سے محبت ہے' بلکہ عشق ہے۔ تو عشق انسان کی خوبیوں سے نہیں' خود انسان سے ہونا چاہیے' ساوی کی بدترین برائی سے بھی اس کا دل اس کی طرف سے برا نہیں ہونا چاہیے اور اس نے کوئی بالارادہ تو عشق نہیں کیا۔ یہ جذبہ تو اس کے دل میں ڈالا گیا ہے۔ نہیں ——————— سے ساوی کو کسی قیمت پر برا نہیں سمجھنا چاہیے اور پھر کون جانے یہ کتنے دن کا ساتھ ہے۔ اسے تو بس

سادی کو خوش کرنا چاہیے۔

قریب آنے سے یک نقصان اور ہوا تھا۔ وہ آنکھیں موندتا تو وہ اس کے سامنے آکھڑی ہوتی تھی۔ گھنٹوں وہ اس سے باتیں کرتا تھا۔ باتیں تو وہ اب بھی کرتی تھی اس سے لیکن ان میں وہ لذت نہیں تھی۔ پہلے وہ کم سوتا تھا۔ سوتا تھا تو وہ اس کے خواب میں ضرور آتی تھی۔ اب وہ پہلے کی طرح سوتا تھا۔ زیادہ تر خوابوں سے محروم نیند صبح سوکر اٹھنے میں بھی وہ لذت نہیں رہی تھی۔

الہی بخش اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ محرومی بڑی ہے۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ ناشکرا پن کر رہا ہے۔ باپ نے ہمیشہ اسے یہی تو سمجھایا تھا کہ شکر گزاری نہ چھوڑو۔ شکر گزاری ہے تو عشق بھی کر سکتے ہو۔ وہ دل ہی دل میں توبہ کرنے لگا۔ اسے تو وہ ملا تھا جو اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔

اس کے وجود میں شکر گزاری سوچ در سوچ امنڈنے لگی۔ اتنے عرصے میں پہلی بار اس نے وہ سرشاری محسوس کی جو مہینوں اس کا معمول رہی تھی۔

☆--------------☆--------------☆

اس روز سعدیہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ الہی بخش نے کئی بار نظریں اٹھا کر عقب نما شیشے میں دیکھا لیکن وہ سوچ میں گم رہی۔ وہ بھی پوری طرح ڈرائیونگ کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن اس کا دل پریشان ہو گیا۔ سادی پریشان تھی لیکن کیوں؟

چونک سعدیہ نے اسے پکارا۔ الہی بخش ایک بات پوچھوں سچ سچ بتاؤ گے؟

سادی بی بی۔۔۔۔۔۔ میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ الہی بخش نے سنجیدگی سے کہا۔ لیکن کبھی کبھی جھوٹ نہ بولنے والے بھی جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

پتا نہیں میرے ساتھ تو آج تک ایسا نہیں ہوا۔ خیر آپ پوچھیں

تم نے کبھی محبت کی ہے کسی سے؟

میں تو نسلی عاشق ہوں سادی بی بی۔ الٰہی بخش نے عقب نما شیشے میں دیکھا۔ سادی

حیران نظر آ رہی تھی۔ کیا بات ہے آپ کو اتنی حیرت کیوں ہوئی؟ اس نے پوچھا۔

مجھے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔۔۔۔۔۔ اور وہ بھی ان الفاظ میں۔

جو سچ تھا جیسا تھا ویسے ہی کہہ دیا۔

ذرا وضاحت تو کرو۔

ہماری نسل ہی محبت کرنے والی نسل ہے۔ الٰہی بخش نے گہری سانس لے کر کہا۔ بڑے

بچپن ہی سے مجھے عشق کی تلقین کرتے تھے لیکن مجھے عشق نہیں ہوا۔ میں عشق سے لڑتا رہا

۔ مجھے عشق برا لگتا تھا۔

سادی اب بھی حیران نظر آ رہی تھی۔ الٰہی بخش نے وضاحت کرتے ہوئے اسے اپنے

جدی عشق کے بارے میں بتایا۔

پہلے تم نے کہا کہ تم نسلی عاشق ہو۔ پھر تم نے کہا کہ تم عشق سے لڑتے رہے۔ یہ تو متضاد

بات ہے۔

ہاں سادی بی بی۔ میں لڑتا رہا۔ مگر اب میری سمجھ میں عشق آنے لگا ہے۔ اب میں محبت

کرنے لگا ہوں۔

کس سے؟

مجھے ہر انسان سے محبت ہے' سادی بی بی میں نے سمجھ لیا ہے کہ اللہ سے عشق کرنے کی

یہی صورت ہے۔

پھر بھی یہ تو بتاؤ کس سے محبت کرتے ہو تم؟

میں نے بتایا نا' ہر انسان سے' ماں باپ سے' بہن بھائیوں سے' رشتے داروں سے' آپ کے پاپا سے' کرمو چاچا سے' اظہر بابا سے' آپ کی امی سے۔۔۔۔۔۔۔سب سے

سادی بی بی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

دھر دیکھو۔ سادی نے کہا۔ الٰہی بخش نے عقب نما میں دیکھا۔ تم نے میرا نام نہیں لیا۔ اس کا مطلب ہے میں بالکل اچھی نہیں ہوں۔

الٰہی بخش نے نظریں جھکالیں۔ کسی کے منہ پر یہ کہنا جھوٹا لگتا ہے۔ اس نے میں نے آپ کا نام نہیں لیا تھا۔

تو تم مجھے اچھے ہو' مجھ سے محبت کرتے ہو؟

جی سادی بی بی

سادی شیشے میں اس کے عکس کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ ایک بات ہے' آدمی ہر کسی سے برابری کی محبت تو نہیں کرتا' کسی سے کم' کسی سے زیادہ ہوتی ہے' یہ بتاؤ میرا کون سا نمبر ہے' مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو تم؟

یہ بتانا تو ممکن نہیں ہے بی بی' محبت آدمی نہ تو گن کر چھانٹ کر کرتا ہے' نہ گز' فٹ' انچ میں۔ سچ یہ ہے کہ میں خدا سے اور اس کے پیارے رسول ﷺ سے عشق کرنا چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ انسان تو بس سیڑھیاں ہیں۔

سادی نے دیکھا تھا کہ اس کی محبت کے نام پر الٰہی بخش کے چہرے پر رنگ دوڑ گیا تھا۔ یہ باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس نے کہا۔ اور میں اس محبت کی بات نہیں کر رہی تھی۔

محبت تو بس محبت ہوتی ہے۔۔۔۔۔کسی سے بھی ہو۔الٰہی بخش نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ تم نے کبھی کسی لڑکی سے محبت کی۔۔۔۔۔یک بات کہوں بُرا تو نہیں مانیں گی سادی بی بی۔

کہو۔۔۔۔۔۔۔

یہ تو بہت ذاتی نوعیت کی بات ہے۔نہ تو کسی سے پوچھتے ہیں نہ کسی کو بتاتے ہیں اور آپ کو مجھ سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔

کیوں کیا حرج ہے اس میں؟

بس یہ اچھی بات نہیں

میں تو بس سمجھنا چاہ رہی ہوں کہ محبت کیسی ہوتی ہے۔تم نے منع کیا ہے تو آئندہ ایسی بات نہیں کروں گی۔

الٰہی بخش نے شیشے میں اسے غور سے دیکھا۔برا تو نہیں مانیں آپ؟

نہیں غلط بات پر تم مجھے ٹوک سکتے ہو۔یہ حق میں نے تمہیں دیا ہے۔

الٰہی بخش حیرت میں ڈوب گیا۔

☆۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔☆۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔☆

گندمی رنگ الٰہی بخش

گندمی رنگ ساوی بی بی

اس صبح الٰہی بخش کو احساس ہوا کہ ساوی بہت خوش ہے۔اس کی آنکھیں چمک رہی تھی ۔اس کی آواز میں چہکار تھی۔وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔

آج آپ بہت خوش ہیں ساوی بی بی' الٰہی بخش نے پوچھا۔

میں ہر صبح بہت خوش ہوتی ہوں۔

لیکن آج ہمیشہ سے زیادہ خوش ہیں۔

ہاں آج موسم بہار کا پہلا گلاب کھلا ہے۔

الٰہی بخش کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں بھینچ لیا۔اسے یاد ہی نہیں تھا کہ کب سے گھر یاد نہیں آیا تھا۔نہ گھر نہ اپنے علاقے کے موسم۔فٹ پاتھ پر تھا تو وہ ہمیشہ بہت یاد کو یاد کرتا رہتا تھا۔اب ۔۔۔۔۔۔۔اب اسے خیال بھی نہیں آیا کہ بہار آگئی ہے۔

کیا بات ہے تم اداس ہو گئے؟

بہار نے اداس کر دیا۔کاش۔۔۔۔۔۔۔۔میں اپنی طرف کی بہار آپ کو دکھا سکتا۔

ہمارے ہاں بہت گلاب کھلتے ہیں۔ایسے کہ ہاتھوں کے پیالے کو یک ہی گلاب بھر دے۔

تمہیں گھر یاد آتا ہے تو چھٹی لے کر کچھ دن کے لیے چلے کیوں نہیں جاتے؟

کچھ دیر خاموشی رہی۔پھر ساوی نے کہا۔میری ایک بات مانو گے۔

کیوں نہیں۔آپ کہیں تو۔

مجھے ڈر ہے کہ نہیں مانو گے اور شاید برا بھی مان جاؤ گے۔

اس پر الٰہی بخش چونکتا ہوگا۔ میں تو نوکر آدمی ہوں سادی بی بی پھر ایسی کوئی بات ہے تو

آپ مجھ سے کہیں ہی نہیں۔

کہنی بھی ضروری ہے۔

الٰہی بخش ہچکچایا پھر بولا۔ تو کہہ دیں۔

ذرا گاڑی سائیڈ میں رکھو۔ سادی نے فرمائش کی۔

الٰہی بخش نے موقع دیکھ کر گاڑی ایک طرف لگادی لیکن وہ اندر ہی اندر پریشان تھا کہ

ایسی کون سی بات ہے جس کے لئے گاڑی رکوائی گئی ہے۔ جی سادی بی بی۔ اس نے

شیشے میں سادی کے عکس کو دیکھتے ہوئے کہا۔

سادی نے اپنے پرس میں سے کچھ نوٹ نکالے اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے یہ لو اس کے

بعد میں تم سے کچھ کہوں گی۔

الٰہی بخش نے بے ساختہ ہاتھ بڑھا کر نوٹ تھام لے۔ مگر پھر وہ پرسکون ہو گیا یہ

۔۔۔۔۔۔ یہ کس لئے سادی بی بی۔

میں چاہتی ہوں کہ تم بہت اچھی پینٹ شرٹ بہت اچھے شوز خریدو۔ میں چاہتی ہوں کہ

کل صبح تم نئے کپڑے پہن کر باہر آؤ۔

الٰہی بخش کے چہرے کی رنگت متغیر ہوگئی۔ سادی بی بی پیسے میرے پاس بھی ہیں۔ پوری

تنخواہ بچ جاتی ہے میرا کوئی خرچ ہے ہی نہیں۔

میں جانتی ہوں لیکن یہ میری خواہش ہے۔

مجھے افسوس ہے سادی بی بی یہ میں نہیں کر سکتا۔ الٰہی بخش نے نوٹ پچھلی سیٹ پر گرا دئے

دینے۔

کیوں نہیں کر سکتے؟

میں نے شرٹ پتلون کبھی پہنی نہیں۔ مجھے عجیب سا لگے گا۔تماشہ بننے کا احساس ہوگا۔

یہ مجھ سے نہیں ہوگا سادی بی بی؟

مان جاؤنا

نہیں مان سکتا سادی بی بی۔آپ یہ پیسے رکھ لیں۔الہی بخش نے عاجزی سے کہا۔

تم کیا بات میری نہیں مان سکتے؟ سادی روہانسی ہوگئی۔

میں مجبور ہوں سادی بی بی۔ یہ کہہ کر الہی بخش نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

اس کے بعد پورے راستے خاموشی رہی۔کالج آنے پر سادی اتری اور اس نے معمول کے مطابق الہی بخش کو خدا حافظ کہا لیکن اس کا لہجہ بجھا بجھا تھا۔

واپس آتے ہوئے خود الہی بخش بہت دل گرفتہ تھا۔ یہ احساس اسے ستا رہا تھا کہ اس نے سادی کا دل دکھایا ہے۔بات اتنی بڑی بھی نہیں تھی۔بس وہ ہونٹ نہیں جتا چاہتا تھا۔وہ یوں بجھ گئی تھی۔ جیسے اس کے انکار سے اسے دلی تکلیف ہوئی ہو۔

اس روز وہ دس منٹ پہلے ہی کالج پہنچ گیا۔وہ گاڑی کے باہر کھڑا انتظار کرتا رہا۔سادی آئی تو اس نے اس کے لیے دروازہ کھولا۔سادی خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔الہی بخش نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد عقب نما میں دیکھا لیکن سادی کا چہرہ سے نظر نہیں آیا۔بالآخر الہی بخش سے رہا نہیں گیا۔سادی بی بی ناراض ہیں مجھ سے؟

اس نے پوچھا۔

نہیں الہی بخش ناراضگی کیسی ہر شخص اپنی مرضی کا مالک ہوتا ہے۔

میں تو زندگی میں کبھی اپنی مرضی نہیں کر سکا۔ الٰہی بخش نے تلخی سے سوچا۔ تو اب اس کے ساتھ کیا اپنی مرضی کرنی، جس سے دل کا، روح کا رشتہ جڑا ہے۔ اس نے بریک لگاتے ہوئے گاڑی سائیڈ میں روک دی۔ پھر اس نے پلٹ کر کہا۔ لائیے -------

آپ کی خوشی کی خاطر آپ کی بات مانوں گا۔

یہ تو زبردستی والی بات ہوئی۔ ساوی نے افسردگی سے کہا۔ میں تو تمہیں خوش دیکھنا چاہتی تھی۔

الٰہی بخش کو شرمندگی ہوئی۔ واقعی یہی بات تھی خوشی مان لینے میں کیا برائی تھی۔ ساوی بی بی میں شرمندہ ہوں۔ اس نے دھیرے سے کہا۔ اور یقین کریں میں خوشی سے یہ بات مان رہا ہوں۔

اس وقت الٰہی بخش کی نظر پڑی۔ روپے پچھلی سیٹ پر وہیں پڑے تھے۔ جہاں اس نے گرائے تھے۔ ساوی نے انہیں چھوا بھی نہیں تھا اور خود اس نے بھی دھیان نہیں دیا تھا۔

ساوی نے پیسے اٹھا کر اسے دیئے۔ اس نے بغیر گنے جیب میں رکھ لیے۔

باقی سفر میں بھی ساوی اسی جگہ بیٹھی رہی۔ الٰہی بخش کو احساس تھا کہ وہ اب بھی ناراض ہے۔ لیکن گھر پہنچ کر گاڑی سے اترنے سے پہلے ساوی نے کہا۔ شکریہ الٰہی بخش۔ الٰہی بخش کھل اٹھا۔ اسے لگا کہ اس سے کوئی گناہ سرزد ہوا تھا اور -------- اب اس کا کفارہ قبول کر لیا گیا ہے۔

☆----------☆---------☆

پینٹ شرٹ کی خریداری الٰہی بخش کے لئے بڑا مسئلہ تھا۔ اس کا اسے تجربہ بھی نہیں تھا۔ ساوی کا خیال نہیں ہوتا تو وہ خالی ہاتھ ہی واپس آ جاتا۔

اگلی صبح اس کے لیے آزمائش کی صبح تھی۔ وہ دیر تک گاڑی صاف کرتا رہا۔ سادی کے آنے سے دس منٹ پہلے وہ اپنے کوارٹر میں گیا اور کپڑے بدل کر یوں باہر نکلا' جیسے کہیں چوری کر کے آ رہا ہو۔ اس نے چوروں ہی کی طرح ادھر ادھر دیکھا۔ اتفاق سے کرمو چاچا بھی موجود نہیں تھا اور سادی آ چکی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ پہلے آ گئی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ السلام علیکم الٰہی بخش۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے سلام کیا تھا' کیا یہ کوئی خاص دن ہے؟ الٰہی بخش نے سوچا۔

وعلیکم السلام سادی بی بی۔ الٰہی بخش نے اس کے لئے دروازہ کھولا۔

سالگرہ مبارک الٰہی بخش۔ سادی نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

الٰہی بخش کی سمجھ میں پہلے تو کچھ بھی نہیں آیا اور جب بات سمجھ میں آئی تو اسے زبردست ذہنی جھٹکا لگا۔ اس نے تاریخ یاد کرنے کی کوشش کی لیکن اسے کچھ یاد نہ آیا۔ بالآخر اس نے سادی سے پوچھا۔ آج کیا تاریخ ہے سادی بی بی۔

22 اپریل

الٰہی بخش کو حیرت ہوئی۔ یہ واقعی اس کی سالگرہ کا دن تھا۔ اسے خود یاد نہیں رہا تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ جہاں کا تھا' وہاں تو ان چونچلوں کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ پھر بھی اسے بہت اچھا لگا کہ سادی نے اسے اتنی اہمیت دی۔ مگر حیرت اپنی جگہ تھی کہ سادی کو معلوم کیسے ہوا۔

اس نے یہ بات سادی سے ہی پوچھ لی۔

تم نے ہی بتائی تھی یہ تاریخ

میں نے؟ الٰہی بخش نے حیرت سے کہا

ہاں میں تم سے تمہارے متعلق پوچھتی رہتی ہوں۔مجھے تو بہت کچھ معلوم ہے تمہارے بارے میں۔تمہارا پتا بھی ہے میرے پاس۔

الہی بخش کو احساس ہوا کہ وہ بہت زیادہ باتیں کرتا رہا ہے لیکن نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔باتیں تو سادی بہت کرتی تھی۔بلکہ وہ سوال بہت کرتی تھی۔۔۔۔۔۔۔وہ بس جواب دیتا تھا۔اس کا مطلب ہے کہ وہ واقعی اس کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہے۔یعنی۔۔۔۔۔۔یعنی وہ اس کی پروہ کرتی ہے۔

اس پر الہی بخش نے دل ہی دل میں خود کو ڈپٹ دیا۔خوش فہمی پالنے کی اس کے پاس گنجائش نہیں تھی زمین اور آسمان کبھی نہیں ملتے ہاں آسمان نوازش کے بادلوں سے زمین کی سیرابی کا سامان ضرور کرتا رہتا ہے۔

اس روز دونوں چپ تھے۔اپنی اپنی سوچوں میں گم لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں؟ وہ خاموشی خاموشی نہیں لگ رہی تھی۔

الہی بخش نے گاڑی روکی۔سادی نے اترنے سے پہلے اسے خوبصورت پھولوں دار کاغذ میں لپٹا ہوا ایک پیکٹ دیا۔یہ تمہاری سالگرہ کا تحفہ ہے۔

شکریہ بی بی لیکن اس کی ضرورت نہیں تھی۔آپ نے میری سالگرہ یاد رکھی ورنہ ہم لوگ تو خود بھی اپنی سالگرہ یاد نہیں رکھتے۔

تحفوں کی اپنی ایک اہمیت ہوتی ہے الہی بخش۔سادی نے کہا۔تحفوں سے محبت بڑھتی ہے۔

یہ کہہ کر وہ تو چلی گئی۔الہی بخش اس کی بات پر غور کرتا رہا۔ٹھیک کہتی ہو سادی بی بی اس سے تو اللہ اپنے بندوں کو تحفوں سے نوازتا رہتا ہے لیکن بندوں کی محبت تو نہیں بڑھتی پھر

بھی۔ کم از کم میرے جیسے بدنصیب بندوں کی۔

پہلی بار رب کی بات کا مفہوم اس کی سمجھ میں آیا تھا۔

☆-----------☆-----------☆

دوپہر کو وہ سادی کو کالج سے واپس لایا تو بیگم صاحب لان کے باہر کھڑی کرمو سے کچھ بات کر رہی تھیں۔ انہوں نے الٰہی بخش کو جو اس حلیے میں دیکھا تو پہلے تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پھر ان کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ یہ تم ہو الٰہی بخش۔ ادھر تو آؤ ذرا۔ انہوں نے پکارا۔

الٰہی بخش سمجھ گیا کہ عزت افزائی کے فوراً بعد بے عزتی کا لمحہ بھی آ گیا ہے۔ یہ بھی رب کی عنایت ہے کہ سر میں غرور اٹھنے نہ پائے اور سر میں کوئی سودا جگہ نہ بنائے۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا بیگم صاحب کی طرف بڑھا۔

یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ الٰہی بخش بیگم صاحب نے کڑے لہجے میں اس سے پوچھا۔

میں سمجھا نہیں بیگم صاحب۔

پینٹ شرٹ پہن کر شہری بابو بننے کا شوق کب سے ہو گیا تجھے؟ بیگم صاحب نے زہریلے لہجے میں کہا۔

مجھے ایسا کوئی شوق نہیں..........نہ کبھی ہو گا بیگم..........الٰہی بخش کا لہجہ سخت ہونے لگا۔

اسی وقت پلی کتابیں ہاتھ میں لئے سادی بھی وہاں آ گئی۔ کیا بات ہے بی بی الٰہی بخش نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں التجا تھی۔ الٰہی بخش موم ہو گیا۔

تمہیں کیا ضرورت ہے بیچ میں بولنے کی؟ بیگم صاحب سادی پر الٹ پڑیں۔

ضرورت اس لئے ہے کہ یہ میرا ڈرائیور ہے۔

میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ اس کے لئے وردی ضروری ہے۔ وردی ہو تو آدمی کو وقات یاد رہتی ہے۔ اب تم ہی دیکھو یہ ڈرائیور لگتا ہے کہیں سے۔

مجھے اس سے کوئی غرض نہیں امی۔ وردی کو میں نے ہی منع کیا تھا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ جو لباس چاہے پہنے۔ بس مجھے تماشہ نہیں بننا۔

سادی۔۔۔۔۔۔ سادی۔۔۔۔۔۔ تم نہیں جانتیں۔ کم اوقات آدمی جب اپنی وقات بھولتا ہے تو سر پر چڑھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ بیگم صاحب کے لہجے میں بے بسی اور جھنجھلاہٹ تھی۔

میں اپنی وقات نہیں بھولا بیگم صاحب نہ کبھی بھولوں گا؟ الہی بخش نے تحمل سے کہا۔ مجھے یاد ہے کہ میں فٹ پاتھ پر بیٹھنے والا پینٹر ہوں۔ میں کبھی آپ کے سر نہیں چڑھوں گا۔

تو پھر یہ کپڑے کیوں پہنے تو ہے؟ اس بیاس میں سادی کی گاڑیوں کیوں لے کر گیا؟

میں کہہ رہی ہوں امی کہ مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں۔ سادی نے دھیمے لہجے میں کہا۔ وہ الہی بخش صرف مجھ کو جواب دہ ہے۔ اگر آپ کو اختلاف ہے تو آپ بے شک اس سلسلے میں پاپا سے بات کر لیں۔ مجھے کوئی دوسرا ڈرائیور ملے گا تو پھر بھی یہی کچھ ہو گا۔ بات صرف الہی بخش کی نہیں۔

ٹھیک ہے آج اس سلسلے میں بات ہوگی پھر دیکھوں گی۔ تم بھی بہت آپے سے باہر ہو رہی ہو۔ بیگم صاحب نے سادی کو تاڑا۔ اچھا۔۔۔۔۔۔۔۔ اب اندر جاؤ پلیز۔

سادی پاؤں پٹختی ہوئی اندر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد بیگم صاحب الہی بخش کی طرف مڑیں۔ دیکھو الہی بخش یہ تمہارا روزی کا معاملہ ہے۔ میں اس میں کوئی گڑبڑ نہیں کرنا چاہتی۔ یہ بہت گناہ کا کام ہے لیکن ـــــــــــ

میں بہت عاجزی سے آپ سے ایک عرض کروں۔ الہی بخش نے ان کی بات کاٹ دی۔ سچ یہ ہے کہ میں فٹ پاتھ کی مزدوری میں بہت خوش تھا۔ اپنی اوقات میں خوش رہنے والا بندہ جو ٹھہرا اور رزق دینے والا اللہ ہے۔ آپ اس معاملے میں میرے ساتھ کوئی رعایت نہ کریں۔

تو پھر یہاں کیوں نوکری کر رہے ہو؟ چلے جاؤ فٹ پاتھ پر۔ بیگم صاحب نے جل کر کہا میں تمہیں فارغ کر دیتی ہوں۔

بات آپ کی نہیں صاحب جی کی ہے۔ صاحب جی فٹ پاتھ والوں کو عزت دینے والے ہیں۔ ان سے میں انکار نہیں کر سکتا۔ آپ ان سے بات کر کے مجھے فارغ کر دیں۔ میں ہنسی خوشی چلا جاؤں گا۔

بہت چالاک ہوتے ہو تم غریب لوگ۔ بیگم صاحب نے زہر یلے لہجے میں کہا۔ اتنی تنخواہ چھوڑ کر ہنسی خوشی چلے جاؤ گے۔ مگر وہ بے وقوف شیخ صاحب جو مل گئے ہیں تو خوب عیش کرو۔

الہی بخش کا چہرہ تمتما اٹھا۔ تنخواہ کی بات نہیں۔ میں تین وقت کی روٹی پر بھی یہاں نوکری کر سکتا ہوں۔ صاحب جی کہہ کر تو دیکھیں۔

نہ وہ کہیں گے نہ تم جاؤ گے۔

چلیں آج میں خود بات کر لیتا ہوں صاحب جی سے کہ مجھے آزاد کر دیں۔

بیگم صاحبہ گڑبڑا گئیں۔ جانتی تھیں کہ اس معاملے میں شیخ صاحب سخت ہو جائیں گے۔ وہ حسن ماننے والے آدمی تھے۔ ان کی خبر بھی لے لیں گے۔ نہیں اس کی ضرورت نہیں الٰہی بخش انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔ بس اپنی اوقات میں رہو۔ آئندہ ان کپڑوں میں گاڑی کبھی نہ چلانا۔ اب اپنے کوارٹر میں جاؤ۔

الٰہی بخش اپنے کوارٹر میں چلا گیا۔

☆-----------------☆---------------☆

الٰہی بخش نے وہ پینٹ شرٹ اور جوتے اپنے صندوق میں رکھ دیئے۔ اس نے عہد کیا کہ اب وہ انہیں کبھی نہیں پہنے گا۔ ایک لمحے کو اس نے سوچا کہ انہیں جلا دے لیکن اس نے فوراً ہی اس خیال کو رد کر دیا۔ وہ تو ساوی کی عنایت کی نشانیاں تھیں۔ وہ تو سنبھال کر رکھنے والی چیزیں تھیں۔

اسے اس تحفے کے بارے میں تجسس تھا' جو ساوی نے اسے دیا تھا اس نے سوچا تھا کہ رات کو سوتے وقت دیکھے گا کہ ساوی نے اسے کیا دیا ہے' مگر شام تک اس کا ضبط جواب دے گیا۔ اس نے اپنے کوارٹر کا دروازہ اندر سے بند کیا' اور بڑی نزاکت سے پیکٹ کے اوپری کاغذ کو کھولنے لگا۔ اس طرح کہ وہ پھٹے بھی نہیں۔

پیکٹ سے ایک کارڈ بھی منسلک تھا۔ اس پر لکھا تھا.......الٰہی بخش کے لئے سالگرہ کی دلی مبارکباد اور نیک خواہشات اور خلوص محبت کے ساتھ۔ ساوی الٰہی بخش نے کارڈ کو ایک طرف رکھ دیا۔ پھر اس نے پھول دار کاغذ بھی وہیں رکھ دیا۔

کاغذ ہٹنے کے بعد اندر سے ایک پیکٹ نکلا۔ اس نے پیکٹ کو کھولا تو ایک پیکنگ برآمد ہوئی۔ پیکنگ میں ہلکے نیلے رنگ کی ایک بہت خوبصورت بوتل نکلی' جس میں زرد رنگ

کا کوئی سیال بھر تھا۔ اور خوشبو تھی ——— انگریزی خوشبو الٰہی بخش نے بوتل کے منہ پر لگے ہوئے کور کو ہٹایا وہ اسپرے تھا۔

الٰہی بخش چند لمحے محبت سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے بوتل کے کیپ کو دبایا۔ سیال کی پھوار اس پر گری۔ اس کا پورا کوارٹر مہک گیا۔ وہ بہت بھینی اور دلربا خوشبو تھی۔ الٰہی بخش نے چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھا۔ اسے ڈر تھا کہ خوشبو کوارٹر سے باہر نکل جائے گی لیکن وہ اسے روک بھی نہیں سکتا تھا اور بولتی باتیں کرتی وہ خوشبو کسی کے کانوں میں پڑ گئی تو یہ کیسا خطرناک تحفہ دیا ہے سادی نے۔

سے وہ یاد آیا کہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے لیکن عشق کو تو اس نے بڑی کامیابی سے چھپا لیا تھا۔ کسی کو پتا نہیں چل سکا تھا کہ اسے سادی سے عشق ہے۔ مگر اب وہ پریشان تھا۔ اس خوشبو کو چھپانا اس کے لئے آسان نہیں تھا۔

اس نے بوتل کو کور لگا کر اس کی پیکنگ میں رکھا۔ اب وہ خوشبو کے تحلیل ہونے کا منتظر تھا۔ عشق اور عام خوشبو میں یہی تو فرق ہے۔ عام خوشبو ختم ہو جاتی ہے لیکن عشق کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اسی لئے وہ بلآخر پکڑا جاتا ہے۔

مگر وہ خوشبو کچھ مختلف تھی۔ الٰہی بخش کو محسوس ہوا کہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ خوشبو تیز ہوتی جا رہی ہے۔ جب وہ خوشبو پھیلی تو منہ بند کلی کی طرح تھی۔ اور اب جیسے خوشبو کی وہ منہ بند کلی کھل رہی تھی۔ جانے پھول بنے گی تو کیا حال ہوگا۔ الٰہی بخش نے سوچا۔

وہ خوشبو میں گھر بیٹھا خوشبو کے تحلیل ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ جانے کتنی دیر ہو گئی۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ شام ڈھل چکی ہے اور کوارٹر میں اندھیرا ہو گیا ہے۔ پھر دروازے پر ہونے والی ہلکی سی دستک نے اسے چونکا دیا۔ وہ اس چور کی طرح گھبرا گیا

جیسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہو۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اس تحفے کو کہاں چھپائے۔ گھبراہٹ میں کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔

الٰہی بخش نے پھول اور کاغذ کارڈ اور پیکنگ کو جلدی جلدی بکس میں رکھا۔ تب تک دروازے پر تیسری دستک بھی ہو چکی تھی۔ بکس بند کر کے وہ اٹھا تو اسے یہ احساس ہوا کہ خوشبو کی آواز تو اور تیز ہو گئی ہے۔ وہ خوشبو کی شیشی کو تو چھپا سکتا تھا لیکن اس خوشبو کا گلا نہیں گھونٹ سکتا تھا جو پورے کوارٹر میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دروازے پر گیا۔ چوتھی دستک نسبتاً بلند تھی۔ کون ہے؟ اس نے پوچھا۔

دروازہ کھولو میں ہوں سادی۔

الٰہی بخش کا دماغ بھک سے اڑ گیا سادی۔۔۔۔۔۔۔ اور یہاں۔ وہ پتھر کا بت بن گیا۔

سکوت و صامت

دروازہ کھولو الٰہی بخش۔

الٰہی بخش نے دروازہ کھول دیا۔ سادی ہوا کے جھونکے کی طرح اندر آ گئی۔ کیا بات ہے؟ سو رہے تھے؟ اس نے پوچھا۔

ن۔۔۔۔۔۔نہیں۔۔۔۔۔۔۔ج۔۔۔۔۔۔۔جی ہاں

کوارٹر میں اندھیرا کر رکھا ہے۔ لائٹ کیوں نہیں جلائی؟

بس آنکھ لگ گئی تھی

سوری میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔

رے نہیں سادی بی بی۔آپ بتائیں کہیں چلنا ہے۔

نہیں کہیں جانا نہیں ہے۔سادی نے کہا میں تم سے ملنے آئی ہوں۔ بڑ کو ارٹر نہیں دکھاؤ گے؟

کیوں نہیں سادی بی بی۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہ آپ لوگوں ہی کا دیا ہوا ہے۔الہی بخش نے کہا۔لیکن پھر بیگم صاحبہ کہیں گی کہ میں اپنی اوقات بھول رہا ہوں۔

میں تم سے گاؤں کی باتوں کی معذرت بھی کرنے آئی ہوں۔سادی نے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔الہی بخش نے آگے جا کر لائٹ آن کر دی۔امی نے تمہاری بہت بے عزتی کی لیکن تم مائنڈ نہ کرو۔امی ایسی ہی ہیں۔وہ تو پاپا کو بھی نہیں بخشتیں۔وہ کہتے کہتے رک گئی۔ارے۔۔۔۔۔۔۔۔یہ خوشبو۔

الہی بخش نے چوروں کی طرح نظریں جھکالیں۔

کیسی لگی تمہیں؟

بہت اچھی ہے۔سادی بی بی۔الہی بخش نے کہا وہ کہنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔مگر بہت ہے لیکن اس نے یہ بات نوک زباں پر روک لی۔

میں دراصل تم سے معافی مانگنے آئی ہوں۔سادی نے کہا۔میری بات ماننے کی وجہ سے تمہاری اتنی بے عزتی ہوئی۔۔۔۔۔۔۔۔

ایسی باتیں نہ کریں سادی بی بی آپ نہیں جانتیں میں نے زندگی بھر یہی کچھ دیکھا ،یہی کچھ بھگتا ہے۔کراچی سے تو مجھے محبت اسی لئے ہے کہ مجھے سب سے زیادہ عزت اور محبت یہیں ملی ہے۔یہاں آپ جیسے بڑے لوگوں سے بھی برابری کا احساس ملا ہے مجھے۔ورنہ ہیبت آباد میں میں کیا تھا۔جاہ ہے کہ اولاد جسے سادات کو بھی تعظیم دینی تھی

ور خو تمہیں کو بھی۔ میری تو اپنی نظروں میں بھی کوئی عزت نہیں تھی وہاں' آپ مجھے شرمندہ نہ کریں۔ میں نے برا نہیں مانا۔ کراچی میں صرف بیگم صاحب کا سلوک ہی ایسا ہے جس سے مجھے گھر یاد آ جاتا ہے۔

پھر بھی میں تم سے شرمندہ ہوں۔

اب ایسی بات نہ کیجئے گا۔

ساوی اب کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ اپنا کمرہ بہت صاف ستھرا رکھتے ہو تم۔ اس نے ستائشی لہجے میں کہا۔ پھر وہ کتابوں کی چھوٹی سی الماری کی طرف بڑھی۔ ارے واہ۔۔۔۔کتابیں تو اچھی خاصی ہیں تمہارے پاس۔

بس جی ساوی بی بی یہی ایک شوق ہے میرا۔

اچھا شوق ہے۔ کتابوں سے دوستی ہو جائے تو آدمی تنہائی میں بھی تنہا نہیں ہوتا۔

ٹھیک کہتی ہیں آپ۔

ساوی وہاں کھڑی کتابوں کے عنوان دہراتی رہی۔۔۔۔۔ سڑک واپس جاتی ہے' شکست' برف کا پھول' ایک وائلن' سمندر کے کنارے' طوفان کی کلیاں' ایک گدھے کی سرگزشت' گدھے کی واپسی' گدھا نیفا میں' درد کی نہر۔۔۔۔۔۔۔ کرشن چندر بہت پسند ہیں تمہیں؟ اس نے پوچھا۔

جی ساوی بی بی سب لکھنے والوں سے زیادہ۔

ادھر اس طرف شعری مجموعے ہیں۔ ساوی بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ سیف الدین سیف کا خم کاکل' ناصر کاظمی کا برگ نے اور دیوان' قتیل شفائی کا گجر' ساحر لدھیانوی کا پرچھائیں اور گاتا جائے بنجارہ۔۔۔۔۔۔ حبیب جالب' احمد ندیم قاسمی' واہ بھئی تمہارا

ذوق تو بہت اچھا ہے۔

ذوق کا تو نہیں معلوم سادی بی بی بس شاعری مجھے بے خود کر دیتی ہے۔

کسی عاشق جو ٹھہرے۔ سادی نے اس کی بات دہرا دی۔ پھر بولی۔ شاعروں میں کون زیادہ پسند ہے تمہیں۔

پہلے ساحر بہت اچھے لگتے تھے۔ اب لگتا ہے ناصر کاظمی نے صرف میرے لیے شاعری کی ہے۔

نیچے ابن صفی کی کتابیں رکھیں تھی۔ سادی نے حیرت سے دیکھا۔ کہاں کرشن چندر، شاعری اور کہاں ابن صفی۔

سادی اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہو۔ کیا یہ وہی شخص ہے ------ جاہل الہی بخش، فٹ پاتھ پر بیٹھنے والا پینٹر اور اس کا ڈرائیور؟ اس وقت الہی بخش کا چہرہ اسے بہت روشن لگ رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی --------- ایسے تو پڑھے لکھے دولت مند خاندانی لوگ بھی نہیں ہوتے۔

الہی بخش نے اس کی نظروں کی تپش سے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔

سادی کی توجہ ایک کتاب نے کھینچ لی۔ پہلی بارش ناصر کاظمی اس نے کتاب باہر نکالی۔ کتاب کو دیکھنے کے بعد وہ بولی، کیسی خوبصورت کتاب ہے۔

جی ہاں صرف خوبصورت چھپی ہے۔ شاعری بھی خوبصورت ہے اب تک مجھے سب سے اچھی یہی کتاب لگی ہے۔

تم نے پڑھی ہے۔؟

جی ہاں پڑھی تو ہے لیکن ابھی تک پہلی غزل کا پہلا شعر تک نہیں سمجھ سکا ہوں لگتا ہے

سے سمجھنے کے لئے پوری زندگی لگ گئی۔

سادی کے دل میں اشتیاق پیدا ہوا اس نے پہلی غزل نکالی اور بآواز بلند مطلع پڑھا

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا

پہلے تیرا نام لکھا تھا

واہ۔۔۔۔۔۔بہت اچھا شعر ہے لیکن الٰہی بخش یہ مشکل تو نہیں کہ اسے سمجھ نہ سکو۔

لفظوں کا مطلب تو آسان ہے میں اس کی شعری روح کو سمجھنا چاہتا ہوں۔

مجھے تو یہ شعر بہت سادہ اور آسان لگا ہے۔

تو مجھے بھی سمجھا دیجئے۔

سادی سوچ میں پڑ گئی۔ پھر بولی۔ اب سمجھ میں آتا ہے کہ سمجھنے سے زیادہ کسی کو سمجھانا مشکل ہے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ شاعر کا اشارہ اپنے محبوب کی طرف ہے۔

یہ تو میں بھی سمجھتا ہوں لیکن میری تسلی نہیں ہوتی۔ یہ کون سے محبوب کی بات ہو رہی ہے؟ یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ ویسے سادی بی بی یہ پہلی بار مسلسل غزل ہے۔ یوں کہیے کہ غزل کا جسم ہے اور روح نظم کی ہے۔ لہٰذا الگ سے ایک شعر کو سمجھنے کی بجائے ملا کر سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ دیکھیں تو۔۔۔۔۔۔۔۔

میں نے جب لکھنا سیکھا تھا

پہلے تیرا نام لکھا تھا

میں وہ صبر صمیم ہوں جس نے

بار امانت سر پہ لیا تھا

عشق کا عین

میں وہ اسم عظیم ہوں جس کو

جن و ملک نے سجدہ کیا تھا

تو نے کیوں مرا ہاتھ نہ پکڑا

میں جب رستے سے بھٹکا تھا

پہلی بارش بھیجنے والے

میں ترے درشن کا پیاسا تھا

سادی بڑی توجہ سے سن رہی تھی۔ الہی بخش کی آواز میں ۔۔۔۔۔۔۔ اس کے لہجے میں نہ جانے کیا تھا کہ سادہ سے وہ اشعار دل میں اتر جا رہے تھے۔ ذہن میں ایسے سوال پیسے امر رمر اٹھا رہے تھے، جنہیں وہ سمجھ بھی نہیں پا رہی تھی۔

اچانک سے احساس ہوا کہ اس کے سامنے ایک بالکل مختلف الہی بخش کھڑا ہے۔

وہ اب وجیہہ اور خوبرو دیہاتی نہیں، ایک خوبصورت اور معصوم روح کا مالک ایک عالم بھی تھا، جس کا سینہ علم عشق سے معمور تھا۔

اسم عظیم تو سمجھ میں آتا ہے سادی بی بی۔ الہی بخش کھوئے کھوئے لہجے میں کہہ رہا تھا لیکن یہ صبر صمیم کیسا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔ اور بار ملاقات کیا ہے؟

سادی کو محسوس ہوا کہ ان سوالوں کے جواب اسے بھی کھوجنے ہیں۔ الہی بخش یہ کتاب مجھے دو گے میں اس کا مطالعہ کرنا چاہتی ہوں۔

کیوں نہیں لے جائیے۔ الہی بخش نے بدستور کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

دو تین دن میں واپس دے دوں گی۔

الٰہی بخش بری طرح چونکا۔ یہ تو میرے خیال میں اس کتاب کی توہین ہے۔ وہ بولا ایک بات کہوں آپ برا تو نہیں مانیں گی؟

کہو میں برا نہیں مانوں گی؟

یہ کتاب اس وقت نہ لے کر جایئے۔ میں کل آپ کو یہ کتاب دے دوں گا۔

ٹھیک ہے اس میں برا ماننے کی تو کوئی بات نہیں۔ سادی نے کہا۔ اچھا الٰہی بخش اب میں چلتی ہوں۔ شب بخیر

شب بخیر سادی بی بی

وہ چلی تو الٰہی بخش کو یہ کوارٹر ویران لگنے لگا' جیسے بہار آ کر رخصت ہو گئی ہو۔ لیکن خوشبو کی آواز و رہ بند ہو گئی تھی۔ وہ اپنے شباب پر تھی۔

☆-------------------☆-------------☆

اگلے روز الٰہی بخش سادی کو کالج چھوڑ کر آیا اور ناشتہ کرنے کے بعد باہر چلا گیا۔ واپس آیا تو وہ کرم دین کے کوارٹر میں چلا گیا۔ کرم دین کئی دن سے کہہ رہا تھا کہ گھر بھیجنے کے لئے خط لکھوانا ہے۔ الٰہی بخش نے اس کا خط لکھ دیا۔

دوپہر کو وہ سادی کو کالج سے لینے کے لئے گیا تو بہت خوش اور مطمئن تھا۔ سادی آئی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ سادی بیٹھ گئی۔ الٰہی بخش نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد ڈیش بورڈ پر رکھا ہوا لفافہ اٹھایا اور پلٹ کر سادی کی طرف بڑھایا۔ یہ لیجئے سادی بی بی۔ سادی نے کچھ کہے بغیر لفافہ لیا اور اس میں موجود چیز نکالی۔ وہ ناصر کاظمی کا شعری مجموعہ "پہلی بارش" تھا۔ وہ کھل اٹھی۔

یہ آپ کی کتاب ہے--------آپ کے لئے۔ الٰہی بخش نے کہا۔ آپ کو تحفہ

دینے کی وقعات تو نہیں میری جو چاہتیں سمجھ لیں۔

واہ۔۔۔۔۔۔میں تو اسے تحفہ ہی سمجھوں گی۔ ساوی نے کہا۔ اور یہ ای والی باتیں نہ کیا کرو مجھ سے۔

حقیقت تو حقیقت ہی ہے ساوی بی بی اور میں اسے بدلنا بھی نہیں چاہتا۔

میں تمہارا شکریہ نہیں ادا کروں گی لیکن کاش تمہیں بتا سکتی کہ اس تحفے سے مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔

الہی بخش بھی خوشی سے سرشار ہو گیا۔ اس کا تحفہ حسن کی بارگاہ میں قبول ہو گیا تھا۔

☆۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔☆۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔☆

خوشبو کے سفر میں دن گزرتے رہے۔ ساوی میں ایک نمایاں تبدیلی نظر آئی۔ اس کی شوخی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے مزاج میں سنجیدگی آ گئی تھی اور وہ اپنی عمر سے بڑی لگنے لگی تھی۔ الہی بخش جانتا تھا کہ ماں باپ کے جھگڑوں کا وہ بہت زیادہ اثر لیتی ہے۔ اب ڈرائیو کے دوران گفتگو بھی کم ہی کرتی تھی۔ البتہ اس کا رویہ اب بھی پہلے جیسا ہی تھا۔ لہجے میں وہی مٹھاس، انداز میں وہی اپنائیت۔

ایک دن وہ بولی۔ مرد کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں اور عورتیں کتنی پابند۔

الہی بخش کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ یہ خیال کیوں آیا آپ کو؟

اپنے گھر میں اپنے علاقے میں تمہیں عزت اور سکون نہیں ملا تو تم کتنی آسانی سے گھر چھوڑ آئے۔ تمہاری جگہ کوئی لڑکی ہوتی تو وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔

آپ ٹھیک کہتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔لیکن پھر بھی یہاں عورتوں کو ہمارے ہاں کے مقابلے میں بہت زیادہ آزادی ہے۔

سادی کسی سوچ میں پڑ گئی۔ پھر اس نے کہا۔ الٰہی بخش تم پر میرا زور تو نہیں لیکن میں چاہتی ہوں کہ تم میری ایک بات مان لو۔

کہئیے سادی بی بی

میں چاہتی ہوں کہ تم یہ ڈرائیوری چھوڑ دو۔ کوئی اور نوکری کرو۔ پرائیویٹ امتحان دو اور کم از کم بی اے کرو۔

الٰہی بخش نے نظریں اٹھا کر عقب نما میں دیکھا تو سادی نظریں چرانے لگی۔ ورنہ؟ اس نے پوچھا۔

ورنہ تم پہ رہن سہن یا طرز زندگی بدلو اور سیٹھ کے ہو رہو۔ کوشش کر کے نیا گھر بناؤ چاہے ابتدا میں وہ جھونپڑی ہو۔ پھر اپنا گھر بساؤ۔

الٰہی بخش حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔

میں تمہیں کسی بلند مقام پر دیکھنا چاہتی ہوں۔ الٰہی بخش اس لیے کہ تم چھوٹے آدمی نہیں ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم کسی شہری لڑکی سے شادی کرو۔ کچھ بن کر دکھا دو۔ ایسا کرو کہ جنہوں نے تمہیں حقیر سمجھا ہے تمہاری عزت کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

آپ کی بات کا جواب طویل ہو گا میں ڈرائیو کرتے ہوئے کیسے جواب دے سکتا ہوں؟ الٰہی بخش نے بے بسی سے کہا۔

وہ اس وقت کالج سے گھر جا رہے تھے۔ ٹھیک ہے تم گاڑی دائیں جانب موڑ لو۔ سادی نے کہا۔ پھر وہ اسے ہدایات دیتی رہی۔ بالآخر اس نے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے گاڑی کھڑی کر دی۔ چلو گاڑی لاک کرو۔ یہاں ہم سکون سے بات کر سکیں گے۔

لیکن سادی بی بی دیر ہو جائے گی۔ بیگم صاحب پریشان ہوں گی۔ الہی بخش نے احتجاج کیا۔

ان کے پاس اتنی فرصت نہیں۔ سادی نے تلخی سے کہا۔ آؤ میرے ساتھ۔

ہچکچاتا ہوا الہی بخش اس کے ساتھ ریسٹورنٹ میں چلا گیا۔ اندر نیم تاریکی کی تھی۔ خنک ماحول میں بہت دھیمی لائٹس روشن تھیں۔ سادی ایک فیملی کیبن کی طرف بڑھ گئی۔ ان کے بیٹھتے ہی ایک باوردی ویٹر مینو لئے ہوئے آ گیا۔ اس نے ایک ایک مینو کارڈ دونوں کی طرف بڑھا دیا۔

الہی بخش کی سمجھ میں نہیں آیا کہ مینو کارڈ کا کیا کرے۔ سادی کی دیکھا دیکھی اس نے بھی اسے کھول لیا۔ وہ چھوٹی سی کتاب سی تھی۔ اس میں کھانوں اور مشروبات وغیرہ کی تفصیل درج تھی۔ پہلے پانی لے آؤ۔ سادی نے ویٹر سے کہا۔

الہی بخش مرعوب ہو گیا تھا۔ ویٹر کی وردی ہی اسے احساس کمتری میں مبتلا کرنے کے لئے کافی تھی۔

کیا کھاؤ گے الہی بخش؟ سادی نے پوچھا

سادی بی بی میں۔

پلیز۔۔۔۔۔۔ یہاں مجھے سادی بی بی نہ کہو۔ سادی نے اس کی بات کاٹ دی۔

صرف سادی کہو۔ ورنہ ویٹر مجھے نہ جانے کیا سمجھے گا؟

بہت مشکل کام ہے۔ الہی بخش ہچکچایا

میری خاطر کرنا ہوگا۔ سادی نے کہا پھر پوچھا۔ کیا کھاؤ گے؟

کھانا تو گھر پر ہی کھاؤں گی۔ سادی بی بی۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ کہتے کہتے رکا۔ میر

مطلب ہے سادی اسے سادی کہنا عجیب لگا لیکن اچھا بھی۔ اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہونے لگی۔

نہیں الٰہی بخش۔۔۔۔۔۔۔۔۔کھانا یہیں کھائیں گے۔

تو جو جی چاہے منگا لیں۔

ویٹر ٹھنڈے پانی کی بوتل اور گلاس لے آیا تھا۔ سادی نے اسے آرڈر نوٹ کرایا وہ چلا گیا۔

سادی بی بی۔

پھر وہی بی بی کا دم چھلا۔ سادی نے چڑ کر کہا تم مجھے ذلیل کرو گے۔

نہیں۔۔۔۔۔۔۔ایسا نہیں ہوگا بس عادت سی ہوگئی ہے نا۔ الٰہی بخش نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا لیکن سادی بی۔۔۔۔۔نہیں سادی آپ مجھے گناہگار بنا رہی ہیں۔

میرا نام لینا گناہ ہے تمہارے لئے؟ سادی نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

ہاں جی میرے نزدیک تو یہ گناہ ہی ہے۔

تم آخر مجھے کیا سمجھتے ہو؟

بس سادی آپ بہت بلند ہیں۔۔۔۔۔۔بہت اونچی۔ آپ آسمان میں زمین۔

اسی لئے تو کہتی ہوں کہ میں تمہیں کسی بلند مقام پر۔۔۔۔۔۔۔۔۔بڑے آدمی دیکھنا چاہتی ہوں۔ پھر تم مجھے سادی کہو گے اور تمہیں برا بھی نہیں ہوگی۔

ایسا تو کبھی نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ میں یہ نہیں چاہتا۔ وہ کچھ اور بھی کہتا لیکن ویٹر کھانا لے آیا تھا۔ سادی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا۔

ویٹر کھانا رکھ کر چلا گیا۔ الٰہی بخش کو چھری کانٹے اور نیپکن دیکھ کر وحشت ہونے لگی۔

سادی نے پلیٹ میں بریانی نکالی اور اس کی طرف بڑھا دی۔ پھر وہ اپنی پلیٹ میں بریانی نکالنے لگی۔ پلیٹ اپنے سامنے رکھ کر اس نے نظریں اٹھائیں تو الٰہی بخش ویسے ہی بیٹھا تھا۔ کیا بات ہے کھانا شروع کرو۔ ہاں کباب بھی لے لو۔

میں جس طرح کھانا کھاؤں گا اس میں آپ کی بے عزتی ہوگی۔

میں تمہیں سکھا دوں گی۔ مجھے دیکھو۔ یہ کہہ کر سادی نے نیپکن سامنے پھیلایا اور چھری کانٹا سنبھال لیا۔

الٰہی بخش نے بھی اس کی تقلید کی۔

بہت مشکل لگ رہا ہے؟ سادی نے پوچھا

نہیں لیکن اچھا نہیں لگ رہا ہے

کیوں؟

الٰہی بخش کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ کھانا کھانا ہمیشہ میرے لئے بہت بڑی خوشی ہوتی ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے میں اور اس رزق پر خدا کا شکر ادا کرتا ہے لیکن آج میں دونوں سے محروم ہو گیا ہوں---------خوشی سے بھی اور شکر سے بھی۔

اس لئے کہ یہ تمہارے لئے اس طرح کھانا کھانے کا پہلا موقع ہے---------اور یہ احساس تمہیں ستا رہا ہے۔ اس کی عادت ہو جائے گی تو کھانا کھاتے ہوئے خوش بھی ہو گے اور خدا کا شکر بھی ادا کرو گے۔

نہیں سادی۔ میں اس طرح کھانا کھانے کا عادی بھی ہو گیا تو مجھے یہ احساس رہے گا کہ میں دوسروں کو دکھانے، خوش کرنے کے لئے اس طرح کھا رہا ہوں۔ پھر خوش ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا---------اور شکر کا خیال بھی دل میں نہیں آ سکتا۔

میں آپ کی بات نہیں کرتا لیکن بڑی حد تک یہ بات سچ ہے۔

سادی بھی سوچ میں پڑ گئی۔ پھر بولی۔ میں تمہیں خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ تم جس طرح چاہو کھانا کھاؤ اس میں مجھے بے عزتی محسوس نہیں ہوگی۔

الہی بخش نے چھری کانٹا پلیٹ میں رکھا اور ہاتھ سے کھانا کھانے لگا۔ سادی نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو اسے اس کے چہرے پر طمانیت نظر آئی۔

باہر واش روم ہے۔ جا کے ہاتھ دھو آؤ۔ کھانے کے بعد سادی نے کہا۔

الہی بخش ہاتھ دھو کر واپس آیا تو ویٹر آچکا تھا اور برتن سمیٹ رہا تھا۔ اب کافی لے آؤ پلیز۔ سادی نے اس سے کہا۔

الہی بخش اپنی جگہ بیٹھ گیا تو سادی نے اس سے کہا۔ اب ہم باتیں کریں گے۔ میں تمہارے جواب کی منتظر ہوں۔

سادی۔ آپ مجھے بلند دیکھنا چاہتی ہیں میرے متعلق اپنائیت سے سوچتی ہیں مجھے اس پر فخر ہے۔ الہی بخش نے گہری سانس لے کر کہا۔ آپ چاہتی ہیں کہ جو مجھے حقیر سمجھتے ہیں وہ بھی میری عزت کریں۔ جبکہ میرا ایمان ہے کہ عزت دینے والا اللہ ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس نے مجھے میری اوقات سے زیادہ عزت دی ہے۔ جہاں تک بلند مقام کا تعلق ہے تو آپ دنیاوی مقام کی اور اس سے مختلف زندگی کی بات کرتی ہیں۔ میرے نزدیک اہمیت اس طویل زندگی میں بلند مقام حاصل کرنے کی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگی۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ میں اس میں بھی کوئی بلند مقام حاصل نہیں کر سکوں گا۔ مجھ میں ایسا کوئی وصف نہیں، کوئی خوبی نہیں، میرا کوئی عمل بھی ایسا نہیں، طرز زندگی بھی ایسا نہیں اور اس دنیا کی زندگی میں میں جو کچھ بھی ہوں، اس حیثیت میں میں

بہت خوش رہا ہوں۔ خوش اور مطمئن۔ یہی سب سے بڑی بات ہے۔ آپ چاہتی ہیں کہ میں پنا لباس' زبان سہن بدلوں اور یہیں رہ جاؤں۔ تو سادی میں اپنی اصل سے ناتا توڑنے والا نہیں۔ میں اپنے گھر سے اپنی زمین سے روٹھ کر آیا ہوں۔ مگر مجھے وہیں جانا ہے۔ وہاں رہنے کے لئے میرا رنگ سازی کا اور ڈرائیونگ کا ہنر کافی ہے۔ وہاں کلرک کا کوئی مستقبل نہیں۔ میں تو مٹی سے اٹھنے والا آدمی ہوں' جسے آسمان کی چاہت تو ہو سکتی ہے لیکن اس تک پہنچنے کی خواہش نہیں ہو سکتی۔ میں جہاں ہوں وہیں ٹھیک ہوں سادی۔

سادی اس کی باتیں بڑی افسردگی سے سن رہی تھی۔ پھر بھی آدمی کو آگے بڑھنے اور کچھ کرنے کی لگن تو ہونی چاہیے۔

یہ لگن مجھ میں ہے سادی لیکن میری منزل یہ دنیا نہیں' وہ دنیا ہے اور مجھے یہ معلوم نہیں کہ اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے۔ یہی میرا دکھ ہے۔

لیکن جتنا عرصہ اللہ نے مقرر کر دیا ہے وہ اس دنیا میں گزارنا ہے اور اس دنیا کا تعلق بھی اس دنیا سے ہے۔

یہی تو میں بھی کہتا ہوں۔ الٰہی بخش نے رو رو کر کہا۔ اس دنیا میں یہاں کی دولت' مرتبہ اور مقام تو کام نہیں آئے گا۔ فکر تو ہمیں کچھ اور کرنی چاہیے۔

سادی لاجواب ہو گئی۔ ویٹر کافی لے آیا تھا۔ سادی نے کافی بنائی اور ایک پیالی الٰہی بخش کی طرف بڑھا دی۔

سادی آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں نا۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ مجھ سے کبھی ناراض ہوں۔

میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہوں گی الٰہی بخش مجھے افسوس ہے کہ تم نے میری خواہش رد کر دی لیکن مجھے خوشی ہے کہ زندگی کے بارے میں تمہارا ایک پختہ نظریہ ہے ورتم اس سلسلے میں بہت پر اعتماد ہو۔ ایسے لگتے تو نہیں تھے تم۔ یقین کرو میری نظروں میں تم اور بڑے ہو گئے ہو۔

دیکھیں ساوی میں یک اور آسان طریقے سے آپ کو سمجھاتا ہوں۔ آپ مجھ سے کہیں کہ میں پنا نام بدل دوں تو کیا یہ ممکن ہے؟ یہ تو ماں باپ کی دی ہوئی چیز ہے میری شناخت ہے۔ میں کسی شہری لڑکی سے شادی کروں تو وہ مجھے اس نام سے پکارتے ہوئے شرمندہ نہیں ہوگی؟ لیکن مجھے اپنے نام سے شرمندگی نہیں ہوتی۔ میں کسی کی خاطر پنی اصل تو نہیں بدل سکتا۔

ٹھیک کہتے ہو۔

ب میں آپ سے کہتا ہوں ساوی۔ کہ آپ خود کو دیہاتی بنائیں۔ کسی گاؤں میں جا کر رہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہاں کی عورتوں کی طرح جو کام وہاں عورتیں کرتی ہیں۔ آپ بھی کریں، پنا لباس، پنا رہن سہن، اپنا طرز زندگی وہاں کا کر لیں تو کیا یہ ممکن ہے؟

تم یقین نہیں کرو گے میں ایسا کر سکتی ہوں۔ ساوی نے پر زور لہجے میں کہا۔ لیکن میں یہ فقیہ نہیں۔ مجھے ایسا کرنے نہیں دیا جائے گا اور پھر آدمی نیچے سے اوپر جانے کی کوشش تو کر سکتا ہے؟ وپر سے نیچے کون آئے گا؟

یہ وپر ور نیچے کا تصور بھی اپنا اپنا ہے، اور اوپر سے نیچے آنا آسان ہوتا ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ ساوی کہ جو جہاں ہے وہیں کے لئے ہیں اور وہیں ٹھیک ہے۔

ٹھیک ہے الٰہی بخش۔

ہیرا نگل رکھا کر گیا تھا۔ ساوی نے طشتری پر سو کا ایک نوٹ رکھ دیا۔ آؤ چلیں۔

☆—————————☆—————————☆

س دن کے بعد ساوی بالکل بدل کر رہ گئی۔

اہی بخش محسوس کرتا تھا کہ تبدیلی اس میں بھی آئی ہے لیکن ساوی تو وہ پہلے والی ساوی نہیں رہی تھی۔ یہ نہیں کہ اس کے رویے میں کوئی تبدیلی آئی ہو۔ گاڑی میں وہ اب بھی اسی کونے میں بیٹھتی تھی۔ اس کا چہرہ دیکھنے کے لیے الہی بخش کو صرف عقب نما کی طرف نظر اٹھانا پڑتی تھی لیکن اب عقب نما میں اسے مختلف منظر دیکھنے کو ملتا تھا۔ ے کسی گہری سوچ میں ڈوبی ساوی نظر آتی۔ اس کی پیشانی پر سوچ کی لکیریں مستقل ہو گئی تھیں۔ وہ پنی عمر سے بڑی لگنے لگی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اب وہ بہت کم سخن ہو گئی تھی۔ ان کے درمیان بات کم ہی ہوتی تھی۔

پھر نہی دنوں بیگم صاحب شیخ صاحب سے ناراض ہو کر اپنی والدہ کے گھر چلی گئیں۔ ان دنوں ساوی یوں شرمسار نظر آتی تھی جیسے اس میں اسی کا قصور ہو ورنہ تو ورنظیر ہو بھی وہاں رہے گا۔ دس بارہ دن بعد شیخ صاحب انہیں لے آئے لیکن گھر کی فضا پہلے جیسی نہیں ہوئی۔ دھر ساوی کے امتحان سر پر آ گئے تھے۔ وہ ان کی تیاری میں بھی مصروف ہو گئی تھی۔

امتحان کے بعد چھٹیاں ہو گئیں۔ کالج جانا موقوف ہوا۔ ایک ہفتہ گزرتے گزرتے اہی بخش کو بے کاری کا احساس ستانے لگا۔ مگر پھر ایک دن صبح دس بجے ساوی باہر آئی۔ اہی

بخش اس وقت باغیچے میں کرمو کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ساری نے اشارے سے

سے بلایا۔

الٰہی بخش لپک کر اس کے پاس گیا۔جی ساری بی بی

کوئی مصروفیت تو نہیں؟

میں تو بے کار بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا ہوں؟

تو گاڑی نکالو۔مجھے اپنے ایک دوست سے ملنے جانا ہے۔

ابھی آیا ساری بی بی

تم گاڑی صاف کرو۔مجھے تیاری میں آدھا گھنٹہ لگے گا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ باہر آئی تو بہت اچھی لگ رہی تھی۔الٰہی بخش نے اس کے لئے دروازہ کھولا اور پھر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔کہاں چلنا ہے ساری بی بی۔

ناظم آباد۔

الٰہی بخش اب تک راستوں اور علاقوں سے واقف ہو چکا تھا۔اسے ساری کی ہدایت کی ضرورت نہیں تھی۔

دو سال بعد میں اس دوست سے مل رہی ہوں۔ساری نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

الٰہی بخش نے سر اٹھا کر عقب میں دیکھا۔وہ اپنے مخصوص کونے میں بیٹھی تھی۔اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔

شاہد نام ہے اس کا بہت اچھا لڑکا ہے۔کل اس نے فون کیا تھا میں نے سوچا آج کل فرصت ہے مل ہی لوں۔

الٰہی بخش کو عجیب سا لگا لڑکی کا دوست لڑکا' وہ جہاں کا تھا' وہاں لڑکی اور لڑکے کے

درمیاں کوئی تعلق نہیں ہوتا تھا۔۔۔۔۔سوائے محبت کے اور اس صورت میں وہ چھپ چھپ کر ملتے تھے۔دوستی تو لڑکوں کی لڑکوں سے اور لڑکیوں کی لڑکیوں سے ہوتی ہے۔

اس نے خود کو وہ سمجھایا جو کبھی سادی کو سمجھایا تھا جو جہاں ہے وہیں کے مطابق ہے۔ وہیں کے سے ہے وہ وہیں ٹھیک ہے۔شہر میں ایسا ہی ہوتا ہوگا۔

چونکہ اس کے دل میں پھانس سی چبھی۔کون جانے' سادی اس لڑکے شاہد سے محبت کرتی ہو۔یہاں عام دوستی کا ضرور ہوتا ہوگا لیکن لڑکے اور لڑکی میں تو ایک دوسرے کے سے یک خاص کشش ہوتی ہے۔کہا کچھ بھی جائے۔۔۔۔۔۔۔۔

ایسا ہے بھی تو تجھے کیا؟ اس نے خود کو ڈپٹ دیا۔تو اپنا کام کیے جا۔سادی سے بے طلب محبت کرتا رہ۔اسے خوش کرنے کی کوشش کر۔

یہاں سے دائیں جانب لے لو الہیٰ بخش' سادی نے کہا۔

وہ ناظم آباد پہنچ چکے تھے۔اب سادی ہدایات دے رہی تھی۔ذرا دیر بعد اس نے یک بنگلے کے سامنے گاڑی رکوا دی۔اب تم واپس چلے جاؤ۔سادی نے اترتے ہوئے کہا۔ چار بجے مجھے لینے کے لئے آ جانا۔یہ بیل دے دینا۔اس نے بٹن کی طرف شارہ کیا۔

بہت بہتر سادی بی بی

سادی نے بٹن پر انگلی رکھ دی تھی۔الہیٰ بخش نے گاڑی آگے بڑھا دی۔اس کے دل میں سادی کی آرزو نہیں تھی کوئی طلب نہیں تھی لیکن وہ اس شاہد کو دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

☆۔۔۔۔۔۔۔☆۔۔۔۔۔۔۔۔☆

ٹھیک چار بجے الہیٰ بخش وہی بٹن دبا رہا تھا۔

چند لمحے بعد یک خوش پوش اور خوش شکل جوان لڑکے نے گیٹ کھولا۔اسے دیکھتے ہی

الہی بخش کے دل میں رقابت کی ایک تند لہر اٹھی۔

سعدیہ کو لینے آئے ہو؟ لڑکے نے پوچھا۔

جی ہاں

بس آتی ہے وہ۔ یہ کہہ کر لڑکا اندر چلا گیا۔

الہی بخش کو احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ اس سے اپنا موازنہ کر رہا ہے۔ احساس ہوا تو اس نے خود کو روکا۔ اس کا اس سے کیا جوڑ۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کئی لمحے سادی باہر آ گئی۔ لڑکا ساتھ ہی آیا تھا۔ اچھا شاہد خدا حافظ۔

الہی بخش نے سادی کے لئے پچھلا دروازہ کھول دیا تھا۔ خدا حافظ سعدیہ۔ لڑکے نے کہا۔ پھر کب آؤ گی۔؟

جب موقع ملا۔ سادی نے مسکراتے ہوئے کہا اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔

راستے میں سادی نے پوچھا۔ امی نے تم سے کچھ پوچھا تو نہیں تھا۔؟

جی نہیں۔ الہی بخش نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

جب بھی پوچھیں تو کہنا نورین کہاں گئی ہوں۔ شاہد کا نام نہ لینا

کیوں سادی بی بی۔ الہی بخش نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھ بیٹھا۔

خواہ مخواہ جھک جھک کریں گی امی۔

ماں باپ سے پوچھے بغیر کسی سے ملنا تو بری بات ہے سادی بی بی۔

ہاں بری بات تو ہے لیکن پوچھوں تو اجازت نہیں ملے گی۔

الہی بخش چپ ہو گیا لیکن اسے دلی تکلیف ہوئی۔ وہ سادی کو بہت اچھا، بہت ہمدرد دیکھنا چاہتا تھا۔

سے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کے لئے اذیت ناک وقت شروع ہو گیا ہے۔ ساوی تقریباً ہر ہفتے شاہد کے ہاں جانے لگی تھی۔ ادھر الٰہی بخش کے خود سے مباحثے شروع ہو گئے تھے وہ خود کو سمجھاتا کہ یہ عشق کی آزمائش ہے اور اسے کیا لینا۔ ساوی اس کے لئے تو نہیں ہے۔ یہ اس کی قربت' ایک التفات کی نظر' کوئی میٹھی بات۔ یہ تو اس کے حسنات ہیں' جن کا وہ کبھی صلہ نہیں دے سکتا۔ وہ بس عشق کر سکتا ہے اس سے۔۔۔۔ ور کئے جائے گا۔

وہ پانچواں یا چھٹا موقع تھا کہ وہ اسے گھر واپس لے جانے کے لئے آیا تھا۔ اس روز ساوی کیسی باہر نکلی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور وہ روہانسی لگ رہی تھی۔

الٰہی بخش چاچا وگاڑی جلدی سے مجھے یہاں سے لے چلو۔

الٰہی بخش نے گاڑی سٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔ کیا بات ہے ساوی بی بی خیر تو ہے اس نے پرتشویش لہجے میں پوچھا۔

بس آئندہ میں یہاں نہیں آؤں گی۔

اس نے۔۔۔۔۔۔۔۔ اس نے مجھ سے بدتمیزی کی۔

الٰہی بخش کے وجود میں سناٹے تیر گئے۔ بلا ارادہ اس نے بریک پر دباؤ ڈالا اور گاڑی سائیڈ میں روک دی۔ کیا ہوا کیا کہا اس نے؟ اسے خود بھی اپنی آواز اجنبی لگی۔

آج گھر میں کوئی نہیں تھا۔ ساوی اس کی بدلتی کیفیت سے بے نیاز کہتی رہی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ اور۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ آگے اس سے کچھ نہیں کہا گیا۔

الٰہی بخش کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا۔ اس بار ساوی اس کی کیفیت سے بے خبر نہیں رہی۔ وہ سہم گئی۔

الٰہی بخش ادھر دیکھو۔

الٰہی بخش نے پلٹ کر اسے دیکھا جی سادی بی بی۔

تم کیا کر رہے ہو؟ گاڑی چلاؤ نا

نہیں سادی بی بی پہلے اسے بد تمیزی کی سزا دوں گا۔الٰہی بخش نے دروازہ کھول لیا۔

تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔سادی نے سخت لہجے میں کہا۔نہ آج نہ آئندہ کبھی نہ شاہد کے ساتھ ورنہ کسی اور کے ساتھ۔

لیکن اس نے آپ سے بد تمیزی کی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔

غلطی میری ہے میں ہی اس سے ملنے آئی تھی

پھر بھی۔۔۔۔۔۔۔اسے حق نہیں پہنچتا کہ۔۔۔۔۔۔۔۔

الٰہی بخش تم میری بات نہیں مانو گے۔

الٰہی بخش نے بے بسی سے اسے دیکھا۔سادی بی بی۔۔۔۔۔

بس میں جو کہہ رہی ہوں۔میری وجہ سے تم کبھی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھاؤ گے۔ورنہ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔

الٰہی بخش کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔اس نے خاموشی سے انجن سٹارٹ کیا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

الٰہی بخش کو یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ اب سادی شاہد کے گھر کبھی نہیں جائے گی۔اس واقعے کے تین ہفتے بعد اچانک سادی نے پھر اس سے گاڑی نکالنے کا کہا۔

گاڑی گیٹ سے نکالنے کے بعد الٰہی بخش نے پوچھا۔کہاں جائیں گی سادی بی بی؟

ناظم آباد شاہد کے گھر۔

ہاں ------- میں نے فیصلہ تو یہی کیا تھا لیکن اس نے فون پر تی معافیں مانگیں، تھا گڑگڑایا میں کیا کرتی؟ میں بھی تو اسے پسند کرتی ہوں۔

اس اظہارِ پسندیدگی کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ پھر بھی الٰہی بخش نے کہا اس نے آپ سے بدتمیزی کی تھی۔

وہ کوئی اتنی بڑی بات بھی نہیں تھی۔ مجھے غصہ اس بات پر آیا کہ اس نے میری مرضی کے بغیر مجھے چھوا۔

تو چھو لینا بڑی بات نہیں۔ الٰہی بخش کا دل برا ہونے لگا۔ مگر فوراً ہی تکدر دور بھی ہو گیا۔ ساوی نے جو بات کی تھی وہ کوئی خراب، بگڑی ہوئی لڑکی ہی کر سکتی تھی۔ مگر وہ جیسی بھی تھی۔ اسے تو اس سے محبت کرنا تھی اور اچھوں سے محبت کرنا تو کچھ مشکل بھی نہیں ہوتا۔

وہ ساوی کو واپس لینے گیا تو ساوی بہت اداس تھی لیکن وجہ نہ اس نے بتائی نہ الٰہی بخش نے پوچھی۔ الٰہی بخش عشق میں سراپا تسلیم ہونے کے مرحلے سے گزر رہا تھا۔

☆------------☆------------☆

امتحان کا نتیجہ نکل آیا تھا۔ ساوی نے فرسٹ ڈویژن لی تھی۔ اس کا داخلہ یونیورسٹی میں ہو گیا۔ اب الٰہی بخش اسے لانے لے جانے کے لیے یونیورسٹی جاتا تھا۔ یونیورسٹی اتنی بڑی تھی جیسے پوری دنیا ہو اور الٰہی بخش کو وہ بہت مختلف دنیا لگی۔ وہاں کا ماحول بہت آزاد تھا۔ لڑکے لڑکیاں بے حجابانہ ساتھ گھومتے تھے۔ بے فکری سے گھاس پر بیٹھے یا کینٹین میں کھاتے پیتے نظر آتے۔

الٰہی بخش کا دل اور بوجھل ہونے لگا۔

یونیورسٹی میں یک بس اسٹاپ تھا جہاں پتھر کی بنچیں تھیں ۔ بس کا انتظار کرنے والے تو وہاں کم ہی بیٹھے تھے لیکن ہر وقت وہاں دو تین جوڑے بیٹھے گپ شپ کرتے نظر آتے ۔ یونیورسٹی میں یک اور بات کالج سے مختلف تھی ۔ کالج کی طرح وہاں مقررہ وقت پر چھٹی نہیں ہوتی تھی ۔ کسی دن تین بجے کسی دن ایک بجے اور کسی دن گیارہ بجے ہی چھٹی ہو جاتی ۔ سادی ہر روز اسے وقت بتاتی کہ کب اسے لینے آنا ہے اور جگہ اس نے بس شاپ ہی مقرر کی تھی ۔

ابتدا میں الہی بخش نے محسوس کیا کہ سادی یونیورسٹی میں خود کو اجنبی محسوس کرتی ہے ۔ وہ سہمی سہمی نظر آتی ۔ اس کی چال میں بھی اعتماد نہ ہوتا ۔ الہی بخش اس بات کو سمجھ سکتا تھا ۔ وہ پہلی بار کراچی آیا تھا تو اس کا بھی یہی حال تھا ۔ سادی بھی جیسے کالج کے گاؤں سے یک دم یونیورسٹی کے شہر میں آ گئی تھی ۔ ایک ہفتے میں اس نے چند لڑکیوں سے دوستی کر لی ۔ کبھی کبھی اس کی کوئی سہیلی بھی گاڑی میں اس کے ساتھ ہی بیٹھ جاتی ----- اور رستے میں کہیں اتر جاتی ۔

دو مہینے ہو گئے تو سادی کے اندر اعتماد آ گیا ۔ پھر ایک دن الہی بخش اسے لینے پہنچا تو بس شاپ پر سادی کو ایک لڑکے کے ساتھ بیٹھے دیکھا ۔ دونوں قریب بیٹھے بڑی بے تکلفی سے یک دوسرے سے بات کر رہے تھے ۔

گاڑی رکی تو سادی اٹھ کھڑی ہوئی ۔ آؤ ریاض تمہیں میں راستے میں ڈراپ کر دوں گی ۔

نہیں سادی شکریہ ۔ مجھے کسی سے ملنا ہے ۔ لڑکے نے کہا ۔

چھ خدا حافظ ۔ کل ملیں گے ۔ سادی نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا ۔

چار پانچ دن بعد الٰہی بخش کو لگا کہ زندگی کی رفتار بہت تیز دوڑ رہی تھی۔ اس روز وہ یک ور لڑکے کے ساتھ بیٹھی ملی۔ اس لڑکے کا نام عمر تھا۔ چند روز بعد اس کی رشید سے دوستی ہوئی۔ ور اس کے بعد اس کے دوستوں کی تعداد اتنی تیزی سے بڑھنے لگی کہ الٰہی بخش کے لیے لڑکوں کے نام یاد رکھنا ممکن نہیں رہا لیکن اس دوران بھی وہ ہفتے پندرہ دن بعد شاہد سے ملنے ضرور جاتی تھی۔

چھ ماہ کے اندر سادی بالکل بدل کر رہ گئی لیکن اس کے دو معمول نہیں بدلے تھے۔ صبح وہ تیار ہو کر آتی تو سے گڈ مارننگ کہتی۔۔۔۔۔۔۔ اور گاڑی میں اسی مخصوص کونے میں بیٹھتی۔ الٰہی بخش کبھی عقب نما میں اسے دیکھتا تو دل مسوس کر رہ جاتا اس کے چہرے پر اب وہ پہلے والی تازگی اور رونق نہیں رہی۔ آنکھوں میں بھی چمک نہیں تھی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے تھے۔

الٰہی بخش کا یمان تھا کہ میلی نظروں سے چہروں کے گلاب مرجھا جاتے ہیں۔

پھر یک روز الٰہی بخش سادی کے بتائے ہوئے وقت پر اسے لینے پہنچا تو وہ موجود نہیں تھی۔ الٰہی بخش کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کرے۔ اس نے گاڑی یک طرف کچے میں لگادی ور یہ سوچ کر انتظار کرنے لگا کہ شاید چھٹی میں دیر ہو گئی ہے۔

پانچ منٹ بعد یک لڑکی اس طرف سے گزری۔ وہ سادی کی سہیلیوں میں سے یک تھی۔ الٰہی بخش کو اس کا نام تو معلوم نہیں تھی لیکن وہ اسے چہرے سے جانتا تھا۔

ے۔۔۔۔۔۔۔ تم سعدیہ کے ڈرائیور ہو؟ لڑکی نے پوچھا۔

جی ہاں۔

اس کا انتظار کر رہے ہو؟

جی۔

وہ تو جا چکی ہے۔

الٰہی بخش کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ آپ کیسے کہہ رہی ہیں؟

رے وہ میرے سامنے عمر کی موٹر سائیکل پر بیٹھ کر گئی ہے۔ آج اس نے کوئی کلاس ٹینڈ نہیں کی۔ وہ تو دس بجے ہی چلی گئی تھی۔

الٰہی بخش کو اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ مجھے تو انہوں نے اسی وقت بدیا تا۔ میں تو اس کا نتظار کروں گا جی۔

تمہاری مرضی، میں نے تمہیں بتا دیا۔ اب تم جانو۔ یہ کہہ کر لڑکی آگے بڑھ گئی۔

اس وقت سوا یک بجا تھا۔ ساری نے اس روز اسے ایک بجے بلایا تھا۔ الٰہی بخش کشمکش میں پھنس گیا۔ عقل کہتی تھی کہ ساری جا چکی ہے۔ اس کی سہیلی کو جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اسے واپس چلے جانا چاہیے۔ لیکن دل نہیں مانتا تھا۔ اسے یہیں انتظار کرنا چاہیے۔

اسی کشمکش میں تین بج گئے۔ جب ساری اسے ایک بجے بلاتی تھی، وہ کھانا کھا کر نہیں آتا تھا۔ بلکہ کھانا واپس جا کر کھاتا تھا۔ چنانچہ اس کا بھوک سے بھی برا حال ہو گیا۔ مگر وہ بھوک کی وجہ سے انتظار سے دستکش نہیں ہوا۔ البتہ تین بجے اسے یہ یقین ہو گیا کہ ساری واپس جا چکی ہے۔ بلکہ ممکن ہے، وہ گھر بھی پہنچ گئی ہو۔

بالآخر وہ واپس چل دیا۔

کار کو گیٹ میں داخل ہوتا دیکھتے ہی کرمو بیگم صاحب کو اطلاع دینے کے لیے لپکا۔ بیگم صاحب نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ گاڑی آتے ہی انہیں مطلع کرے۔

الہی بخش نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی اور باہر آیا۔ اسی وقت بیگم صاحب باہر آ گئیں۔ سادی کو ساتھ نہیں لائے؟

الہی بخش جواب دینے ہی والا تھا کہ بیگم صاحب نے مزید کہا۔ تمہارے جانے کے دو منٹ بعد سادی نے فون کیا تھا کہ ایک اضافی پیریڈ کی وجہ سے دیر ہو جائے گی۔ ممکن ہے چار بج جائیں۔ تم نکل چکے تھے۔ تمہیں کیسے بتایا جا سکتا تھا لیکن اتنا انتظار کیا اور پھر بھی تم سادی کو بے بغیر چلے آئے۔؟ ان کا لہجہ سخت ہو گیا۔

الہی بخش سنائے میں آ گیا۔ پھر بھی وہ بہت تیزی سے سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سادی کی ٹیچر نے بتایا تھا کہ وہ دس بجے عمر کے ساتھ چلی گئی تھی اور وہ اب تک گھر نہیں پہنچی تھی۔ بیگم صاحب کا کہنا تھا کہ سادی نے ساڑھے بارہ بجے فون کر کے بتایا تھا کہ اسے یونیورسٹی میں دیر ہو جائے گی۔ اب وہ بیگم صاحب کو اصل بات تو نہیں بتا سکتا تھا۔

بولتے کیوں نہیں؟ جواب دو۔ بیگم صاحب کے سخت لہجے نے اسے چونکا دیا۔

مجھے تو معلوم نہیں تھا بیگم صاحب۔ پھر بھی میں نے تین بجے تک بی بی کا انتظار کیا۔

تمہیں نہیں معلوم تھا تو تمہیں قیامت تک اس کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔

الہی بخش کہنا چاہتا تھا کہ اس صورت میں تو اسے رات یونیورسٹی میں ہی گزارنا پڑتی لیکن اس نے یہ بات کہی نہیں۔ غلطی ہو گئی بیگم صاحب۔ اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

اب تو بیگم صاحب برس پڑیں۔ یہ غلطی نہیں غیر ذمہ داری ہے اور غیر ذمہ داری حرام خوری ہوتی ہے۔ ان کے لہجے میں بلا کی نفرت تھی۔

اسی لمحے سادی بھی آ گئی۔

مگر بیگم صاحبہ اس کی موجودگی سے بے خبر اپنی کہتی رہیں۔ اور کیوں نہ کرو حرام خوری۔ بے وقوف جو مل گئے ہیں۔ تمہیں۔ دن میں دو بار ڈرائیو کرتے ہو اور تین بار مفت کی روٹیاں توڑتے ہو۔ رہنے کو ٹھکانہ میسر ہے۔ تنخواہ بڑے سرکاری افسروں کی لیتے ہو۔ حرام منہ کو لگے گا تو حرام خوری تو ہوگی۔۔۔۔۔۔

سعدی اس دوران تین بار ماں کو پکار چکی تھی۔ اب اس نے ماں کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ بس کریں امی۔ آپ ناجائز اسے برا بھلا کہہ رہی ہیں۔ اس نے نظریں اٹھا کر الٰہی بخش کو دیکھا جس کا چہرہ وست گیا تھا۔ اس میں الٰہی بخش کی تو کوئی غلطی نہیں۔

غلطی کیسے نہیں۔ اسے وہیں تمہارا انتظار کرنا چاہیے تھا۔

اس صورت میں، میں گھبرا جاتی اور یہ وہیں بیٹھا انتظار کرتا رہتا۔ پھر کیا ہم سے لینے کے لئے کسی کو بھیجتے؟

بیگم صاحبہ لاجواب ہو گئیں لیکن وہ ہار ماننے والی نہیں تھیں۔ ہاں ایسا ہی ہوتا اور یہی بہتر تھا۔ وہ الٰہی بخش کی طرف مڑیں۔ تمہیں احساس نہیں کہ میرے شوہر نے تمہیں میری بیٹی کی ذمہ داری سونپی ہے اور یہ بڑی ذمہ داری ہے۔

کیسی ذمہ داری۔ الٰہی بخش نے سوچا۔ میں تو اسے غلط راستے پر جانے سے روک بھی نہیں سکتا لیکن اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔

امی آپ بلاوجہ اسے برا بھلا کہہ رہی ہیں۔

اس بار سعدی نے سخت لہجے میں کہا۔ میں نے آپ کو فون کیا تھا اور مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ الٰہی بخش گاڑی لے کر نکل چکا ہے۔ میں نے آپ سے کہہ دیا تھا کہ اب میں بچے

طور پر آجاؤں گی۔ الٰہی بخش نے تو بس یہ غلطی کی کہ تین بجے تک میرا انتظار کرتا رہا۔

ہاں آنا تھا تو پہلے ہی آجاتا۔

ب میں آپ کے سامنے اسے کہہ رہی ہوں کہ مقررہ وقت پر میں نہ ملوں تو صرف پندرہ منٹ میرا انتظار کرے۔ پھر گاڑی لے کر چلا آئے۔ ساوی ہی بخش کی طرف متوجہ ہوئی۔ تم نے کھانا بھی نہیں کھایا ہوگا؟

نہیں جی ساوی بی بی مجھے بھوک ہے بھی نہیں۔

بیگم صاحب پاؤں پٹختی ہوئی اندر چلی گئیں۔ ساوی نے کہا تم کھانا نہیں کھاؤ گے تو میں سمجھوں گی کہ مجھ سے ناراض ہو۔

میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ میں آپ سے ناراض ہو ہی نہیں سکتا۔

خیر دیکھیں گے۔ ساوی نے بے نیازی سے کہا لیکن کھانا تمہیں کھانا پڑے گا۔

میں جمیلہ کے ہاتھ کھانا بھجوا رہی ہوں۔

بہت شکریہ بی بی۔ الٰہی بخش نے کہا اور اپنے کوارٹر کی طرف چل دیا۔

☆--------------☆------------☆

ہر آنے والا دن گزرے ہوئے دن سے زیادہ اذیت ناک تھا۔

ہر تیسرے چوتھے دن وہ خالی گاڑی لے کر واپس آتا۔ ساوی کبھی عمر کے، کبھی جمیل کے اور کبھی کسی کے ساتھ جا چکی ہوتی۔ گھر میں وہ یہی کہتی کہ اضافی پیریڈ کی وجہ سے دیر ہو گئی یا لائبریری میں مطالعہ کر رہی تھی۔ الٰہی بخش اذیت میں تھا کہ ساوی غلط راستے پر جا رہی ہے اور وہ محض تماشائی بنا سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ عشق کا بھی تو کچھ فرض ہوتا ہے۔ عشق اپنے محبوب کو تباہ ہوتے دیکھنے کا تو نام نہیں۔

ایک روز الہی بخش نے سادی سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یونیورسٹی لے جاتے ہوئے اس نے عقب نما میں سادی کو دیکھا جو کسی سوچ میں گم تھی۔ سادی بی بی آپ کو یاد ہے آپ نے مجھے اختیار دیا تھا کہ میں غلط بات پر آپ کو ٹوک سکتا ہوں؟

سادی نے چونک کر عقب نما میں اسے دیکھا ہاں مجھے یاد ہے۔

وہ حق اب بھی میرے پاس ہے؟

کیوں نہیں ہوگا

میں نے سوچا ممکن ہے آپ نے چپکے سے وہ حق مجھ سے واپس لے لیا ہو۔

یہ کیوں سوچا تم نے؟

آپ بہت بدل گئی ہیں سادی بی بی میں آپ کو ٹوکنا چاہتا ہوں کیونکہ آپ غلط راستے پر جا رہی ہیں۔

میں سمجھی نہیں۔

یہ لڑکوں کے ساتھ دوستی، ان کے ساتھ جانا، پڑھائی چھوڑ دینا، یہ سب غلط ہے۔ آپ کے لئے نقصان دہ ہے

سادی نے چونک کر اسے دیکھا تمہیں کیسے معلوم ہوا؟

الہی بخش کی نظریں جھک گئیں۔ میں نے کبھی کسی سے نہیں پوچھا۔ ہر بار کوئی نہ کوئی بتا دیتا ہے؟

سنا تو تم نے سچ ہے۔ سادی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ لیکن اس میں حرج کیا ہے؟

بدنامی بھی ہوتی ہے اور عزت بھی کم ہو جاتی ہے۔ لڑکیوں کی عزت تو کانچ کے برتن کی طرح ہوتی ہے۔

تو تمہاری نظروں میں میری عزت کم ہو گئی ۔۔۔۔۔۔ یا بالکل ہی ختم ہو گئی ؟ ساوی نے عتاب نما ئیں اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میری محبت اور ہے ساوی بی بی میرے لئے تو آپ اب بھی پہلے جیسی ہیں اور ہمیشہ ایسی ہی رہیں گی ۔ بلند اور پاکیزہ ۔ میں دنیا کی بات کر رہا ہوں ۔ پھر آدمی محبت تو بس ایک ہی آدمی سے کرتا ہے ۔ ایک وقت میں اتنے لوگوں سے محبت نہیں ہو سکتی ۔ تو میں ان سب سے محبت تو نہیں کرتی ، محبت تو مجھے بھی بس ایک ہی شخص سے ہے ۔۔۔۔ اور ہمیشہ رہے گی البتہ دوستی میں میں حرج نہیں سمجھتی ۔

الہی بخش کو یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کون ہے ۔ وہ جانتا تھا کہ شاہد کی بدتمیزی کے باوجود ساوی نے اسے سے ملنا نہیں چھوڑا ہے ۔

الہی بخش جو کچھ کہنا چاہتا تھا اس میں اسے حجاب آ رہا تھا لیکن وہ کہنا بھی ضروری تھا ۔ ساوی بی بی مرد اور عورت کے درمیان دوستی ممکن نہیں ۔ صرف ایک ہی رشتہ یا تعلق ہو سکتا ہے ۔ غلط طریقے سے ہو یا صحیح طریقے سے ۔

میں بہت پریشان اور دکھی ہوں الہی بخش امی اور پاپا کی زندگی میرے سامنے ہے اور میں ویسی زندگی نہیں گزارنا چاہتی ۔ میں اپنی زندگی کا فیصلہ امی اور پاپا پر نہیں چھوڑ سکتی ۔ وہ تو اپنے لئے بھی درست فیصلہ نہیں کر سکے ۔ الہی بخش یہ درست ہے کہ میں کسی سے محبت کرتی ہوں بلکہ ۔۔۔۔۔۔۔ وہ کہتے کہتے رکی ۔

الہی بخش میں نے ایک بات سمجھ لی ہے ۔ شادی اپنے اختیار میں ہوتی ہے ، محبت نہیں ۔ مجھے جس سے محبت ہوئی میں جانتی ہوں کہ اس کے ساتھ میری شادی کامیاب نہیں ہو سکتی ۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اس کی محبت کو دل سے نکال پھینکتی لیکن اس پر میر

حقیقت نہیں۔ اب میں اتنے لڑکوں سے دوستی کرتی ہوں تو انہیں پرکھنے کے لیے۔ شاید کوئی ایسا مل جائے جو مجھے سمجھ سکے اور جسے میں سمجھ سکوں۔ ایسے شخص کے ساتھ محبت کے بغیر بھی زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ بس یہی جستجو ہے میری۔

آپ نے جو بات سمجھی وہ بھی پوری نہیں سمجھی سادی بی بی۔ الٰہی بخش نے کہا۔ انسان کا حقیقی رنہ محبت پر ہے نہ شادی پر۔ جوڑے تو اوپر آسمانوں پر طے ہوتے ہیں اور لڑکوں سے ملنے میں یہ برائی ہے کہ کسی بھی وقت کوئی آپ کے ساتھ بدتمیزی کر سکتا ہے۔ آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ سادی بی بی۔

تم اس کی فکر نہ کرو۔ سادی نے سرد لہجے میں کہا۔ تم جسے بدتمیزی کہتے ہو وہ کوئی بڑی بات نہیں۔ تھوڑا بہت تعلق تو کسی سے بھی رکھا جا سکتا ہے۔ اس سے عزت پر تو کوئی حرف نہیں آتا۔

اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ الٰہی بخش خاموش ہو گیا۔

اس رات الٰہی بخش کو بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔ وہ سادی کے بارے میں سوچتا رہا۔ سادی کے الفاظ اس کی سماعت میں گونجتے رہے۔ تم جسے بدتمیزی کہتے ہو وہ کوئی بڑی بات نہیں۔ تھوڑا بہت تعلق تو کسی سے بھی رکھا جا سکتا ہے۔ اس سے عزت پر تو کوئی حرف نہیں آتا۔

یہ کیا ہو گیا ہے سادی کو؟ وہ سوچتا رہا۔ اسے عزت اور آبرو کے فرق کا احساس نہیں رہا۔ وہ کن گہرائیوں میں گرتی جا رہی ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کس حد تک گر چکی ہے؟ وہ اسے روک بھی تو نہیں سکتا۔ اس کے پاس کوئی اختیار نہیں۔ وہ بے بس اس کے لیے دعا کر سکتا تھا۔

مسلسل دعا۔

اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ وہاں سادی کا مقام اور مرتبہ اب بھی وہی تھا۔ اس میں رتی بھر فرق نہیں پڑا تھا۔ یہاں تو عشق ہے۔ اس کے دل میں کسی نے کہا۔ عشق کی عزت غیر مشروط ہوتی ہے۔ اس کے عمل اور کردار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس میں صرف خوبیاں اور حسن یاد رکھے جاتے ہیں۔

اس کے بعد اس کے وجود میں عجیب سی طمانیت اتر آئی۔ وہ بے فکر اور پھر بے خود ہو گیا۔

بہت عرصے کے بعد اس رات سادی پہلے کی طرح اس کے پاس آئی اور وہ دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ قربت کیسی کثافت پیدا کرتی ہے اور دوری میں کتنی لطافت اور سرشاری ہوتی ہے۔

وہ عشق کے عین کو سمجھنے کے مرحلے میں داخل ہو رہا تھا۔

☆————————☆————————☆

پھر ایک دن الہی بخش کے لئے واپسی کا حکم ہو گیا۔

سادی کے معمولات اب بھی وہی تھے۔ ہفتے میں دو بار الہی بخش یونیورسٹی سے خالی گاڑی لاتا تھا۔ مگر اس کی نوبت ختم ہو گئی تھی۔ اب وہ راضی برضا تھا۔ شاید اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے بدلے اسے سکون آ گیا تھا۔

وہ اتوار کا دن تھا۔ شیخ صاحب بھی گھر پر تھے۔ گھر کے سب لوگ کسی تقریب میں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ شام کے وقت کرم الہی بخش کے کوارٹر میں آیا۔ بیگم صاحبہ تمہیں اندر بلا رہی ہیں بیٹے۔

الہی بخش اندر چلا گیا۔ بیگم صاحبہ اپنے کمرے میں تھیں۔ وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی

تیاری کر رہی تھیں۔ زیورات کے کئی سیٹ مسہری پر بکھرے ہوئے تھے۔ الٰہی بخش دستک دے کر کمرے میں گیا تو انہوں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ آؤ الٰہی بخش ایک کام ہے تم سے۔

حکم کریں بیگم صاحبہ

پھول والوں کی دکان دیکھی ہے تم نے؟

جی بیگم صاحبہ

وہاں سے گجرے اور پھول لانے ہیں۔ انہوں نے تفصیل سے اسے سمجھایا اور پرس میں سے دو سو روپے نکال کر اسے دیے۔

ابھی لایا بیگم صاحبہ

الٰہی بخش پھول لینے چلا گیا۔ واپس آیا تو گھر کی فضا بدلی ہوئی تھی۔ گھر میں قدم رکھتے ہی اسے اس بات کا احساس ہو گیا۔ بیگم صاحبہ کے کمرے سے اونچی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس نے بیگم صاحبہ کے کمرے کے دروازے پر دستک دی اور اندر چلا گیا۔

اندر گھستے ہی اس کے احساس کی تصدیق ہو گئی۔ کمرے میں تمام نوکر اور تمام گھر کے لوگ موجود تھے۔ نوکروں کے چہرے تنے ہوئے تھے اور مالکوں کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔

میں پھول لے آیا بیگم صاحبہ۔ الٰہی بخش نے کہا۔

وہ انگوٹھی کا کیا کیا؟

کون سی انگوٹھی بیگم صاحبہ

وہی جو تم مسہری پر سے اٹھا لے گئے تھے۔

ب الٰہی بخش کا چہرہ بھی تمتا اٹھا۔ میں تو مسہری کے قریب گیا بھی نہیں تھا۔ اس نے حتجاج کیا۔ ہاں دیکھا تھا کہ آپ کے زیورات مسہری پر بکھرے ہوئے ہیں۔

خود سے بتا دو تو اچھا ہے ورنہ میں پولیس میں رپورٹ کردوں گی۔ وہ سچ اگلوا جانتے ہیں۔

بیگم صاحب آپ مجھے چور سمجھتی ہیں۔ الٰہی بخش کے لہجے میں حیرت اور دکھ تھا۔ میں تو شروع ہی سے تمہیں چور اور بے ایمان سمجھتی ہوں۔

تو پھر آپ کو مجھے ملازم رکھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔

میں نے تو نہیں رکھا تمہیں شیخ صاحب کو بھی منع کیا تھا۔

بس تو اب آپ مجھے پولیس کے حوالے کر دیں۔ جو میں نے کیا نہیں وہ تو میں موت کے فرشتے کے سامنے بھی تسلیم نہیں کروں گا۔ الٰہی بخش نے کہا اور کمرے میں موجود یک یک چہرے کو غور سے دیکھا۔ شیخ صاحب کے چہرے پر ندامت اور آنکھوں میں معذرت تھی۔ ساوی کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ پتا چل رہا تھا کہ وہ صرف باپ کے خوف سے زبان پر قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ جمیلہ اور کرمو کے چہروں پر ہوائیاں ڑ رہی تھیں۔

میں یہی کروں گی۔ اس وقت تو شادی میں جانا ہے۔ واپسی تک میری انگوٹھی مجھے مل جانی چاہیے ورنہ تم حوالات میں ہی ہو گے۔

بس بیگم۔ بہت ہو گیا۔ شیخ صاحب بولے۔ میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ ہمارے ملازمین میں کوئی ایسا نہیں ہے مگر آپ ساری حدیں پھلانگے جا رہی ہیں۔

تو پھر میری انگوٹھی کہاں گئی؟

اپنی چیز کا آدمی خود ذمے دار ہوتا ہے۔ بجائے انگوٹھی تلاش کرنے کے آپ نے
دوسروں کو چور بنانا شروع کر دیا۔

بس اب پولیس ہی یہ مسئلہ حل کرے گی

آپ یہ شوق بھی پورا کر لیں۔ شیخ صاحب نے سرد لہجے میں کہا۔ میں پولیس کے
سامنے اس شبہے کا اظہار کروں گا کہ کسی نوکر کو پھنسانے کے لیے آپ نے خود ہی انگوٹھی
کہیں چھپا دی ہے۔

آپ ------ آپ ---- بیگم صاحبہ گنگ ہو گئیں۔

اور دیکھ لیجیے گا۔ انگوٹھی آپ کے کمرے میں ہی ملے گی اور اب آپ شادی کو تو بھول
جائیں۔ دل چاہے تو ابھی پولیس کو بلا لیں۔ ورنہ بہتر یہ ہے کہ انگوٹھی کو کمرے میں ہی
تلاش کر لیں۔ شیخ صاحب نوکروں کی طرف متوجہ ہوئے۔ تم لوگ جاؤ میں تم سے معافی
چاہتا ہوں۔

الہی بخش کرمو اور جمیلہ کمرے سے نکل آئے۔ اندر بیگم صاحبہ کہہ رہی تھیں لیکن
------ شادی میں دیر ہو جائے گی۔

میں نے کہا نا کہ شادی کو بھول جائیے۔ اب پہلے یہ مسئلہ حل ہوگا جس طرح آپ پسند
کریں۔

بیگم صاحبہ جانتی تھیں کہ اب شیخ صاحب ماننے والے نہیں۔ ٹھیک ہے میں دیکھتی ہوں
لیکن میں بتا رہی ہوں کہ یہ آپ کے چہیتے الہی بخش کی حرکت ہے۔

پانچ منٹ کے اندر انگوٹھی ڈریسنگ کی دراز میں پڑی مل گئی۔ بیگم صاحبہ کا بس چلتا تو

سے چھپ رہتیں لیکن شیخ صاحب ان کے سر پر مسلط تھے۔ اب سوچیں کہ پولیس کو
بلاتیں تو اس وقت آپ کی کیا پوزیشن ہوتی؟ شیخ صاحب نے ناگوار لہجے میں کہا۔

کسی خاص بات نہیں غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے۔ بیگم صاحبہ نے بے پروائی سے کہا۔

آپ کو معلوم ہے کہ کسی پر تہمت لگانا کتنا بڑا گناہ ہے۔ سارہ بولی

اب تم مجھے اخلاق نہیں پڑھاؤ۔ بیگم صاحبہ نے جھنجھلا کر کہا۔

آپ کو خود چل کر ان سے معافی مانگنا چاہیے۔ شیخ صاحب نے کہا۔

یہ بات آپ ہی سوچ سکتے ہیں۔

سوچنے کی بات نہیں میں اس پر عمل کراؤں گا۔ شیخ صاحب نے زور دے کر کہا۔ ورنہ
ابھی میں خود آپ کے میکے جانے کا شوق پورا کروں گا۔ مجھے صرف بتا دیں کہ آپ
اپنی شادی میں چلنا چاہتی ہیں یا اپنے میکے؟ شیخ صاحب کے اس لہجے سے رخسانہ بیگم
خوب واقف تھیں۔ چلیے .... انہوں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

☆----------☆----------☆

الہی بخش اپنے کوارٹر میں بیٹھا الجھ رہا تھا اسے یاد تھا کہ عشق سے پہلے وہ بہت خود دار ہوا
کرتا تھا۔ مگر اب وہ بہت کچھ سن کر پی جاتا تھا۔ پچھلی بار بیگم صاحبہ نے اسے حرام خور کہا
تھا۔ الہی بخش کے نزدیک وہ بہت بڑی گالی تھی۔ پھر بھی وہ پی گیا تھا۔

لیکن آج بات بہت آگے چلی گئی تھی۔ بیگم صاحبہ نے اس پر چوری کا الزام لگایا تھا۔
الہی بخش کا اپنا ایک ضابطہ اخلاق تھا۔ اس کی رو سے وہ کسی کو مطلع کیے بغیر بھی یہاں
سے جا سکتا تھا مگر کچھ سننے کے بعد اس کی یہ ذمہ داری نہیں تھی کہ نوکری چھوڑنے کا
اعلان کرے اور پھر جائے۔

لیکن اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی اس کے دل میں یہاں سے جانے کا خیال نہیں آیا تھا۔ شیخ صاحب بلاشبہ بہت اچھے انسان تھے اور وہ ان کا بڑا احترام کرتا تھا لیکن ان کے احترام میں وہ اس توہین کو نہیں پی سکتا تھا۔ البتہ سادی کے عشق میں اتنی قوت تھی کہ وہ سے جانے نہیں دے رہا تھا۔

پھر بھی توہین کے زخم سے ٹیسیں تو اٹھ رہی تھیں۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے جا کر دروازہ کھولا اور حیرت سے گنگ رہ گیا سر جی

آپ اس نے بیگم صاحب کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

ہاں الہی بخش شیخ صاحب نے کہا اور رخسانہ بیگم کی طرف دیکھا۔

انگوٹھی مل گئی ہے۔ الہی بخش۔ بیگم صاحب نے کہا میری ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں تھی۔

بڑی خوشی کی بات ہے بیگم صاحب۔ الہی بخش نے خشک لہجے میں کہا۔

بس؟ شیخ صاحب نے کڑے لہجے میں رخسانہ بیگم سے کہا۔ یہی کہنے کے لئے یہاں آئی ہیں آپ؟

دیکھئے شیخ صاحب آپ مجھ سے یہ امید نہ رکھیں کہ میں ایک نوکر سے معافی مانگوں گی۔ رخسانہ بیگم نے کڑے لہجے میں کہا۔

شیخ صاحب کچھ کہنے ہی والے تھے مگر ان سے پہلے ہی الہی بخش بول اٹھا سر جی معافی سے تو میں شرمندہ ہوں گا۔ اس کی ضرورت نہیں، مگر گستاخی معاف میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

کہو الہی بخش۔

سر جی پہلے میرے باپ نے رزق حلال پر میری پرورش کی۔ پھر مجھے اس کی تلقین کی

اللہ گواہ ہے سر جی میں نے کبھی چوری، بے ایمانی، حرام خوری نہیں کی۔ انسان ہوں ۔ غلطی کی تو خطا ہو سکتی ہے۔ مگر میں ہمیشہ ان چیزوں سے بچتا رہا۔ یک بار پہلے بیگم صاحب نے مجھے حرام خور کہہ چکی ہیں۔ میں صرف اس لئے نوکری چھوڑ کر نہیں گیا کہ آپ کا احسان مندا ہوں۔ آپ کی عزت کرتا ہوں۔ آج انہوں نے مجھے بد معاش چور اور بے ایمان کہہ دیا اور یہ بھی کہا کہ یہ شروع ہی سے مجھے ایسا سمجھتی ہیں۔ اب آپ بتائیں اس صورت میں میرا یہاں کام کرنا مناسب ہے؟

شیخ صاحب نے ملامت بھری نظروں سے بیوی کو دیکھا۔ آپ کو اپنی زیادتی کا احساس بھی نہیں؟

بیگم صاحب کے چہرے پر زردی سی بکھر گئی۔ مجھے احساس ہے اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہوں گی۔ یہ کہہ کر وہ پلٹیں اور گھر کی طرف چلی گئیں۔

شیخ صاحب چند لمحے مجرم بنے سر جھکائے کھڑے رہے۔ پھر انہوں نے کہا۔ بیٹے الہی بخش میں شرمندہ ہوں۔ انشاء اللہ آئندہ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔

سر جی مجھے شرمندہ نہ کریں۔ میں آپ کو شرمندہ نہیں دیکھ سکتا۔ میرے لئے یہ مر جانے کے برابر ہے۔

شیخ صاحب بھی پلٹ کر چلے گئے۔ الہی بخش کوارٹر میں چلا آیا۔

وہ شاید دستک ہی کا دن تھا۔ شیخ صاحب کے جانے کے بعد کوئی ایک گھنٹے بعد پھر دستک ہوئی۔ اس بار دروازے پر کرمو تھا۔ بیٹے تمہیں ساری بی بی نے بلایا ہے۔

الہی بخش کہنا چاہتا تھا کہ اب میں گھر میں قدم رکھ کر ایک بار اور چور نہیں بننا چاہتا لیکن اس کے اندر سے کسی نے ملامت بھرے لہجے میں کہا۔ ساری کا حکم ٹالے گا؟ پتی تو ہین

کا بدلہ کس سے لے گا؟

تم جا کر سو جاؤ میں بھی آتا ہوں۔ الٰہی بخش نے کہا

پانچ منٹ بعد الٰہی بخش بنگلے میں داخل ہوا تو وہاں سناٹا تھا۔ بات سمجھ میں آنے لگی تھی۔

سب لوگوں کو شادی میں جانا تھا۔ مگر سادی کیوں نہیں گئی؟

اس نے سادی کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ آجاؤ الٰہی بخش۔ اندر سے

سادی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

الٰہی بخش کمرے میں داخل ہوا۔ سادی مسہری پر بیٹھی تھی۔ اس کی متورم آنکھوں سے

اندازہ ہوتا تھا کہ وہ روتی رہی ہے۔ اسے اس حال میں دیکھ کر الٰہی بخش کا دل کٹنے لگا۔

یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے سادی بی بی۔ اس نے دل گرفتگی سے کہا اور آپ شادی میں بھی نہیں گئیں۔

تماشا بھو جانے کے بعد جا سکتی تھی کیا؟ سادی نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

کچھ بھی تو نہیں ہوا سادی بی بی دیکھیں میں تو دکھی نہیں بلکہ خوش ہوں۔

یہ تو تمہاری بڑائی ہے۔ جو اللہ نے تمہیں دی ہے لیکن میں تم سے شرمندہ ہوں۔

الٰہی بخش میں ممی کی طرف سے تم سے معافی مانگتی ہوں۔

مجھے گناہگار نہ کریں سادی بی بی

ممی انسان نہیں ہیں۔

ایسا نہ کہیں وہ آپ کی ماں ہیں۔ بہت محترم ہیں آپ کے لیے۔ الٰہی بخش نے کہا پھر

پوچھا میرے لیے کیا حکم ہے سادی بی بی۔

یہاں آؤ میرے قریب

الٰہی بخش مسہری کے قریب چلا گیا۔

یہاں بیٹھو میرے پاس سادی نے مسہری کی طرف اشارہ کیا۔

ساری بی بی یہ میرا مقام نہیں۔

یہی تو دشواری ہے کہ تمہیں اپنے مقام کا علم نہیں۔ بہرحال میرا حکم تو نہیں ٹال سکتے۔

الٰہی بخش بڑھا اور مسہری پر ٹک کر بیٹھ گیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ کوئی غیر معمولی بات ہونے والی ہے۔

تم آج نوکری چھوڑ کر چلے کیوں نہیں گئے؟ ساری نے پوچھا

بس ساری بی بی جی نہیں چاہا ایسا کرنے کو

اپنی عزت کا خیال نہیں تمہیں؟

کچھ چیزیں عزت سے بڑی ہوتی ہیں ساری بی بی

ہوسکتا ہے تمہیں بڑی لگتی ہوں۔ حقیقت میں نہ ہوں۔

جب تک مجھے بڑی لگیں گی میرے لئے تو بڑی رہیں گی۔

ٹھیک کہتے ہو۔ ساری نے آہ بھر کے کہا۔ جانتے ہو میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے۔؟

نہیں ساری بی بی جاننا چاہتا ہوں۔

میں چاہتی ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرو۔

الٰہی بخش گڑبڑا گیا۔ اس بات کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا وہ عشق کا سارا فلسفہ بھول گیا۔ میں آپ سے محبت کرتا ہوں ساری بی بی۔ پر یہ محبت نہیں' وہ محبت کرو جو عام لوگ کرتے ہیں' ساری کی آواز لرز رہی تھی۔ میں چاہتی ہوں تم مجھ سے محبت کرو۔ ساری اس کی طرف کھسکی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔ الٰہی بخش

یوں چھل کر مسہری سے اٹھی جیسے وہاں کسی بچھو کو دیکھ لیا ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے سادی بی بی
آپ بہت بلند اور پاکیزہ ہیں۔
سادی بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ جو تم سمجھتے ہو میں ویسی نہیں ۔ میں انسان ہوں میر
خواہشات بھی انسانی ہیں۔ میں گوشت پوست کی بنی ہوئی ہوں۔
میرے لیے آپ وہ ہیں جو میری نظر میں ہیں۔ میرے لیے اہمیت صرف اس بات کی
ہے۔
سادی اس سے لپٹ گئی۔ میں جانتی ہوں تم میرا حکم نہیں ٹال سکتے۔
الہی بخش نے نرمی سے اسے الگ کر دیا۔ وہ حکم مانوں گا جو آپ ہوش مندی کے عالم
میں دیں گی ۔ اس وقت آپ ہوش میں نہیں ہیں اور آپ تاوان کیوں ادا کرنا چاہتی
ہیں جبکہ میں طلب ہی نہیں کر رہا ہوں۔
یہ محض تمہاری بے عزتی کی قیمت نہیں میری خواہش بھی ہے۔ سادی بپھر گئی تھی۔ تم نہیں
جانتے میں تم سے محبت کرتی ہوں۔
محبت الہی بخش نے حقارت سے کہا۔ اسے محبت نہیں کچھ اور کہتے ہیں میں وہ لفظ زبان
پر بھی نہیں لا سکتا۔
میں تم سے شادی نہیں کر سکتی۔ تمہیں کچھ طور پر حاصل تو کر سکتی ہوں۔
سادی بی بی میں جا رہا ہوں یہ سمجھ لیں کہ میں آیا ہی نہیں تھا۔ یہ کہہ کر الہی بخش
دروازے کی طرف بڑھ گیا۔
الہی بخش
الہی بخش نے پلٹ کر دیکھا۔ جی سادی بی بی

تمہیں میرا حکم ماننا پڑے گا۔ ورنہ میں شور مچا دوں گی کہوں گی کہ تم مجھ سے بدتمیزی کر رہے تھے۔

سودی بی بی آپ نے یہ الزام لگایا تو میں اس سے انکار بھی نہیں کروں گا۔ خدا حافظ۔

وہ باہر نکل آیا۔ سودی کی خواہش میں ڈوبی لرزتی آواز دور تک اس کا پیچھا کرتی رہی لیکن اس نے نہیں سنا وہ یہ آواز اپنی سماعت میں اپنی یادداشت میں محفوظ نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

اپنے کوارٹر میں پہنچ کر اس نے اپنی تمام چیزیں سمیٹ کر صندوق میں رکھیں اور کرمو چاچا کے پاس چلا گیا۔ چاچا میری روانگی کا حکم آ گیا ہے۔ اس نے کہا۔

جانتا ہوں بیٹے اب تو یہاں نہیں رہ سکتا۔ بیگم صاحب نے بڑی زیادتی کی تیرے ساتھ۔

چاچا صبح صاحب کو بتا دینا کہ میں اب یہاں کام نہیں کر سکتا تھا اس لئے چلا گیا ہوں۔ ان سے کہنا مجھے معاف کر دیں۔ میری ہر غلطی معاف کر دیں۔

تو کیا ابھی جائے گا؟

ہاں چاچا اب یہاں رکنا ٹھیک نہیں۔

کہاں جائے گا بیٹے؟

سٹیشن جاؤں گا چاچا شاید رات کی کوئی گاڑی مل جائے۔

میں تجھے چھوڑنے چلوں گا۔

نہیں چاچا اب میں چلتا ہوں۔

بیٹا ------ میرے گھر سب کو سلام دعا پہنچا دینا۔ اللہ تجھے حفاظت سے گھر پہنچائے۔

کرم دین گیٹ تک الٰہی بخش کو چھوڑنے آیا۔

وہی کا حکم اوپر ہی سے ہوا تھا۔ الٰہی بخش کو رات کو گاڑی مل گئی۔ صبح ہوتے ہوتے وہ حیدرآباد سے نکل چکا تھا۔

زندگی کا ایک ورباب مکمل ہو چکا تھا۔

☆----------☆----------☆

اہی بخش جیسے ہی گھر میں داخل ہوا' اس کے باپ نے اس کی ماں سے کہا دیکھا ----- دیکھا ایسے ہوتے ہیں سعادت مند بیٹے۔

اہی بخش نے حیرت سے باپ کو اور پھر ماں کو دیکھا کہ شاید اس پر طنز کر رہے ہیں۔ لیکن ن کے ہونٹوں پر تھیر مقدس مسکراہٹ کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر پیر بخش نے بڑھ کر محبت سے سے لپٹا لیا۔ اس کے بعد ماں نے اسے پھر سے چھوٹا سا بچہ بنا دیا۔

سکون سے بیٹھے تو اس نے باپ سے پوچھا۔ آپ میری سعادت مندی کی بات کر رہے تھے۔ میں نے ایسا کیا کیا؟

میں نے چار دن پہلے خط ڈالا تھا تو پانچویں دن آ گیا۔ خط پہنچتے ہی چل پڑا ہو گا۔

اہی بخش مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ خط تو اس تک پہنچا ہی نہیں تھا۔ اس سے پہلے ہی حکم ہو گیا تھا۔

پہلے تین دن تو معلومات اپ ٹو ڈیٹ ہونے میں نکل گئے۔ کس کے ہاں بچہ ہوا' کون فوت ہوا' کون باہر چلا گیا' کس کی شادی ہوئی' کسی طلاق ہوئی' پھر جو فوت ہوئے ن کے ہاں دعا کے لئے جانا تھا۔ ایک ہفتے بعد اسے سکون سے بیٹھنے کا موقع ملا۔

چانک سے خیال آیا تو اس نے باپ سے پوچھا آپ نے خط لکھ کر مجھے کیوں بلایا

تھا؟

خط میں وجہ بھی لکھ دی تھی۔

خط تو مجھے لائی نہیں با

ماں اس کے پاس آ بیٹھی۔ بیٹے تیری شادی کا ارادہ کیا ہے۔

تیری کیا مرضی ہے بخشو

میری کیا مرضی با جو تمہارا جی چاہے کرو۔ پر ابا پیسے کی ضرورت بھی ہوگی۔

وہ تو ہوگی۔ پر تو فکر نہ کر سب ہو جائے گا۔

میں اس سے کہہ رہا ہوں ابا کہ میرے پاس دس بارہ ہزار روپے ہیں۔ الہی بخش نے صندوق سے رقم نکال کر باپ کے دامن میں ڈال دی۔

اتنے پیسے؟ بڈھے پیر بخش کی آنکھیں پھیل گئیں۔

اچھی نوکری تھی با۔۔۔۔۔۔۔۔ اور خرچ کوئی نہیں تھا۔

تو شادی کی فکر نہ کر۔ آگے کی سوچ کچھ کر لے اس رقم سے۔ نوکری کے آزار سے بچ۔

شادی کے بعد سوچوں گا با تم یہ پیسے اپنے پاس رکھو۔ ضرورت پڑے تو خرچ کر لینا۔ آگے اللہ مالک ہے۔

گھر آ کے الہی بخش بہت خوش تھا۔ سب سے بڑی خوشی یہ تھی کہ اس کی راتیں خوبصورت ہوگئی تھیں۔ سادی ہر رات اس کے پاس آ جاتی تھی۔ سادی کی وہ آخری حرکت اس کا ہر نقش ہر آواز اس کے ذہن سے محو ہو چکی تھی۔ الہی بخش کے نزدیک وہ عشق کی آزمائش تھی جس میں رب نے اسے سرخرو کیا تھا۔

دس دن کے بعد ڈاکیے نے اسے ایک خط لا کر دیا۔ لفافے پر سادی کی تحریر دیکھ کر اس کا

دل بے حال ہوگا۔ اس نے جلدی سے لفافہ چاک کیا۔ اندر ایک اور لفافہ تھا۔ وہ بابا کا بھیجا ہوا خط تھا۔ ساتھ ایک چھوٹا سا رقعہ بھی تھا۔ اس نے بے تابی سے پڑھا رقعہ القاب و آداب سے محروم تھا۔

تمہارے جانے کے بعد اگلے روز یہ خط آیا تھا۔ پیچھے تمہارا گاؤں کا پتا لکھا تھا کہہ رہی تھیں کہ واپس کر دو یہ تمہیں مل جائے گا۔ مگر مجھے اعتبار نہیں تھا اور کیا پتا خط اہم ہو۔ اس لیے میں اسے رجسٹری کر رہی ہوں۔ امید ہے اب تم تک ضرور پہنچ جائے گا۔

تمہاری ساوی۔

نوٹ معذرت کسی بات کی نہیں کر رہی ہوں۔ تم مجھے معاف بھی نہ کرنا۔

الٰہی بخش نے بابا کا خط کھولا بھی نہیں۔ ساوی کے مختصر سے رقعے کو اس کے لفافے میں رکھ کر اس نے اسے اس صندوق میں رکھ دیا جو اسے بہت پیارا ہو گیا تھا اس میں ساوی کی دی ہوئی خوشبو، ساوی کے دلائے ہوئے پینٹ شرٹ اور جوتوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

☆----------☆----------☆

ماجدہ بیوی بن کر اس کے گھر میں آئی تو زندگی کا ایک اور باب شروع ہو گیا۔

شادی کے آٹھویں دن بابا نے اس کے دیے ہوئے پیسے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

لے بیٹے اب اس سے تو کوئی کاروبار کر لے۔

پر کروں کیا بابا۔

کچھ بھی کر لے۔ یہ رقم کم نہیں۔ بہت اچھا کاروبار کر سکتا ہے۔

الٰہی بخش تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ بابا فروٹ کی دکان ڈال لوں؟

جو مناسب سمجھو کر۔

الٰہی بخش نے منڈیاں چوک پر' جہاں جناح آباد کو روڈ جاتا ہے' دکان لی اور فروٹ کا کام شروع کر دیا۔ کام اس نے بڑے پیانے پر شروع کیا تھا۔ وہ ہری پور' کان پور بلکہ راولپنڈی تک سے مال لاتا تھا۔

جس پیانے پر اس نے کام شروع کیا تھا کوئی اور ہوتا تو تھوڑے عرصے میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا لیکن وہ الٰہی بخش تھا۔ لوگ کہتے تھے' ایسا کاروباری' ایسا دکاندار انہوں نے کہیں نہیں دیکھا۔ دکان پر وہ دو طرح کا کام کرتا تھا۔ ایک وہ کھلا پھل بیچتا۔ دوسرے وہ دکاندار اس سے پھلوں کی پیٹیاں لے جاتے۔ اس دوسرے کام میں بچت کم تھی لیکن اس کی دکان صرف اسی کے زور پر چلتی رہی۔ ورنہ وہ قلاش ہو جاتا۔ حالانکہ کھلا پھل بیچنے میں زیادہ منافع ہوتا ہے۔ لیکن الٰہی بخش کا مزاج' اس کا طریق کار ایسا تھا کہ اس میں اسے منافع ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

الٰہی بخش جب اپنی دکان کے لیے پھلوں کی کوئی پیٹی کھولتا تو اچھے پھل ایک طرف کر لیتا۔ ہر پیٹی میں خراب پھل بھی ہوتے ہیں۔ کسی میں کم اور کسی میں زیادہ۔ الٰہی بخش خراب پھل کبھی نہیں بیچتا تھا۔

ایک بار ایک عورت پھل خریدنے آئی اور آلو بخارے کا بھاؤ پوچھا۔ وہ بھاؤ تاؤ کرنے لگی تو الٰہی بخش نے کہا۔ بہن میں دام کم نہیں کرتا اس سے کم قیمت پر کہیں ملے تو لے لو۔ آلو بخارے خوب پکے ہوئے اور اچھے تھے۔ عورت للچائی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ سامنے والی دکان پر بارہ آنے سیر مل رہے ہیں۔

تو وہاں سے لے لو بہن' روپے سے کم نہیں دوں گا۔

ور یہ لوکاٹ کیسے دیے ہیں؟

یہ دل آ نے سیر ہیں۔

عورت نے دیکھا وہ صاف ستھرے پکے ہوئے لوکاٹ تھے۔یقیناً چن کر رکھے گئے تھے۔ ی لمحے دوسری طرف ا سے لوکاٹ کا ایک اور ٹوکرا نظر آیا۔اس میں بہت پکے ہوئے گلنے کی حد تک اور داغ دار لوکاٹ تھے۔یہ کیسے دے رہے ہو؟ اس نے پوچھا یہ بیچنے کے ے نہیں ہیں۔بہن۔

وہ ---------------- یہ کیا بات کی تم نے دکان پر تو ہر چیز بیچنے کے ے ہوتی ہے۔

جو چیز خود مجھے چھی نہیں لگتی وہ میں بیچتا نہیں۔جو خود نہیں کھا سکتا' وہ دوسروں کو نہیں کھلاتا۔

عورت ہنسنے لگی۔تو پھر یہ مجھے مفت دے دو۔

ہاں مفت دے سکتا ہوں مگر مفت دوں گا تو اپنی مرضی کے آدمی کو دوں گا جسے میر دل چاہے دوں گا۔

چلو یہ تو چھی بات ہے کہ جو چیز تمہیں اچھی نہیں لگتی وہ نہیں بیچتے لیکن میں پنی مرضی سے یہ خریدنا چاہوں تو پھر؟

تب بیچ دوں لیکن انہیں بیچ کر مجھے خوشی نہیں ہوگی۔

لو تم یے پھلوں کا کرتے کیا ہو؟

کچھ یسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو پھل خرید نہیں سکتے۔یہ پھل میں انہیں دے دیتا ہوں تا کہ ن کے بچے بھی پھل کھالیں۔پھر بھی بچ جائیں تو بکریوں' گایوں ور بھینسوں کے

آگے ڈال دیتا ہوں۔۔۔یوں وہ خراب پھل بھی کارآمد ہو جاتا ہے۔

چھ یہ لوکاٹ مجھے کیا بھاؤ دو گے؟

الٰہی بخش سوچ میں پڑ گیا۔ سامنے والی دکان پر لوکاٹ کیا سیر ہے؟ اس نے پوچھا

آٹھ آنے۔۔۔۔۔

الٰہی بخش نے عورت کو بغور دیکھا۔ وہ متوسط طبقے کی معلوم ہوتی تھی۔ چلو میں تمہیں چھے، لے لوکاٹ آٹھ آنے سیر دے دیتا ہوں۔ غریبوں کا کام خراب مت کرو لیکن آئندہ میری دکان پر آ کے یہ پنچایت نہ کرنا۔

یہ تھا الٰہی بخش کا کاروبار کا اسٹائل۔ پھر وہ بامروت بھی تھا اور متواضع بھی۔ ادھار میں بھی اس کا پیسہ پھنسا رہتا تھا۔ دکان پر کوئی اس سے ملنے آتا تو وہ پھلوں سے اس کی تواضع کرتا۔ کئی لوگ تو پھل کھانے کے ارادے سے ہی اس سے ملنے آ جاتے۔ ایسے میں کیا منافع کا کیا سوال تھا۔ بس دکان داروں کو جو مال دیتا تھا، اس کی برکت سے گھر کا خرچ فراغت سے چل رہا تھا۔ الٰہی بخش اس میں بہت خوش تھا۔

الٰہی بخش نے حامدہ کو بھی ہمیشہ خوش رکھا۔ اللہ نے اولاد کے معاملے میں بھی اسے خوب نوازا۔ پہلے اس کے ہاں مسلسل تین بیٹے ہوئے۔ پھر بیٹی پیدا ہوئی، وہ اس کی بڑی لاڈلی تھی۔ الٰہی بخش بہت ذمے دار اور محبت کرنے والا شوہر اور باپ تھا۔ نماز بھی وہ باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔ بس رات کا ایک پہر وہ اپنے لیے گزارتا تھا۔ اپنی سادی کے ساتھ۔ نیند اس کی بہت کم ہوتی تھی۔ اس کا اثر اس کی صحت پر بھی پڑ رہا تھا۔ وہ اپنی عمر سے بڑا لگنے لگا تھا۔

شادی کے پانچ سال بعد چار ماہ کے وقفے سے ماں اور باپ دونوں اس کا ساتھ چھوڑ

گئے۔ ن کے بعد گھرانہ منتشر ہو گیا۔ بہنوں کی پہلے شادیاں ہو گئیں تھیں۔ بھائی لگ ہو گئے۔ آبائی مکان میں وہ اکیلا رہ گیا۔

الٰہی بخش نے بھی بچے بچوں کو گھٹی میں عشق پلایا۔ یہ تو اس کا نسلی فریضہ تھا اس کے علاوہ وہ انہیں اکل حلال کے متعلق بتاتا اور اس کی اہمیت سمجھاتا۔ انہیں ایمانداری ور سچائی کی تلقین کرتا۔ دوسروں کی عزت کرنا سکھاتا۔ اس کے بچے تعلیم کے معاملے میں پیچھے رہ گئے لیکن س نے دینی تعلیم میں انہیں پیچھے نہیں رہنے دیا۔ دس سال کی عمر تک اس کے تمام بچے حافظ قرآن ہو چکے تھے۔ اسکول کی پڑھائی میں ان کا دل نہیں لگا تو وہ انہیں دکان پر لے جانے لگا۔

بچوں کے نام رکھنے کے معاملے میں اس نے روایات سے بغاوت کی تھی۔ بڑے بیٹے کا نام مدثر' بیچھلے کا مبشر' ور چھوٹے کا مزمل تھا۔ شاید وہ حرف م سے اس کی محبت کا اظہار تھا اور شاید بیٹوں کے شہری نام اس نے اس لئے رکھے تھے کہ ان کی زندگی میں کوئی سودی آئے تو کم از کم نام کی رکاوٹ تو موجود نہ ہو۔

وقت پر لگا کر اڑتا رہا۔ بچے بڑے ہو گئے۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار ورذمے دار بھی تھے اور سعادت مند بھی۔ دکان انہوں نے سنبھال لی۔ الٰہی بخش کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ ب دکان بیٹے ہی کھول لیتے تھے۔ وہ دیر میں دکان پر آتا اور گلے پر ہی بیٹھا رہتا۔ مگر سے اطمینان نہیں تھا کہ بیٹے کاروبار کے رموز کو سمجھتے ہیں۔ پھر اس کی یہ غلط فہمی دور ہو گئی ور وہ مطمئن ہو گیا۔

بیٹے یہ تو بیب تمہیں روپے میں پڑ رہا ہے؟ ایک دن اس نے بڑے بیٹے کو ٹوکا۔

ہاں بابا

پیٹی کتنے کی آ رہی ہے آج کل؟

مدثر نے جواب دیا۔ بیس روپے کی تو پیٹی یہ دو روپے پڑتا ہے۔ منافع سمیت۔

پورے بازار میں سیب ساڑھے تین روپے سے کم نہیں ہے بابا اور ہم تین روپے بیچ رہے ہیں۔ اس میں پیٹی کے خراب دانوں کا خرچہ بھی نکل آتا ہے۔ غریبوں کا بھی بھلا ہو جاتا ہے دیکھو بابا اب کنبہ کی بڑا ہو رہا ہے۔

الٰہی بخش نے سرد آہ بھرتے ہوئے سر کو ہلکی جنبش دی۔ ٹھیک ہے بیٹے۔ اچھا یہ بتا بتول کے ہاں پھل دے دیئے تھے۔

ہاں بابا صرف وہیں نہیں ہر اس جگہ پھل دے دیئے تھے جہاں تم بھجواتے ہو۔

اتنی دیر میں ایک دکاندار آ گیا۔ اس نے مدثر سے کہا۔ مجھے سیب آلو بخارے اور خوبانی کی ایک ایک پیٹی دے دو۔

چاچا پچھلے پیسے لائے ہو کہ نہیں؟ مدثر نے پوچھا

اگلی بار دے دوں گا۔

نہیں چاچا پھر فروٹ بھی اگلی بار ہی لے لینا

یار تو تو بڑی بے مروتی کرتا ہے۔ دکاندار برا مان گیا۔ تیرے باپ نے کبھی ایسا نہیں کیا میرے ساتھ۔

تو بابا والا حساب تم نے آج تک صاف بھی نہیں کیا ہے۔ ہم مال منڈی سے مفت نہیں لاتے ہیں۔ پیسہ دیتے ہیں اور پیٹی پر مشکل سے پانچ روپے زیادہ لیتے ہیں۔ تم پیسے نہیں دو گے تو ہمارا کام کیسے چلے گا؟

ٹھیک ہے میں منڈی سے لے لوں گا۔

شوق سے لے لو۔ ذرا منڈی کا بھاؤ بھی تو معلوم ہو تمہیں۔ یہاں آؤ تو پچھلے دو سو روپے بھی لے کر آنا۔

دکاندار کے جانے کے بعد الٰہی بخش نے کہا۔ بیٹے دے دیتا تھوڑا مال۔ پتا ہے پرانا گاہک ہے۔

ابا یہ کوئی غریب آدمی نہیں ہے۔ بس پیسے دبانے کی عادت ہو گئی ہے اسے۔ منڈی جائے گا تو دماغ ٹھیک ہو جائے گا آپ ہی۔

علم دین کی بات درست ثابت ہوئی۔ اگلے روز وہ دکاندار دو سو روپے لے کر آیا تھا۔

کیوں تایا، منڈی کا بھاؤ دیکھ لیا؟ علم دین نے اس سے پوچھا۔

نہیں منڈی تو میں گیا ہی نہیں۔

جھوٹ مت بولو چاچا۔ تم ہم سے مال خرید کے تم پر نہیں خود بھی ہیرا پھیری کرتے ہو۔

دکاندار کھسیا کر خاموش ہو گیا۔

پھر ایک دن ایک ملنے والا آیا۔ دیر تک وہ بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ الٰہی بخش کا جی چاہا لیکن وہ کچھ نہیں بولا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے بیٹے سے کہا۔ بیٹے علم الدین اتنی دیر بیٹھا تو نے اس کی خاطر بھی نہیں کی۔

چائے منگوا تو لی تھی ابا بیٹے نے کہا

بیٹے پھل سے بھی اس کی تواضع کر سکتا تھا تو۔ دیکھو بڑی بات ہے۔

ابا یہ ہمارا گھر نہیں دکان ہے۔ گھر پر ہم ہر طرح کی تواضع کریں گے۔ پر یہ دوکان پر بس چائے کو ہی پوچھا جا سکتا ہے۔ دکان کے مال سے تواضع کریں تو برکت نہیں رہتی؟

اس روز الٰہی بخش کی طمانیت کی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ بے فکر ہو گیا۔ بچوں نے اس کی

غلطیوں کی بھی اصلاح کر لی تھی۔ وہ دکان چلا سکتے تھے۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے تھے۔ الہی بخش نے اپنی بیٹی رقیہ کی شادی سولہ سال کی عمر میں کر دی۔ اس بوجھ سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ ہلکا پھلکا ہو گیا۔ اس کے بعد اسے ایک کام اور کرنا تھا۔ اس نے سوچ لیا تھا۔ ایک روز اس نے تینوں بیٹوں کو جمع کیا۔ تم بہت اچھے ہو میرے بیٹو مجھے تم پر فخر ہے۔ اس نے کہا۔ آج میں تمہیں جو نصیحت کر رہا ہوں ہمیشہ سے یاد رکھنا۔ اکٹھے میں بڑی طاقت ہے میرے بچو مل کر رہو گے تو تمہاری طاقت زیادہ ہوگی۔ الگ ہو جاؤ گے تو کمزور ہو جاؤ گے۔

ہم یہ بات سمجھتے ہیں ابا۔

میں چاہتا ہوں کہ تم کاروبار الگ الگ کر لیں ہمیشہ ایک گھر میں رہو۔ ایک بات یاد رکھو نفاق ہمیشہ عورت سے ہوتا ہے۔ گھر عورتوں کی وجہ سے ٹوٹتے ہیں اور عورتیں مرد کی ذمے داری ہوتی ہیں۔ بیوی کو اپنی مرضی پر چلانا شوہر کا کام ہے۔ ایک ساتھ رہنے کے لیے تمہیں اپنی بیویوں کو قابو میں رکھنا ہوگا۔ نہیں رکھ سکے تو خسارے میں رہو گے۔ ہار جاؤ گے۔

پر ابا کاروبار الگ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مدثر نے پوچھا

ہاں ابا ایک دکان ہم لوگوں کے لیے بہت ہے مبشر بولا

میں آگے کی سوچتا ہوں میرے بچو' تمہاری شادیاں ہوں گی۔ کنبہ بڑھے گا میں چاہتا ہوں وہ وقت آئے تو روزگار میں سہولت ہو۔

پھر ابا سوچا کیا ہے؟ مدثر نے پوچھا

ایک دکان اور کرنی ہے بیٹے

تب بھی دو بھائیوں کا ساجھا ہوگا۔ مدثر نے کہا۔

نہیں بیٹے میرے ذہن میں نقشہ اور ہے۔ بیٹا ہمیشہ منڈی جاتا ہے۔ فروٹ لانا اس کی ذمے داری ہے۔ میں سمجھتا ہوں اسے دکان کی ضرورت نہیں۔ یہ مال لا کر دیا کرے گا۔۔۔۔۔ اپنے دونوں بھائیوں کو بھی اور دکانداروں کو بھی۔ اس میں اس کی اچھی خاصی آمدنی ہوگی۔ بیٹے مبشر تجھے کوئی اعتراض تو نہیں؟

نہیں ابو آپ ہمارا بھلا ہی سوچیں گے۔ مبشر نے کہا۔ ویسے میرا دل بھی دکان سے زیادہ باہر کے کام میں لگتا ہے۔

یہ دکان مزمل سنبھال لے گا۔ نئی دکان مدثر سنبھالے گا۔

ٹھیک ہے ابا۔

کسی کو کوئی اعتراض تو نہیں؟

اعتراض کیسا ابو آپ کا حکم ماننا تو ہماری زندگی ہے۔ مدثر نے کہا۔

مگر میں وجہ ضرور بتاؤں گا۔ الہی بخش نے کہا۔ مزمل سب سے چھوٹا ہے۔ اس کا تجربہ بھی کم ہے اس کے لئے نئی دکان بھاری ہوگی۔ یہ چلتی ہوئی دکان ہے آسانی سنبھال لے گا۔ پھر میں بھی کبھی کبھار ہاتھ بٹا دوں گا۔ مدثر بڑا ہے ان شاءاللہ آسانی سے نئی دکان جما دے گا۔

آپ کا فیصلہ درست ہے ابا۔

ایک مہینے میں اس فیصلے پر عمل درآمد ہو گیا۔

☆-------------☆-----------☆

زندگی ہموار زمین پر بہنے والی ندی کی طرح پرسکون تھی۔ سکون ہی سکون طمانیت ہی

طمانیت تو زبھی قائم تھی اور رات کو ساوی سے باتیں کرنے کا شغل بھی جاری تھا۔فرق پڑ تھا تو صرف صحت میں۔جوڑوں کا درد پچھلے کئی برسوں سے جان کے ساتھ لگا ہوا تھا وردہ جانتا تھا کہ جان کے ساتھ ہی جائے گا۔

ساوی اس کے لیے پہلے جیسی محترم نہیں تھی۔بلکہ پہلے سے زیادہ محترم تھی۔آج وہ جو کچھ بھی تھا اللہ کے کرم کی وجہ سے تھا اور وسیلہ ساوی تھی۔اسی ملازمت ہی کی وجہ سے وہ یہ کاروبار کرنے کے قابل ہوا تھا۔ورنہ جوڑوں کے درد کے باوجود کہیں کام ڈھونڈتا اور کرتا پھرتا۔یہ سکون اور طمانیت نہ ہوتی۔یہی نہیں آخری دن بھی ساوی نے اس پر احسان کیا تھا۔وہ سے نہ بھگاتی تو وہ عمر بھر اس در پر پڑا رہتا اور ذلت اٹھانے کا عادی ہو جاتا۔ساری عمر وہ کڑھتا رہتا' دکھی رہتا اور ساوی اتنی قریب بھی نہ ہوتی۔

یہ خیال جب بھی آتا' وہ ساوی کے لیے شکر گزاری میں ڈوب جاتا۔

مگر اس روز عزل کی دکان میں بیٹھے بیٹھے اس کی اچانک عجیب سی حالت ہوگئی۔گزری ہوئی پوری زندگی اس کی نگاہوں میں پھر گئی' کیا وہ سوچ بھی سکتا تھا کہ کبھی ایسی فراغت کی زندگی گزر سکے گا؟ اسے ایسی محبت کرنے والی خدمت گزار بیوی ملے گی؟ ایسی سعادت مند اولاد ملے گی؟ ایسے حکم ماننے والے بچے کہتے ہیں کہ نیک اولاد اللہ کا سب سے اچھا تحفہ ہوتی ہے۔تو اللہ نے اپنے نافرمان بندے کو کیسے کیسے نوازا۔کیا کیا کچھ عطا کیا اور بندے کو تو شکر کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔

بیٹھے بیٹھے اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔بہت عرصے کے بعد باپ کی کہی ہوئی باتیں یاد آئیں۔باپ کہتا تھا حق یہ ہے کہ شکر ادا کرو اور بہتر یہ ہے کہ عشق کرلیکن وہ تو عشق ہی سے گھبرا کر گھر چھوڑ بھاگا تھا۔پھر بھی اللہ نے کیسے قدم قدم پر اسے سہارا دیا۔کیسی

دستگیری کی اس کی۔ کیسے اس پر عنایات کی بارش کی اور وہ ہے کہ اب تک پہنچے جیسے بے نیاز شکر نہ عشق۔

اس کے وجود میں جیسے پشیمانی کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے چنگھاڑنے لگا۔ جسم کا رواں رواں استغفار کرنے لگا۔ پھر پشیمانی کے سمندر نے آنکھوں کا رخ کیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

جانے کتنی دیر تک آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔ پھر اچانک اس پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ سے لگ رہا تھا کہ اس کا دل بڑا ہوتا جا رہا ہے۔۔۔۔۔ مسلسل۔۔۔۔۔۔۔ جیسے وہ اس کے جسم سے بھی بڑا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ پھیلتا جا رہا ہے۔۔۔۔ دور پوری زمین کی حد تک۔۔۔۔۔ اوپر آسمان کی حد تک۔۔۔۔۔۔ اور جیسے دل پوری کائنات پر چھا گیا ہے۔ یہ بہت خوفزدہ کر دینے والا احساس تھا۔ وہ اس کا وجود جیسے حقیر۔۔۔۔۔۔۔ بہت حقیر ذرہ ہو گیا تھا اور دل جیسے کائنات کو نگل رہا تھا۔ اور اس دل کی آواز۔۔۔۔۔۔۔۔ دھڑکن۔ ہر دھڑکن جیسے اللہ اللہ پکار رہی تھی۔۔۔۔۔۔ اور وہ آواز بلند۔۔۔۔۔۔۔۔ بلند سے بلندتر ہوتی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ اس آواز کے سوا کائنات میں کچھ بھی نہیں رہا۔ اللہ۔۔۔۔۔۔۔۔ اللہ۔۔۔۔۔۔ اللہ۔۔۔

اچانک یک ورآواز ابھری۔ فلک شگاف آواز۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اللہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اللہ ہو۔ سے احساس ہو کہ وہ آواز اس کے حلق سے نکلی ہے۔ اس کے وجود میں گونجی ہے ور وہ دھماکے سے پھٹ گیا ہے اس کا وجود ریزہ ریزہ ہو گیا ہے۔

اس چیخ کے ساتھ ہی وہ پیچھے کی طرف گر الیکن اللہ۔۔۔۔۔ اللہ ہو کا وہ سلسلہ رکا نہیں۔ اس کے حلق سے مسلسل یہ صدا نکل رہی تھی اور اسے اس پر قابو نہیں تھا۔ وہ اس کے اختیار

میں نہیں تھی۔

مزمل نے وہ چیخ سنی تو باپ کی طرف لپکا۔ اس نے گرتے ہوئے باپ کا سر پکڑ کر گود میں رکھا۔ وہاں اللہ۔۔۔۔۔۔۔ اللہ ہو کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ ادھر ادھر کے دکاندار بھی جمع ہو گئے۔ کیا ہوا۔۔۔۔۔۔۔ یہ کیا ہوا؟ کسی نے پوچھا۔

پتا نہیں بیٹھے تھے، بس اچانک یہ کیفیت ہو گئی' مزمل نے بتایا۔

کوئی گلاس میں پانی لے آیا اور چھینٹے دیے لگا لیکن الٰہی بخش کی کیفیت نہیں بدلی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ اللہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اللہ ہو پکارے جا رہا تھا۔ البتہ اس کی آواز بتدریج دھیمی ہوتی جا رہی تھی۔ پھر وہ بالکل ہی معدوم ہو گئی۔ الٰہی بخش بے ہوش ہو چکا تھا۔ کچھ دیر بعد ہوش آیا تو اس نے ادھر ادھر دیکھا اس کی نگاہوں میں اجنبیت تھی۔ اس نے پھر اللہ ہو کا فلک شگاف نعرہ لگایا اور اٹھ کر لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے باہر بھاگا۔

مزمل نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن الٰہی بخش نے اسے جھٹک دیا۔ اس وقت وہ بہت توانا بہت طاقتور ہو گیا تھا۔

شام تک پورے بیت آباد کو معلوم ہو گیا کہ باغ وبہار کا الٰہی بخش دیوانہ ہو گیا ہے۔

☆――――――――☆――――――――☆

شام کو الٰہی بخش خود ہی گھر آ گیا۔ وہاں سب پریشان تھے بیٹے اٹھ کر اس کی طرف لپکے اور سہارا دے کر چارپائی تک لائے۔ اب کیسی طبیعت ہے ابا جی؟ مزمل نے پوچھا۔

ٹھیک ہوں بیٹے۔

اتنے میں حاجرہ بھی اندر سے نکل آئی۔ کہاں چلے گئے تھے؟

پتا نہیں، مگر تھی بڑی خوبصورت جگہ۔ الٰہی بخش نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

مبشر نے ماں کو آنکھوں سے اشارہ کیا کہ وہ ایسے سوال نہ کرے۔ ابا۔۔۔۔۔ تم لیٹ جاؤ۔ مبشر نے کہا۔

الٰہی بخش لیٹ گیا۔ مزمل اس کے پاؤں دبانے لگا۔ اماں۔۔۔۔۔۔۔ لسی لا دو ابا کے لئے" مدثر نے کہا۔

لیکن الٰہی بخش نے صرف دو گھونٹ پی کر لسی کا گلاس واپس کر دیا۔ کیسا خراب ذائقہ ہے اس کا۔ وہ بڑبڑایا

کیا محسوس کر رہے ہو ابا؟ مبشر نے پوچھا۔

نیند آ رہی ہے ورنہ ٹانگیں بہت دکھ رہی ہیں۔

بیٹے اس کی بات سمجھ سکتے تھے۔ نہ جانے کہاں کہاں مارا پھرا ہوگا وہ۔ سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تو ان تینوں کی بھی ٹانگیں دکھ گئیں تھی اور وہ انہیں نہیں ملا تھا۔ یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ کتنا پیدل چلا ہوگا۔ جبکہ وہ جوڑوں کا مریض بھی تھا۔

اماں۔۔۔۔۔۔۔ ابا کا بستر ٹھیک کر دو۔ مدثر نے ماں سے کہا۔

الٰہی بخش بستر پر لیٹتے ہی بے خبر ہو گیا۔ سوتے ہوئے وہ بہت پرسکون لگ رہا تھا اس کے چہرے پر روشنی تھی۔

اس روز الٰہی بخش کے گھر میں شام ہی سے رات ہو گئی۔ بیٹوں کو بھی اس کی تلاش نے تھکا مارا تھا۔ وہ بھی جلدی سو گئے۔ ایک حاجرہ تھی، جو جاگ رہی تھی۔ اسے تھکن نہیں تھی لیکن اس کا دل بہت پریشان تھا۔ بیٹے اسے سب کچھ بتا رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

وہ بیٹھی الٰہی بخش کی ٹانگیں دباتی رہی۔

جانے کتنی دیر بعد الٰہی بخش کسمسایا۔ بہت گرمی ہے، وہ بڑبڑایا

باہر صحن میں بستر بچھا ہے چلو .... وہاں سو جاؤ۔

صحن میں؟ الٰہی بخش نے کہا پھر اس کا پورا جسم لرزنے لگا۔ نہیں وہاں تو آسمان ہے۔

مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔

آسمان سے ڈر لگتا ہے؟؟ آسمان تو ہمیشہ سے ہے۔ حامدہ نے دہرایا۔

ہمیشہ سے ہے لیکن اب بہت قریب آ گیا ہے۔ میرا دل آسمان کو چھونے لگا ہے اب۔

حامدہ کی تشویش بڑھ گئی وہ تو سمجھ رہی تھی کہ اب وہ ٹھیک ٹھاک ہے لیکن وہ تو اب بھی

دیوانوں کی سی باتیں کر رہا تھا۔ تمہیں ہوا کیا تھا؟ اس نے پوچھا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر الٰہی بخش نے کہا۔ کچھ بھی نہیں۔ یہ میرا دل بڑا ہونے لگا

تھا .... بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ پھر وہ میرے سینے سے نکل گیا۔ پوری زمین، پورے آسمان

تک پھیل گیا۔ بلکہ اس سے بھی آگے نکل گیا مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا۔ پھر مجھے ہوش

نہیں رہا کیا ہوا۔ مجھے کچھ یاد نہیں، وہ کہتے کہتے رکا۔ مجھے اب بھی ڈر لگ رہا ہے حامدہ

وہ وہم تھا تمہارا، ایسا ہو جاتا ہے، حامدہ نے اسے تسلی دی۔

وہ وہم نہیں تھا حامدہ، الٰہی بخش نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ لیکن تم نہیں سمجھو

گی۔

حامدہ کچھ نہیں بولی۔ اسے بھی خوف آنے لگا تھا۔

حامدہ سنو ذرا یہاں سر رکھو۔ الٰہی بخش نے اچانک کہا۔ وہ اس کے سر کو اپنے سینے کی

طرف کھینچنے لگا۔

نہیں ۔۔۔۔۔۔۔سنو تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ بے وقوف عورت تم غلط سمجھ رہی

ہو۔الہی بخش نے غصے سے کہا میں کہہ رہا ہوں تم میرے دل سے کان لگا کر سنو۔

حامدہ کچھ نہیں سمجھی لیکن وہ بہت سہم گئی تھی۔اس نے الہی بخش کے سینے پر کان رکھ دیا کیا

۔۔۔۔۔۔کیا بات ہے۔؟

کوئی آواز نہیں سنائی دے رہی؟

ہاں۔۔۔۔۔۔۔۔دھڑکن کی آواز ہے۔دل تو دھڑکتا ہی ہے؟

کوئی اور آواز نہیں؟ الہی بخش کے لہجے میں مایوسی تھی میں ہاتھ رکھ کر سنوں تو کچھ اور

سنائی دیتا ہے۔

لو۔۔۔۔۔۔۔ہاتھوں کے بھی کان ہوتے ہیں کیا؟

ہاں ہوتے ہیں تو تمہیں کوئی اور آواز نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔

اسی لمحے حامدہ کا جسم لرزنے لگا پہلے اس نے وہم سمجھا مگر پھر اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ

جو کچھ سن رہی ہے حقیقت ہے الہی بخش کا دل دھڑک رہا تھا لیکن دھک دھک کے

بجائے وہاں سے اللہ اللہ کی آواز آرہی تھی۔اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔

کیا ہو۔۔۔۔۔۔۔۔کیا ہوا حامدہ؟ الہی بخش نے پوچھا

تمہارے دل سے اللہ اللہ کی آواز آرہی ہے۔

یہی تو مجھے لگ رہا تھا۔میرے ہاتھ نے بھی یہی سنا تھا۔تو یہ سچ ہے؟

ہاں جی یہ سچ ہے۔

الہی بخش نے حامدہ کا ہاتھ تھام لیا۔حامدہ میری بات غور سے سنو تم نے ٹھیک کہا تھا یہ

سب وہم ہے نہ میرا دل بڑا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔۔آسمان اور زمین جتنا۔۔۔۔۔۔۔ ورنہ ہی

یہ تو راز اصل ہے۔ یہ سب وہم ہے اور وہم کسی کو نہیں بتاتے۔

لیکن۔۔۔۔۔۔۔

میں تمہیں حکم دے رہا ہوں یہ بات کبھی کسی سے نہیں کہنا ورنہ۔۔۔۔۔۔۔

نہیں کہوں گی جی۔ کبھی تمہارا حکم ٹالا ہے۔ حامدہ نے لجاجت سے کہا۔ پر ایک بات میری بھی مانو گے۔

بولو

دیکھو۔ اب دکان پر نہ جانا بچے پریشان ہیں۔ تمہارے پیچھے بھاگیں گے تو کاروبار چوپٹ ہو جائے گا۔ ہماری تو گزر چکی۔ مگر انہیں تو زندگی گزارنی ہے۔ گھر چلانا ہے۔ سمجھ رہے ہونا۔

الہی بخش نے اثبات میں سر ہلایا۔ سمجھ رہا ہوں حامدہ تم ٹھیک کہتی ہو مگر کسی طرح انہیں سمجھاؤ کہ میں بیمار نہیں ہوں اب تو صحت مند ہو گیا ہوں میں۔

حامدہ کا ہاتھ اب بھی لرز رہا تھا۔

جاؤ۔۔۔۔۔ اب تم سو جاؤ۔

الہی بخش حامدہ کے جانے کے بعد بھی دیر تک جاگتا رہا۔ یہ اس کا معمول تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس رات بھی ساوی اس کے پاس آئی تو وہ دور سے ہاتھ ہلانے لگا۔ نہیں ساوی اب واپس چلی جاؤ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور آج کے بعد کبھی نہ آنا۔

کیوں الہی بخش۔۔۔۔۔۔۔۔ ناراض ہو گئے ہو کیا؟

نہیں ساوی۔ ناراض تو تم سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ تمہارے تو بڑے احسان ہیں مجھ پر۔ بس اب تم سے رشتہ ٹوٹ گیا۔ یہاں تک تھا ہمارا ساتھ۔

بے وفائی کر رہے ہو؟

نہیں سادی بے وفائی کا دور ختم ہو گیا۔ اب تو وفا کا دور ہے۔ میں اس کا ہو گیا جس کا پہلے ہی ہو جانا چاہیے تھا۔

سادی نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا پھر آگے بڑھ کر اس کے سینے پر ہاتھ رکھا اور مسکرا دی۔ مبارک ہو الٰہی بخش تمہیں منزل مل گئی میں جاتی ہوں۔ الوداع۔

الوداع سادی

سادی چلی گئی۔ الٰہی بخش پھر بھی جاگ رہا تھا وہ سرگوشی میں دل کی آواز سے آواز ملا رہا تھا۔ دیوانگی میں بھی تا ہوش تھا اسے کہ بچوں کی نیند خراب نہیں ہونی چاہیے۔

☆————————☆————————☆

دن رات بدل گئے تھے۔ زندگی بدل گئی تھی۔ الٰہی بخش اب دکان پر نہیں جاتا تھا۔ بعض اوقات دن میں کئی کئی بار اس پر دورے پڑتے اور کبھی دورے کے بعد کی کیفیت اس پر کئی کئی دن طاری رہتی اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کئی کئی دن وہ نارمل رہتا۔ نارمل ہوتا تو وہ الٰہی بخش ہوتا۔ کیفیت میں ہوتا تو کچھ ورد کرنے لگتا۔ ایسے میں زیادہ تر وہ چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ اس کے ہونٹ ہلتے رہتے مگر آواز نہ ہوتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کیفیت میں اس پر وحشت طاری ہو جاتی۔ ایسے میں وہ بغیر بتائے گھر سے نکل جاتا۔ کوئی سے روک نہیں سکتا تھا۔ اس میں بلا کی طاقت آ جاتی۔ وہ کسی کے قابو میں نہ آتا۔ نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرتا ———— اور آخر میں گھر لوٹ آتا۔ مگر کبھی تو وہ کئی کئی دن گھر سے غائب رہتا۔ واپس آتا تو وہ تھکن سے چور ہوتا۔ نڈھال ہوتا رہتا۔ یہ معلوم نہ ہوتا کہ وہ کہاں رہا ہے۔

وہ پہلے بھی نظریں نیچی کر کے بات کرنے کا عادی تھا۔ مگر اب تو وہ نظریں اٹھاتا ہی نہیں تھی۔ ایک بار اس نے نظریں اٹھائیں تو حامدہ کو خوف آنے لگا۔ اس کی آنکھوں کو وہ چمک ۔۔۔۔۔۔۔۔ الا ان ان سے توانائی پھوٹتی اور مسخر کرتی محسوس ہوتی تھی۔ ان میں تنی طاقت محسوس ہوتی تھی کہ لگتا تھا وہ پہاڑ کو بھی اٹھا کر ایک طرف رکھ سکتی ہیں۔

پھر ایک دن حامدہ کو اندازہ ہو گیا کہ الٰہی بخش جب کیفیت میں ہو تو اسے نظر انداز کرنے میں ہی عافیت ہے۔ اس سے بات کرنا، اسے چھیڑنا ٹھیک نہیں۔ دشواری یہ تھی کہ بعض اوقات ظاہری حالت سے یہ پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ وہ کیفیت میں ہے۔

اس روز وہ لنگری میں مصالحہ کوٹ رہی تھی۔ سامنے چارپائی پر الٰہی بخش بیٹھا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ حامدہ نے تین چار بار اسے پکارا۔ پھر جھنجھلا کر بولی۔ سنتے نہیں ہو جی ذرا دروازہ کھول دو جا کر۔ کوئی ہے دروازے پر۔

اس بار الٰہی بخش نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور بولا مجھے تنگ نہ کر تو لنگری توڑتی رہ۔ بات زبان سے ادا ہوئی تھی کہ پتھر کی مضبوط لنگری ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ حامدہ نے الٰہی بخش کو دیکھا۔ وہ پھر اپنی سوچوں میں گم ہو گیا تھا۔ ادھر دروازے پر دستک اب بھی ہو رہی تھی۔ اب مصالحہ پیسنا تو ممکن نہیں تھا۔ وہ دروازہ کھولنے چلی گئی۔

حامدہ نے اس واقعے کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ ایسا ہوتا ہے کہ پتھر کی لنگری رکھے رکھے بھی ٹوٹ جاتی ہے۔ مصالحہ پیسنا ضروری تھا۔ وہ مصالحہ لے کر پڑوس میں چلی گئی۔

ہماری لنگری ٹوٹ گئی ہے آج اس نے پڑوسن سے کہا۔

اس نے ہاتھ کا مصالحہ لنگری پر پہلا رگڑا ہی لگایا تھا کہ یہ لنگری بھی ٹوٹ گئی۔ اس بار حامدہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کیا یہ الٰہی بخش کی بددعا کا اثر ہے۔

آنے والے وقت نے ثابت کر دیا کہ اب وہ جو لنگری بھی استعمال کرنا چاہے گی وہ ٹوٹ جائے گی۔ اس نے یکے بعد دیگرے پانچ لنگریاں منگوائیں اور پانچوں پہلے ہی رگڑے میں ٹوٹ گئیں۔

مدثر جھنجلا گیا۔ کیا کرتی ہو اماں لنگری کے ساتھ۔ جانتی ہو فیصل آباد سے لانی پڑتی ہے۔ میں ہر بار دیکھ کر پکی لنگری لایا ہوں۔

بس بیٹے ایک بار اور لا دے۔ اب نہیں ٹوٹے گی انشاءاللہ۔ حامدہ نے گہری سانس لے کر کہا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس نے خود مصالحہ پیسنا چھوڑ دیا۔ اس کام کے لئے اس نے ایک نوکرانی رکھ لی۔

مگر اب وہ پریشان ہو گئی تھی۔ اس کیفیت میں الٰہی بخش کو تو کچھ پتا نہیں ہوتا تھا۔ کوئی بیٹا کچھ کہہ بیٹھے اور خدانخواستہ الٰہی بخش جواب میں کچھ کہہ دے۔ وہ ہر وقت بیٹوں کو سمجھانے ٹوکنے لگی۔ یہ اس کے لئے روگ بن گیا تھا۔

☆----------☆---------☆

ایک دن یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا کہ کیفیت میں الٰہی بخش کہاں کہاں جاتا ہے اور کیا کرتا پھرتا ہے

الٰہی بخش دو دن سے غائب تھا۔ اب یہ ایسا معمول بن گیا تھا کہ وہ لوگ پریشان ہی نہیں ہوتے تھے۔ اس روز دوپہر سے کچھ دیر پہلے دروازے پر دستک ہوئی۔ حامدہ کو خیال ہوا کہ الٰہی بخش آیا ہے۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے اجنبی چہرے تھے۔ ایک بوڑھی عورت تھی، ایک ادھیڑ عمر عورت، ایک مرد بھی تھا۔ بوڑھی عورت کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا۔

جی کس سے ملنا ہے؟ حامدہ نے پوچھا۔

بابا یہیں رہتا ہے؟ بوڑھی عورت نے پوچھا

کون بابا؟ حامدہ کو حیرت ہوئی۔

پانی والا بابا

کونسا پانی والا بابا؟ کس کو ڈھونڈ رہی ہو؟ کوئی نام تو ہوگا اس کا؟

نام کہاں بتاتا ہے وہ کہتا ہے------بندہ ہوں خدا کا۔ نام تو اسے پانی والا بابا کہتے ہیں۔ وہ بس پانی دم کر دیتا ہے۔ کہتا ہے---------اندر آگ جل رہی ہے۔ بجھتی ہی نہیں۔ پانی پلا دو۔

اسی دوران ہی بخش آ گیا۔ عورت نے کہا یہی تو ہے پانی والا بابا

کیا بات ہے بہن۔ الٰہی بخش نے پوچھا۔

بابا---------میرا بیٹا واپس آ گیا ہے۔ میں تیرے لیے مٹھائی لائی ہوں۔

میرے لیے کیوں لائی ہو مٹھائی۔

تم نے کہا تھا کہ ایک مہینے کے اندر آ جائے گا۔ اٹھائیسویں دن یہ گھر آ گیا۔ میرے کہنے سے نہیں یہ اللہ کے حکم سے آیا ہے۔ الٰہی بخش نے ترشی سے کہا۔ مجھے تمہاری مٹھائی نہیں چاہیے۔ جاؤ اللہ کے نام پر غریبوں کو دو۔ اللہ کا شکر ادا کرو۔ یہ کہہ کر الٰہی بخش اندر کمرے میں چلا گیا۔

دونوں عورتیں حامدہ کی خوشامد کرنے لگیں کہ وہ مٹھائی رکھ لے۔ میں کیسے لے لوں؟

حامدہ نے کہا۔ جب بابا جو منع کر رہا ہے۔

حامدہ نے ان سے تفصیل پوچھی تو پتا چلا کہ وہ لوگ نواں شہر سے آئے ہیں۔ الٰہی بخش

کبھی کبھی وہاں جاتا ہے۔ وہاں کسی کے گھر سے پانی مانگتا ہے اور کئی کئی جگ پانی پی جاتا ہے۔ کہتا ہے اندر آگ سی آگ ہے بجھتی ہی نہیں۔

بابا اسی گھر سے پانی مانگتا ہے جو کسی مشکل میں ہوں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بڑی مشکل میں ۔۔۔ ادھیڑ عمر کی عورت نے بتایا۔

تمہارا کیا مسئلہ تھا؟ حامدہ نے پوچھا۔

یہ میرا بیٹا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کا شوہر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بوڑھی عورت نے ادھیڑ عمر عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ یہ بارہ سال پہلے روزگار کے سلسلے میں کراچی گیا تھا۔ پہلے تو خط لکھتا رہا۔ پھر تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ جیتا ہے یا مر گیا۔ ہم بڑی تنگی میں رہے۔ اس کے بچے بھی تھے۔ جیسے تیسے گزارہ ہوتا رہا۔ بچے بڑے ہوئے تو کچھ سہارا ملا۔ پھر اس دن بابا آیا' پانی مانگا میں نے پانی دیا وہ دو جگ پانی پی گیا پھر بولا بہن تیرا بیٹا ایک مہینے کے اندر اندر آ جائے گا۔ اٹھائیسویں دن میرا بیٹا آ گیا۔

وہ اب بھی مٹھائی کے لئے اصرار کر رہی تھی کہ الٰہی بخش کمرے سے نکل آیا تم گئی نہیں؟ اس نے پوچھا۔

مٹھائی لے لو بابا۔

میں نے کہا نا تمہارا بیٹا اللہ کے حکم سے واپس آیا ہے' اس کا شکر ادا کرو۔ اپنی حیثیت کے مطابق اس کے نام کی خیرات وغیرہ بانٹ دو۔

حکم اللہ کا تھا' بابا پر وسیلہ تو تو تھا۔

یہ سن کر الٰہی بخش آگ بگولا ہو گیا' کفر کرتی ہے' وہ دھاڑا میرے کہنے سے تیرا بیٹا واپس

آ گیا، تو مٹھائی لے آئی میرے کہنے سے یہ واپس چلا گیا تو میرا سر پھوڑ دے گی ہے نا؟ جا چلی جا۔۔۔۔۔۔۔۔اس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔

حاجتمند و ڑگئی، خدا کے لئے۔۔۔۔۔۔۔۔آپ لوگ چلے جاؤ یہ مٹھائی غریبوں میں بانٹ دینا۔

وہ لوگ چلے گئے۔

ان کے بعد اسی طرح لوگ آتے رہے، کسی کے ہاں اولاد ہوئی تھی کسی کا شوہر ٹھیک ہو گیا تھا۔ کسی کے گھر میں برکت ہوگئی تھی۔ سبھی نذرانے لاتے تھے لیکن الٰہی بخش نے کبھی کوئی چیز قبول نہیں کی۔ اس طرح خاصی تنگی ہو جاتی تھی۔

پھر ایک دن وہی دونوں عورتیں چلی آئیں۔ اس بار ان کے چہرے ستے ہوئے تھے۔ الٰہی بخش گھر میں موجود تھا۔

بابا۔۔۔۔۔۔۔۔میرا بیٹا چلا گیا تم نے مجھے بددعا کیوں دی تھی؟ بوڑھی عورت نے کہا۔

میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تمہاری سوچ غلط ہے۔ الٰہی بخش نے نرم لہجے میں کہا نہ وہ میری دعا سے آیا تھا نہ میری بددعا سے گیا ہے۔ سب اللہ کا حکم ہے۔

مجھ پر رحم کرو۔

کفر مت بولو بہن، الٰہی بخش دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار پیٹنے لگا، تم میرا سر پھوڑ دو۔ میں نے کہا تھا نا کہ چلا جائے تو میرا سر پھاڑ دینا آ کے۔

دونوں عورتیں شرمندہ نظر آ رہی تھیں۔ بابا ہمارے لئے دعا کر دو نا۔ بڑی عمر کی عورت گڑگڑائی۔

دیکھو وہ پھر آنے لگا۔ الٰہی بخش بولا مگر اب وہ آتا جاتا رہے گا، ہاں بھی تو اس کے آنے کی دعا کرنے والے موجود ہیں۔ تم سے زیادہ انہیں اس کی ضرورت ہے۔

لیکن بابا

بس اب جاؤ الٰہی بخش نے تھکا سادہ لہجے میں کہا

اس بار دونوں عورتیں خاموشی سے چلی گئیں۔

پھر یہ مشہور ہو گیا کہ پانی والا بابا کچھ نہیں لیتا۔ بلکہ دینے والوں سے ناراض ہو جاتا ہے ۔اس کے بعد نذرانوں والے مسئلے سے نجات مل گئی۔

☆-------------☆---------------☆

الٰہی بخش کی طبیعت میں ٹھہراؤ آتا جا رہا تھا۔ وہ جو بے خودی اور مدہوشی کی کیفیات اس طاری ہوتی تھیں' ان کے درمیانی وقفے بڑھے اور دورانیے کم ہوتے جا رہے تھے۔ جو روشنی اس کے اندر تھی' چانک ہی اسے ملی تھی اور اس کے ظرف سے زیادہ تھی۔ مگر اب اتنے عرصے میں وہ تدریج اس کا عادی ہوتا گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں اس کے مزاج میں ٹھہراؤ' استقامت اور ٹھنڈک آ گئی تھی۔ وہ کیفیت اس پر اب بھی طاری ہوتی تھی۔ بلکہ کئی کئی دن طاری رہتی تھی۔ لوگ اسے تنگ بھی کرتے تھے۔ مگر اب اس کی نوبت بے قابو نہیں ہوتی تھی۔ دینے والے نے اس کا ظرف بڑھا دیا تھا۔ اس کی سمائی بڑھ گئی تھی۔

اس کا حلقہ بھی بہت بڑھ گیا تھا۔ لوگ باقاعدہ اس کے مرید بن گئے تھے اور وہ خاصی تعداد میں تھے۔ ہر روز دو چار مرید آتے رہتے تھے۔ الٰہی بخش کسی سے کچھ نہ لیتا تھا۔ دنیاوی معاملات سے اسے غرض نہیں رہی تھی۔ پھر بھی ایک روز یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ یہ زبردستی کی مہمان داری بیٹوں کے لیے بوجھ ہے۔ اس کا ذہن اس مسئلے میں الجھ گیا۔ سہارا ٹرا سے اس کا حل سوجھ ہی گیا۔

گاؤں سے باہر سامنے پہاڑی پر درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ وہاں چیڑ کا ایک بہت اونچا اور گھنا درخت تھا۔ اس درخت کے نیچے بیٹھنا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ عرصہ ہوا کہ وحشت کے عالم میں اس نے ادھر ادھر بھٹکنا چھوڑ دیا تھا۔ جب بھی ایسا ہوتا' وہ اس درخت کے نیچے آ بیٹھتا اور ذرا دیر میں پرسکون ہو جاتا۔ پھر وہ بیٹھا اللہ کا شکر ادا کرتا رہتا۔

ب اس نے معمول بنالیا کہ صبح ہی وہ گاؤں سے نکل جاتا اور اس درخت کے نیچے جا بیٹھ۔ حاجرہ سے کہہ دیتا کہ کوئی آئے تو اسے وہیں بھیج دے۔ پھر اس نے نرمی سے عاجزی سے اپنے مریدوں سے کہا کہ وہ ہر روز کسی بھی روز نہ آیا کریں۔ بلکہ ہر مہینے چاند کی گیارہ تاریخ کو یہاں آیا کریں۔

س کی زبان سے نکلی ہوئی بات پوری ہونے کے کئی واقعات ایسے ہوئے تھے کہ لوگ اس سے ڈرنے لگے تھے۔ انہوں نے بلا تامل اس کی بات مان لی۔ پہلے ماہ چاند کی دس تاریخ کو اس نے بیٹوں سے بات کی۔ کل مہمان آئیں گے۔ میں ان کے لیے کھانے کا بندوبست کرنا چاہتا ہوں۔

آپ حکم کریں ابا ہم سب تعمیل کرنے والے ہیں۔

گلی صبح بیٹوں نے کھانے کا سب سامان پہاڑی پر پہنچا دیا۔ الٰہی بخش نے کھانا پکانا شروع کیا۔ جلدی مرید آنے لگے۔ انہوں نے یہ ذمہ داری سنبھال لی۔ الٰہی بخش اس فکر سے آزاد ہو گیا وہ لوگوں کے مسائل سننے لگا۔

اس دن کے بعد ہر اسلامی ماہ کی گیارہویں تاریخ کو یہ معمول بن گیا۔ کھانے کا اہتمام لنگر کا روپ دھار گیا۔ پھر ایک اور تبدیلی آئی۔ الٰہی بخش نے حاجت مندوں کو تعویذ لکھ کر دینے شروع کر دیے۔ تھوڑے ہی عرصے میں شہرت ہو گئی۔ اللہ نے الٰہی بخش کے تعویذوں کو خاص تاثیر عطا کی تھی۔

بعض لوگ ایسے ہوتے تھے جن کے مسائل ہنگامی نوعیت کے ہوتے تھے۔ وہ گیارہ تاریخ کا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ وہ پہاڑی پر پہنچ جاتے تھے۔ الٰہی بخش محسوس کرتا کہ معاملہ زیادہ اہم ہے تو وہ اسی وقت تعویذ لکھ دیتا۔ ورنہ گیارہ تاریخ کو آنے کا کہہ دیتا۔

پہلے کی نسبت اسے زیادہ فرصت میسر تھی۔ پہاڑی پر بیٹھ کر وہ گھنٹوں دنیا سے بے خبر سوچتا رہتا۔ کئی باتیں جو کبھی اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھیں۔ مگر اب غور کرتے کرتے، اس کے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوتا۔ لگتا کہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہے۔ لیکن وہ اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔۔۔۔۔۔۔ دوسروں کو سمجھا نہیں سکتا تھا۔ ایسے میں وہ جس بے بسی اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہوتا، وہ وحشت کا روپ دھار لیتی۔ وہ اٹھ کر مضطربانہ ٹہلنے لگتا۔ زور زور سے خود سے باتیں کرتا۔ کبھی کوئی پتھر اٹھا کر دور اچھال دیتا۔ ایسے عالم میں جو لوگ اسے دیکھتے، دیوانہ ہی سمجھتے۔ یہ بے بسی اور جھنجھلاہٹ اسے مطالعے کی طرف لے گئی۔ شاعری کے مجموعے اس کے پاس پہلے ہی سے تھے۔ مگر اب وہ انہیں مختلف روشنی میں دیکھتا تھا۔ اس کے بعد مطالعے کی طلب بڑھی تو وہ دینی اور مذہبی کتب کی طرف راغب ہو گیا۔ مگر اس کے حصے میں وہی کتابیں آئیں جو عام تھیں۔ خاص کتابوں تک اس کی رسائی ممکن ہی نہیں تھی۔

الٰہی بخش کو احساس ہوتا تھا کہ اس کے سینے میں کوئی معلم بیٹھا ہے۔ وہ اسے پڑھاتا، پڑھنے پر اکساتا اور مشکل مسائل سمجھاتا ہے۔ وہ جو کوئی بھی تھا، بہت اچھا استاد ۔۔۔۔ بہت اچھا رہنما تھا۔ اس نے کبھی اسے بھٹکنے نہیں دیا۔

☆۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔☆۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔☆

ڈیرے سے دور فرید شاہ کی باغڑی کے سامنے کچھ سادات اکٹھے تھے۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ سامنے ہی شاہ فرید کا پکا مکان تعمیر ہو رہا تھا۔

یہ تم نے اچھا کیا شاہ فرید کہ مکان کی طرف دھیان دیا۔ افضل شاہ نے کہا۔ ساری زندگی کچے مکان میں گزار دی۔

میں تو اب بھی نہیں چاہتا تھا۔ شاہ فرید بولے۔ اس فانی دنیا میں مکان پختہ کرنے کا فائدہ؟ میں کچے مکان میں ہی خوش تھا۔ مگر بچوں کے خیال سے راضی ہو گیا۔

ہاں بھئی' زمیند ر لوگ ہی پیچھے رہ گئے اس معاملے میں۔ شاہ نصیر نے تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ کام کرنے والوں نے اونچے پکے مکان بنا لیے۔

شاہ فرید بہت مختلف مزاج کے تھے۔ روایات کی پاس داری کرنے والے لیکن بے حد منکسر المزاج۔ غرور اور گھمنڈ سے کوسوں دور۔ وہ بولے مجھے کسی سے مقابلہ تھوڑا ہی کرنا ہے۔ ہر انسان اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ کسی کو اللہ نے دیا اور اس نے پکا مکان بنالیا تو میرے لیے یہ خوشی کی بات ہے۔

نہیں شاہ فرید یہ ضروری تھا۔ انور شاہ نے کہا۔ یہ وقت ایسا ہے کہ نیچ لوگ سر پر چڑھنے لگے ہیں۔

شاہ فرید مصلحتاً خاموش ہو گئے۔ ورنہ عام طور پر وہ ایسی باتوں سے اختلاف کرتے تھے۔

ہاں جی یہ تو سچ ہے' افضل شاہ نے تائید کی۔ وہ پیر بخش جلاہے کے بیٹے الٰہی بخش کا سنا تم نے؟

کون وہی مذہ جنگ والا؟ فرید شاہ بولے اس کا تو برسوں سے نہیں سنا۔

لو۔۔۔۔۔۔۔ سب کو معلوم ہے کہ وہ دیوانہ ہو گیا' انور شاہ نے بتایا۔ دکان کا روبار بیٹے سنبھالتے ہیں۔

وہ تو ہوا تو پرانی بات ہو گئی۔ اب تو وہ پیر بن گیا ہے۔ افضل شاہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

ہاں جی، مرید بھی کم نہیں ہیں اس کے۔شاہ نصیر نے کہا۔تعویذ بھی لکھ کر دیتا ہے۔ہر مہینے کی گیارہویں کو لنگر بھی ہوتا ہے۔

ب جلا ہے بھی پیر بننے لگے۔افضل شاہ بولے۔

وحید شاہ خاموشی سے باتیں سن رہے تھے۔انہوں نے اب تک لب کشائی نہیں کی تھی۔

چانک سامنے کچے رستے پر انہیں الٰہی بخش سڑک کی طرف جاتا دکھائی دیا۔لو بھئی ------بڑی عمر ہے اس کی۔ہم اس کی باتیں کر رہے تھے اور وہ آ گیا۔

نور شاہ نے اہی بخش کو پکارا۔الٰہی بخش ---اوالٰہی بخش۔

اہی بخش اس وقت کیفیت میں تھا۔انور شاہ کی آواز محویت نہ توڑ سکی۔

دیکھو تو کیسے نظر انداز کر رہا ہے ہمیں۔دماغ چڑھ گیا ہے اس کا پیر بن کے۔

افضل شاہ نے تبصرہ کیا۔

اس پر نور شاہ کو جلال آ گیا ہے۔او الٰہی بخش سنتا نہیں ہے۔انہوں نے گرج کر کہا۔ ادھر آ۔

اس بار اہی بخش کو احساس ہوا کہ کسی نے اسے پکارا ہے۔اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ بیٹھک کے سامنے سے دو لوگ بیٹھے نظر آئے۔شاہ جی -------مجھے آواز دی آپ نے؟ اس نے نرم لہجے میں پوچھا

ہاں اہی بخش ادھر تو آ۔

اہی بخش ان کے قریب چلا گیا اور ہاتھ باندھ کر خادموں کی طرح کھڑا ہو گیا۔حکم سرکار۔

تو بہرا ہو گیا ہے اہی بخش یا جان بوجھ کر آواز نہیں سنی تھی۔انور شاہ نے ترش لہجے میں

کہا۔

نہیں شاہ جی آواز نہیں سنی تھی۔ ورنہ گستاخی کیسے کرتا۔ الٰہی بخش نے عاجزی سے کہا'

گستاخی کیسی اب تو تو بھی شاہ جی بن گیا ہے۔ افضل شاہ نے طنز کیا۔

توبہ سرکار شاہ جی کون بن سکتا ہے۔ وہ تو اللہ پیدا فرماتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے یہ عزت پیدا ہوتے ہی مل جاتی ہے۔ الٰہی بخش نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔

میں تو جلاہا پیدا ہوا تھا سرکار

پھر بھی پیر تو بن ہی گیا ہے تو۔ شاہ نصیر بولے

میں کہاں کا پیر۔ پیر، پیری تو آپ لوگوں کے لئے ہے۔ میں تو خادم ہوں آپ کا۔

تو یہ جو مرید پال رکھے ہیں تو نے؟

دل تو بہت خوش ہوتا ہوگا، حمید شاہ بولے۔

خوش تو میں ہر حال میں رہتا ہوں سرکار۔ اس عزت کی بھی آرزو نہیں کی تھی۔ پر وہ جسے چاہے عزت دے۔ اس کی مرضی تو حرف آخر ہے۔ الٰہی بخش نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی۔

یہ تو بتا تعویذ میں کیا لکھتا ہے؟

ضرورت کے مطابق اللہ کے کلام کی کوئی آیت لکھ دیتا ہوں شاہ جی' تاثیر تو وہی ڈالنے والا ہے۔

تو اب تو عالم بھی بن گیا۔

نہیں سرکار علم تو بہت بڑی چیز ہے۔ جیسی جس کے گمان میں آئی۔ انسان تو بس صاحب بےچاری بڑی صبر والی ہے یہ مخلوق۔

لے۔۔۔۔۔۔۔انسان میں صبر کہاں۔وہ تو بہت بے صبرا ہے۔

گستاخی معاف پیرو۔الٰہی بخش نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔پر سب کچھ اس کے صبر

ہی سے شروع ہوتا ہے۔وہ ایک شاعر نے کہا تھا کبھی

میں وہ صبر صمیم ہوں جس نے

بار امانت سر پہ لیا تھا

کیسا شعر کہا ظالم نے'

شاعر تو یونہی بکتے ہیں۔انور شاہ نے غصے سے کہا

نا پیرو نا بہت بڑا شعر کہا ہے اس نے

میری سمجھ میں تو یہ صبر نہیں آتا

میری سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا پر اب آنے لگا ہے۔الٰہی بخش کہیں کھو گیا۔اب جیسے وہ

ان کے درمیان نہیں تھا۔اس کا لہجہ اور انداز ہی بدل گیا۔اب جیسے وہ خود سے باتیں کر رہا

تھا۔اللہ جی نے پکارا۔۔۔۔۔۔۔۔ہے کوئی جو میری امانت کا بوجھ اٹھائے۔یہ سن کو

سمندر کی سانسیں ٹوٹنے لگیں۔پہاڑ ہیبت سے لرزنے لگے۔پوری کائنات پر لرزہ

طاری ہو گیا۔کسی کو طاقت' مجال نہیں تھی کہ وہ بوجھ اٹھاتا۔پھر اللہ جی نے وہ امانت

انسان کو سونپ دی اور انسان سے اٹھائے مضطرب اور سرگرداں ہے۔یہ کائنات کا

سب سے بڑا صبر ہے۔

یہ تو واقعی دیوانہ ہے بے سروپا باتیں کر رہا ہے۔انور شاہ نے کہا

مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔شاہ فرید بولے وہ پہلی بار کچھ بولے تھے۔لیکن نہیں یہ دوبا تیں کر

رہا ہے جو دیوانوں ہی کی سمجھ میں آ سکتی ہیں۔ پھر وہ الٰہی بخش کی طرف مڑے۔ ورنہ وہ امانت کیا تھی؟

وہ امانت اللہ کی تمام صفات کا پرتو تھا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہلکا سا عکس ۔۔۔۔۔۔۔ میں سمجھا نہیں شاہ فرید نے کہا۔

اللہ نے اپنی تمام صفات انسان کو سونپ دیں۔ رحم، کرم، قہر، جبر، پوری ننانوے صفات اور پھر اسم ذات نور سے لکھ کر پہلے ہی اس کی پیشانی میں رکھ دیا تھا۔ اللہ نے جب جن و ملائک کو حکم دیا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو تو وہ شرک کا حکم تو نعوذ باللہ نہیں دے رہا تھا۔ وہ سجدہ آدم علیہ السلام کے لئے نہیں تھا۔ وہ تو پیشانی میں محفوظ اسم ذات کے لئے تھا' اللہ کے لئے تھا۔ اسی لئے تو شاعر نے کہا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں وہ اسم عظیم ہوں جس کو جن و ملک نے سجدہ کیا تھا۔ پھر اپنی ننانوے صفات کا عکس انسان پر ڈالا تو اس نے یہ بتا دیا کہ انسان اس کا خلیفہ' اس کا نائب ہے۔ اس میں اتنا صبر ہے کہ وہ یہ بوجھ اٹھا سکتا ہے۔ تو انسان میں رحیمی بھی ہے' غفاری بھی' جباری بھی ۔۔۔۔۔۔۔

کیا کفر بک رہا ہے' افضل شاہ غرائے۔

لیکن الٰہی بخش کہیں کھویا ہوا تھا۔ اس نے ان کی بات نہیں سنی۔ اسے تو ہوش بھی نہیں تھا کہ وہ کچھ لوگوں کے درمیان ہے۔ وہ تو جیسے خود سے باتیں کر رہا تھا۔ تو انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ان صفات کے درمیان توازن قائم کرنا ہے۔ رحمتوں کا صفات کا یہ توازن صرف ایک انسان نے قائم کر کے دکھایا۔ میرے حضور ﷺ نے۔ یوں امانت کا حق ادا ہوا اور انسانیت سرخرو ہوئی۔

شاہ فرید حیرت سے سن رہے تھے۔ یہ الفاظ' یہ باتیں الٰہی بخش کی نہیں لگ رہی تھیں۔ وہ تو

عام سا آدمی تھا' جو ظلم کرنے سے بھی کوسوں دور تھا۔

ورنہ انسان تو اعتدال سے گزر جانے والا ہے۔ الٰہی بخش کہے جا رہا تھا۔ وہ رحم کرنے

میں حد سے بڑھا تو ظالم ہو گیا۔

وہ کیسے؟ شاہ فریہ نے پوچھا۔

آدمی جب حد سے گزر کر رحم کرتا ہے تو جس پر رحم کیا جا رہا ہو' اس پر وہ ظلم ہو جاتا ہے۔

یہی نہیں' خود رحم کرنے والا اپنے اوپر بھی ظلم کرتا ہے اور انسان نے قہر کے معاملے میں

عتدال کا دامن چھوڑا تو چنگیز خان' ہلاکو خان اور ہٹلر بن گیا۔ ہر صفت رحمت والی ہے

لیکن انسان نے سے انسانوں کے لئے ایذا کا باعث بنا دیا۔ یہ امانت میں خیانت

ہوئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔

چھا الٰہی بخش یہ بتاؤ کہ قہر اور جبر رحمت کیسے ہیں؟ شاہ فریہ نے پوچھا۔

الٰہی بخش دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار پیٹنے لگا۔ میرے اللہ کی صفت تو رحمت ہی

رحمت ہیں۔ رحمت کے سوا کچھ نہیں۔ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا ور کچھ سوچنے لگا۔

خاصی دیر کے توقف کے بعد وہ بولا۔ فرض کر لیں کہ میں نے اپنے دل میں کسی برائی کا

رادہ کیا ور یہ سوچ کر گھر سے نکلنا چاہا۔ اللہ کے حکم سے میرے بچے کے پیٹ میں درد

ٹھا۔ مجھے بچے سے محبت ہے تو میں اپنا ارادہ بھول کر اس کی دوا دارو میں لگ جاؤں گا۔

یہ جبر ہے۔ بچے کے پیٹ میں درد کی وجہ سے میں ارتکاب گناہ سے بچ گیا ور فرض کر

لیں کہ میں پھر بھی باز نہیں آیا۔ میں وہ گناہ کرنے نکلا۔ س بار اللہ کے حکم سے مجھے کسی

شبہے میں پولیس نے پکڑ لیا۔ تھانے میں مار پڑی۔ مگر بالآخر جان چھوٹ گئی۔ مگر میں

رتکاب گناہ نہ کر سکا یہ بھی جبر ہے۔۔۔۔۔ اور اللہ کی رحمت ہے۔ یہ پہلے کی نسبت

زیادہ جبر ہے۔ اس لئے کہ پہلے مرحلے میں میرا صرف ارادہ تھا گناہ کا تو جبر بھی ہلکا تھا۔ مگر اب میں گناہ کے ارادے سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ تو رحمت کرنے والے نے جبر بڑھا دیا۔ مجھے قید کر دیا۔ یعنی مجھے مہلت دی کہ میں اپنے ارادے سے باز آ جاؤں۔ اب فرض کر لیں کہ میں بدنصیب پھر بھی باز نہ آیا۔ تھانے سے چھوٹتے ہی میں آگے بڑھا کہ یہ گناہ تو میں کر کے ہی رہوں گا۔ اب منزل سے کچھ ہی فاصلے پر میرا حادثہ ہو جاتا ہے۔ میری ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے۔ اب میں گناہ کی اہلیت ہی کھو بیٹھتا ہوں۔ عمر بھر کے لئے لنگڑا تو ہو گیا لیکن میں پختہ ارادے کے باوجود اس گناہ سے تو بچ گیا۔ یہ جبر اور رحمت ہے۔ ہے کہ نہیں؟ اللہ کو بندے کو گناہ سے بچانا ہے اللہ نے قہر کر کے رحمت کی اور اس کے نامہ اعمال کو اور سیاہ ہونے سے بچا لیا۔ پھر دنیاوی تکلیفیں آخرت کی سزا میں کمی کا موجب بھی ہوتی ہیں۔

شاہ فرید کے منہ سے بے ساختہ تحسین نکل گیا۔ اور اس کا جسم لرز رہا تھا۔

چانک الٰہی بخش کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس کے منہ سے یک نعرہ مستانہ نکلا۔

اللہ ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پھر وہ اس کی تکرار کرتا چلا گیا۔ اللہ ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اللہ ہو۔۔۔۔۔۔۔ اور وہ ڈگمگاتے قدموں سے ایک طرف چل رہا۔ وہ لوگ سے جاتے دیکھ رہے تھے۔ سب کے جذبات مختلف تھے۔

☆----------☆----------☆

شاہ فرید کا مکان مکمل ہو چکا تھا۔

اس روز دوپہر کو وہ باہر نکلے۔ ان کا دل کچھ گھبرا رہا تھا۔ وہ سامنے گندم کے کھیت کی طرف گئے۔ سامنے ڈنڈی پر انہیں الٰہی بخش آتا دکھائی دیا۔ وہ کانچ چوک کی طرف

سے آ رہا تھا۔ انہوں نے اسے آواز دینے کا ارادہ کیا لیکن پھر خود کو روک لیا۔ اسی لمحے الٰہی بخش نے سر گھما کر دیکھا اور ان کی نظر ان پر پڑ گئی۔ وہ کھیت کے بیچوں بیچ بنے کچے رستے پر مڑ گیا، جہاں وہ کھڑے تھے۔

ان دنوں الٰہی بخش بہت تکلیف میں تھا۔ اس کا جوڑوں کا درد بہت بڑھ گیا تھا۔ اس کا حلیہ بھی بہت خراب ہو رہا تھا۔ کپڑے میلے چکٹ تھے اور بال الجھے ہوئے۔ شاہ فرید کے سامنے پہنچ کر اس نے ادب سے انہیں سلام کیا اور پھر ان کا ہاتھ عقیدت سے چوما۔

شاہ فرید نے سلام کا جواب دینے کے بعد پوچھا۔ مجھے پہچانتے ہو الٰہی بخش۔

کیوں نہیں شاہ جی سرکار۔

اس دن تو تم نے مجھے پہچانا نہیں تھا۔

کس دن میرے سرکار۔ الٰہی بخش نے تشویش سے پوچھا۔ کب میں گناہگار ہوا تھا۔۔۔۔ مجھے بتائیں شاہ جی۔

شاہ صاحب نے اسے یاد دلانے کی کوشش کی لیکن الٰہی بخش کو وہ دن یاد ہی نہیں تھا۔ شاہ فرید کو اس کی اس روز کی گفتگو اب بھی یاد تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ الٰہی بخش سچ بول رہا ہے۔ وہ اس روز یقیناً جذب کی کیفیت میں تھا۔

لوگ کہتے ہیں تم دیوانے ہو گئے ہو الٰہی بخش۔

مجھے نہیں پتا شاہ جی پر میں نے کبھی کسی کو پتھر نہیں مارا۔ کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔ ٹھیک کہتے ہو۔ شاہ فرید نے آہ بھر کر کے کہا۔ سادہ دن تو تمہیں پھر بھی دیوانہ کہیں گے۔ یہ بتاؤ تم کیسے ہو الٰہی بخش۔ ان کے لہجے میں بزرگانہ شفقت تھی۔ حالانکہ وہ عمر میں الٰہی بخش سے چھوٹے تھے۔

غلام کے لیے دعا کریں سرکار۔ الٰہی بخش نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ جوڑوں کے درد سے پریشان ہوں۔

شاہ فرید خود کو اس کی طرف کھنچتا محسوس کر رہے تھے۔ انہیں اس دیوانے سے خوف نہیں محسوس ہو رہا تھا بلکہ پیار آ رہا تھا۔ اللہ بہتر کرے گا الٰہی بخش۔ یہ دنیاوی تکلیفیں تو آزمائش ہوتی ہیں۔ اللہ تمہیں سرخرو گزارے۔ وہ کہتے کہتے رکے.........پھر بولے۔ آؤ میرے گھر چلو۔ کچھ دیر سکون سے بیٹھو۔ دھوپ بہت ہے۔

میرا یہ مقام نہیں سرکار۔ الٰہی بخش نے عاجزی سے کہا۔

شاہ فرید اسے گھر لے گئے۔ انہوں نے بیٹھک کا دروازہ کھولا اور اسے اندر آنے کو کہا۔

میں دھرتی پر بیٹھوں گا شاہ جی سرکار۔

نہیں اندر آؤ۔

الٰہی بخش نے چپلیں باہر اتاریں اور یوں کمرے میں داخل ہوا جیسے مسجد میں جا رہا ہو۔

آؤ ادھر بیٹھو۔ شاہ فرید نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

خدا کے لیے شاہ یہ حکم نہ دیں۔ الٰہی بخش گڑگڑایا۔ میں تو خاک نشین ہوں اوپر بیٹھنے کو کہیں گے تو میں سر چھوڑ کر.........

شاہ فرید جانتے تھے کہ وہ یہی کچھ کر گزرے گا۔ انہوں نے ایک نظر اسے دیکھا وہ دست بستہ کھڑا تھا۔ اچھا الٰہی بخش جہاں جی چاہے بیٹھ جاؤ۔

پہلے آپ بیٹھیں شاہ جی۔

شاہ فرید نیچے بیٹھنے لگے تو اس نے ان کے پاؤں پکڑ لیے۔ آپ اوپر بیٹھیں سرکار۔

ب شاہ فرید کا احساس ہوا کہ ان کا واسطہ واقعی دیوانے سے پڑا ہے۔ اس کا رویہ انہیں شرمندہ کر رہا تھا لیکن وہ اسے روک بھی نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے عافیت اسی میں جانی کے بحث کرنے کے بجائے اس کی بات مان لیں۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔

ن کے بیٹھتے ہی الٰہی بخش ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ وہ ان کے پاؤں دبانے لگا۔

شاہ فرید کسمسائے۔ زیادتی نہ کرو الٰہی بخش مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔ مان جاؤ۔۔۔۔۔۔۔

شاہ جی۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ تو میرے جوڑوں کے درد کا علاج ہے۔ مجھے نہ روکیں آپ کو اللہ کا واسطہ۔

شاہ فرید مزاج کے خلاف اسے برداشت کر رہے تھے۔

یک بات کہوں شاہ جی آج میرے باپ کی روح بہت خوش ہوگی

کیوں الٰہی بخش۔

ہ ساری عمر مجھے آل رسول ﷺ سے عشق کی تلقین کرتے رہے میں کہتا۔۔۔۔۔۔

عشق کیا نہیں جاتا' خود بخود ہو جاتا ہے۔ جب نصیب میں ہوا تو مجھے بھی ہو جائے گا۔

الٰہی بخش نے توقف کیا اور ایک گہری سانس لی۔ آج میرے نصیب جاگ گئے۔ میرے اللہ جی نے مجھے عشق کی دولت دے دی۔ میں بہت خوش ہوں ب۔ شاہ جی آج عاقبت سنورنے کا سامان ہوا ہے۔

شاہ فرید کا چہرہ تمتما اٹھا لیکن دیوانہ ان کے اختیار میں نہیں تھا۔ انہوں نے دل میں خدا سے عرض کی۔۔۔۔۔۔۔ مجھے تکبر اور گھمنڈ سے محفوظ رکھ معبود۔

الٰہی بخش شاہ فرید کے پاؤں دباتا رہا اس کے چہرے پر خوشی کی ایک چمک ورد و تھی

کہ ان کے چہرے پر نگاہ نہیں ٹھہر رہی تھی۔

شاہ صاحب نے اندر گھر میں کھلنے والے دروازے کی طرف منہ کر کے پکارا۔ سجاد حسین .... سجاد حسین ادھر آؤ۔

چند لمحے کے بعد دروازہ کھلا اور ایک دراز قد خوش رو لڑکا کمرے میں آیا۔ جی ابو جان۔

الٰہی بخش جھپٹ کر اٹھا اور سجاد کے ہاتھ چومنے لگا۔ ماشاء اللہ .... ماشاء اللہ اس کے لہجے اور نگاہوں میں محبت تھی۔

جاؤ بیٹے لسی لے کر آؤ۔

نا سرکار۔ الٰہی بخش نے نفی میں سر ہلایا۔ مجھے بس ٹھنڈا پانی پلا دیں۔

لسی بھی ٹھنڈا پانی ہی ہے۔ الٰہی بخش' شاہ فریہ نے کہا اور بیٹے کی طرف مڑے۔ جاؤ بیٹے لسی لاؤ۔

سجاد حسین چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ لسی کا جگ اور دو گلاس لے کر آیا اور بھر کر دونوں کو دیے اس کے جانے کے بعد شاہ صاحب نے اصرار کر کے الٰہی بخش کو لسی پلائی۔ لسی پینے کے بعد الٰہی بخش چھت کو تکنے لگا۔ اچانک اس کی نظر دیواروں پر پڑی' جو رنگ و روغن سے محروم تھیں۔ گستاخی معاف شاہ جی سرکار۔ اس نے کہا' اجازت ہو تو ایک بات کہوں۔

کہو الٰہی بخش۔

اللہ کے حکم سے آپ نے مکان بہت اچھا بنایا ہے پر رنگ و روغن نہیں کریا اب تک۔

کرا لوں گا کبھی۔ شاہ صاحب نے بے پروائی سے کہا۔

شاہ صاحب یہ کام مجھے دے دیں۔

دیکھیں گے ابھی تو میرا ارادہ نہیں۔

الٰہی بخش جھپٹ کر ان کے پاؤں پکڑ لئے۔شاہ جی یہ کام مجھے دے دیں میں آپ کے گھر کا رنگ کروں گا۔

شاہ فرید ہچکچا رہے تھے۔الٰہی بخش تمہارے لئے مشکل ہے۔ایک تو جوڑوں کا درد پھر عرصے سے تم نے یہ کام چھوڑا ہوا ہے۔

الٰہی بخش انگلیوں پر گننے لگا۔ستائیس سال ہو گئے سرکار۔ستائیس سال پہلے آخری بار یہ کام کیا تھا۔اس کا لہجہ خوابناک ہو گیا۔بس پھر اس سے ناتا ٹوٹ گیا لیکن اب آخری بار آپ کا کام کرنا چاہتا ہوں۔

لیکن کیوں؟

شاہ جی اللہ نے مجھ بے ہنر کو یہ ہنر دیا تھا۔اس سے میں نے ایک عمر حلال کی روٹی کمائی۔دنیا سنواری پھر یہ کام چھوڑ دیا۔اب اس سے آخرت کا کام کرنا چاہتا ہوں۔آپ کے گھر میں محبت سے بہت اچھا رنگ کروں گا۔کیا پتا آپ کی دعا سے میری محبت سے خوش ہو کر اللہ جی مجھ گناہگار کو بھی جنت میں ایک گوشہ دے دیں۔

لیکن الٰہی بخش۔

خدا کے لئے مجھے مایوس نہ کرنا شاہ جی۔الٰہی بخش نے پھر ان کے پاؤں پکڑ لیے۔

اچھا ٹھیک ہے الٰہی بخش شاہ صاحب نے اپنے پاؤں سمیٹتے ہوئے کہا۔میں تمہاری خوشی ضرور پوری کروں گا۔

شاہ فرید کی ہچکچاہٹ بے سبب نہیں تھی۔ان دنوں ان کا ہاتھ تنگ تھا۔اسی لئے انہوں نے رنگ و روغن کا کام موخر کر دیا تھا۔

چلیں بازار میں آپ کو رنگ بھی رعایت پر دلاؤں گا۔

آج نہیں الٰہی بخش کل صبح چلیں گے۔ شاہ صاحب نے اسے ٹال دیا۔ ابھی تم آرام سے بیٹھو۔

☆------------☆-----------☆

اگلی صبح نو بجے شاہ فرید اپنی بانی میں روزمرہ کے کام نمٹا رہے تھے کہ الٰہی بخش نازل ہو گیا۔ دست بوسی کے بعد وہ بولا۔ شاہ جی چلیں۔

کہاں؟

بازار رنگ و روغن کا سامان لینے۔

ابھی تو بازار کھلا بھی نہیں ہوگا۔ شاہ فرید بولے۔ تم سکون سے بیٹھو۔ چائے پیو پھر بازار بھی چلیں گے۔

الٰہی بخش وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں شاہ صاحب کا منجھلا بیٹا اعجاز حسین چائے لے آیا۔ وہ چائے پیتا رہا۔

شاہ صاحب نے کچھ پیسوں کا بندوبست کر لیا تھا۔ عام حالات میں بھی تنگ نہ کرتے لیکن دیوانے کے آگے ہار گئے تھے۔ ساڑھے دس بجے کے قریب انہوں نے الٰہی بخش سے کہا آؤ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بازار چلیں۔

دونوں بازار پہنچ گئے۔ الٰہی بخش انہیں ایک دکان پر لے گیا۔ وہاں اس نے ضرورت کی تمام چیزیں خریدیں اور اس کے بعد جو بھاؤ تاؤ شروع کیا تو دکاندار بھی پریشان ہو گیا۔

دیکھو بابا۔ تمے کا تو یہ مجھے بھی نہیں پڑتا۔ دکاندار احتجاج کیا۔ اپنا نفع تو میں چھوڑ سکتا

ہوں۔ نقصان میں مال دینے لگا تو چل لی میری دکان۔

ہر جگہ منافع نہیں دیکھتے بالکے۔ الٰہی بخش نے دبدبے سے کہا۔ ساری زندگی منافع لیا ہے۔ آج نقصان میں بھی دے کر دیکھ۔ جانتا نہیں یہ کس کا گھر کا کام ہے۔ اس نے فرید شاہ کی طرف اشارہ کیا۔ مجھے دیکھ میں اپنے منافع میں تجھے شریک کر رہا ہوں۔ کچھ آخرت کا سامان بھی کر لے۔

شاہ صاحب کا شرمندگی سے برا حال تھا۔ وہ بولے نہیں الٰہی بخش کسی رعایت مجھے نہیں چاہیے۔ میں پوری قیمت ادا کروں گا۔

شاہ جی کسی کی آخرت کے منافع کا معاملہ ہو تو مرضی کے خلاف بھی کر لیا کریں۔

الٰہی بخش نے شاہ صاحب سے کہا پھر دکاندار سے بولا۔ بول۔۔۔۔۔۔۔ کیا کہتا ہے؟

دکاندار نے اس کی آنکھوں میں ایک پل دیکھا اور نرم ہو گیا۔

الٰہی بخش نے اسی دن سے کام شروع کر دیا۔

شاہ صاحب پریشان تھے۔ جانتے تھے کہ الٰہی بخش جوڑوں کے درد کا مریض ہے۔ پھر اس کی عمر بھی کم نہیں تھی۔ صحت کی خرابی ویسے بھی عمر کو بڑھا دیتی ہے اور مکان ان کا ماشاءاللہ بہت بڑا تھا اور دو منزلہ بھی۔ کام بہت تھا لیکن الٰہی بخش کو یہ گوارا نہیں تھا کہ اس کام میں کسی کو شریک کر لے۔ سو وہ پریشان ہونے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

اب الٰہی بخش کے کام کی وہ رفتار بھی نہیں تھی۔ پھر بھی وہ بڑی لگن اور محبت سے کام کر رہا تھا۔ ایک دیوار پوری کرنے کے بعد وہ دیر تک کھڑا اسے ناقدانہ نظروں سے دیکھتا رہتا۔ اس مصور کی طرح، جس نے کوئی شاہکار تخلیق کرنے کا ارادہ کر لیا ہو۔ پھر وہ دوبارہ اسی دیوار پر کام شروع کر دیتا۔

شاہ صاحب کے بیٹوں نے گھر میں کہہ دیا تھا کہ الٰہی بخش کے کھانے پینے کا خاص خیال رکھنا ہے۔ انہوں نے بیٹوں کو بھی ہدایت کر دی تھی۔ وہ الٰہی بخش کا خاص خیال رکھتے۔

شاہ صاحب کے بیٹوں کے لئے الٰہی بخش عجوبے سے کم نہیں تھا۔ شاہ صاحب کے چار بیٹے تھے۔ سب سے چھوٹا دلدار حسین تو بہت چھوٹا تھا۔ تین بیٹے سی و حسین' عجاز حسین ور تصور حسین سمجھدار تھے۔ تصور حسین کو پیار میں گل پیر کہا جاتا تھا۔ تینوں لڑکوں کو قوالی سے بڑی دلچسپی تھی۔ شاہ صاحب کی مرضی کے خلاف وہ ڈیک لے آئے تھے۔ جب بھی موقع ملتا وہ قوالی کا کوئی کیسٹ لگا دیتے۔

کام کی رفتار میں یہ یک چیز بھی مانع تھی۔ کسی قوالی میں حضورﷺ کا سم مبارک آ جاتا تو بیٹھا ہو ا ہی بخش کھڑ ہو جاتا اور ہاتھ سینے پر باندھ کر نظریں زمین پر جما دیتا۔ سے ہوش ہی نہ رہتا۔ یہاں تک کہ گل پیر اسے بلاتے ہوئے کہتا۔ بابا۔۔۔۔۔ قوالی ختم ہو گئی ہے۔

یہ بات قوالی کی حد تک نہیں تھی۔ گفتگو میں بھی کوئی حضورﷺ کا اسم مبارک زبان پر لاتا تو الٰہی بخش احترام میں غلاموں کی طرح کھڑا ہو جاتا اور کھو جاتا۔ یسی عقیدت اور احترام لڑکوں نے کہیں نہیں دیکھا تھا۔ الٰہی بخش خود ان کی اتنی عزت کرتا' جیسے وہ اس کے بزرگ ہوں۔

شاہ صاحب کا معمول تھا کہ الٰہی بخش سے اس کی ضرورت ہر روز کئی کئی بار پوچھ کرتے۔ الٰہی بخش ہر بار یہی کہتا کہ اسے بس ان کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے' شاہ جی آپ بار بار کیوں پوچھتے ہیں۔

یہ میرا فرض ہے۔ تم میرے لئے کام کر رہے ہو۔ مجھے ہر طرح سے تمہارا خیال رکھنا ہوگا لیکن تم کبھی کچھ مانگتے نہیں۔

مجھے جو چاہیے وہ مل رہا ہے اور کیا مانگوں۔ الٰہی بخش کہتا۔

شاہ فرید کے بیٹے الٰہی بخش سے بہت مانوس ہو گئے تھے۔ کبھی موقع ہوتا تو الٰہی بخش ان سے دانش کی باتیں کرتا کہ وہ حیران رہ جاتے۔ نبی کریم ﷺ کے احترام کا مظاہرہ بھی ان کے لیے بہت خوش کن تھا۔ مجموعی طور پر عمر کے فرق کے باوجود وہ اس کی صحبت میں خوش رہتے تھے۔

کام اپنی مخصوص رفتار سے چل رہا تھا لیکن اس بات کا اعتراف سب کو تھا کہ الٰہی بخش غیر معمولی طور پر اچھا کام کر رہا ہے۔

ایک دن شاہ فرید معمول کے مطابق الٰہی بخش کے پاس آئے۔ شام کا وقت تھا۔ الٰہی بخش گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ کیسے ہو الٰہی بخش۔

اللہ کا شکر ہے شاہ جی۔ بس جوڑوں کی تکلیف بڑھ گئی ہے۔ الٰہی بخش نے کہا پھر بولا۔ اجازت ہو تو کل میں کام سے چھٹی کر لوں سرکار۔

اجازت کی ضرورت نہیں الٰہی بخش تم میرے نوکر تو نہیں ہو۔ شاہ صاحب نے کہا۔ تم جب چاہو چھٹی کر سکتے ہو۔

پر میں تو اجازت لوں گا شاہ صاحب۔ کل میں سول ہسپتال جاؤں گا۔

نہیں وہاں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہاں کوئی پروا نہیں کرتا مریض کی۔ ماڑی سے ادھر ڈاکٹر ظہیر ہے تم کل سجاد حسین کے ساتھ اس کے پاس چلے جانا۔

شاہ جی۔ آپ کا پیسہ نہیں خرچ کرنا چاہتا۔

یہ کوئی بات نہیں۔ فیس وہ زیادہ نہیں لیتا۔ تم اپنی جیب سے دے دینا۔

اس پر الٰہی بخش رضامند ہو گیا۔ شاہ صاحب اسی شام ڈاکٹر ظہیر کے پاس چلے گئے۔ وہ ان کے معتقدین میں سے تھا۔ شاہ صاحب جا کر اسے سمجھا آئے۔

اگلے روز الٰہی بخش سجاد حسین کے ساتھ ڈاکٹر ظہیر کے پاس چلا گیا۔ ڈاکٹر نے بڑی توجہ سے دیکھا۔ تمام دوائیں اپنے پاس سے دیں اور پھر سجاد حسین سے بولا۔ چھوٹے شاہ جی کو آرام کی ضرورت ہے۔ کم از کم ایک ہفتہ اسے بستر پر لٹائیں۔ چلنے بھی نہ دیں۔

فیس کیا دوں ڈاکٹر صاحب الٰہی بخش نے پوچھا۔

آپ آلِ رسول ﷺ سے کیا فیس لوں گا۔ اللہ اسی طرح کچھ نواز دے تو اچھا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا۔

الٰہی بخش بہت خوش ہوا۔ آپ بہت اچھے ہیں ڈاکٹر صاحب ہر مسلمان کو ایسے ہی سوچنا چاہیے۔

الٰہی بخش کو اس دوا سے فائدہ ہوا۔ بڑی وجہ یہی تھی کہ ڈاکٹر پر اس کا اعتقاد ہو گیا تھا۔

اسی شام شاہ فرید پھر ڈاکٹر کے پاس گیا۔ ڈاکٹر واقعتاً کچھ لینا نہیں چاہتا تھا لیکن شاہ صاحب نے بالاصرار اسے پوری فیس اور دواؤں کے پیسے دیئے اور تاکید کی کہ الٰہی بخش کو اس بات کا علم نہیں ہونا چاہیے۔

الٰہی بخش نے بمشکل ایک دن ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کیا۔ مگر دوسرے ہی دن آیا اور کام میں مصروف ہو گیا۔ شاہ صاحب نے دیکھا تو خفا ہوئے۔ تمہیں ڈاکٹر نے منع کیا تھا۔

انہوں نے پہلی بار الٰہی بخش سے سخت لہجے میں بات کی۔ تم کیوں خود کو تکلیف میں

ڈرتے اور مجھ کو گناہ گار کرتے ہو؟

یقین کریں شاہ جی سرکار مجھے سے قسم لے لیں' بستر پر لیٹنے سے زیادہ آرام مجھے آپ کے کام میں ملتا ہے۔ الٰہی بخش نے لجاجت سے کہا۔

شاہ صاحب نے بہت سمجھایا۔ مگر دیوانے سے انہیں ہارنا پڑتا تھا۔

ایک دن شاہ فرید' باڑی میں بھینس کے لئے چارہ بنا رہے تھے۔ اچانک الٰہی بخش ان کے پاس آیا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔

کیا بات ہے الٰہی بخش؟ شاہ صاحب نے پوچھا۔

وہ شاہ جی کل چاند کی گیارھویں تاریخ ہے۔

شاہ صاحب مسکرائے۔ مجھے معلوم ہے' کل تمہارے مرید آئیں گے۔ تم چھٹی کرو گے۔

یہی بات ہے نا؟ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں تم مرضی کے مالک ہو۔ آزاد آدمی ہو۔

یہ بات نہیں سرکار۔

وہ ------ سرکار ------ بات یہ ہے سرکار ---- الٰہی بخش سے بات نہیں کی جا رہی تھی۔

شاہ صاحب نے نظریں اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کی ہچکچاہٹ ان کی سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا بات ہے الٰہی بخش۔

الٰہی بخش نے دونوں ہاتھ جوڑ لئے۔ چھوٹا منہ بڑی بات ہے سرکار' ڈرتا ہوں آپ گستاخی نہ سمجھیں۔

شاہ صاحب نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر کھول دیئے۔ بولو الٰہی بخش' تم مجھے جانتے ہو۔ میں تم پر کبھی غصہ نہیں کروں گا۔

سرکار۔۔۔۔میں چاہتا ہوں کل آپ کھانا میرے ساتھ کھائیں۔

یک لمحے کو شاہ فرید کی رنگت متغیر ہوگئی۔ پھر انہوں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

ٹھیک ہے الٰہی بخش۔۔۔۔۔۔۔میں آؤں گا۔

گلے روز شاہ فرید نے وعدہ جلدی سے نبھانے کا فیصلہ کرلیا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ لنگر کا کھانا نہیں کھا سکتے تھے۔ روایات کی پاس داری بھی تو ان کی طبیعت میں تھی اور وہ الٰہی بخش کو انکار بھی نہیں کرسکتے تھے۔

وہ پہنچے تو الٰہی بخش کو اپنے ہاتھوں سے مرغ ذبح کرتے پایا۔ وہ انہیں دیکھ کر ہڑبڑا گیا۔ اتنی جلدی آ گئے سرکار۔ اس نے جلدی جلدی خون میں لتھڑے ہوئے ہاتھ دھوئے اور ہاتھوں کو کپڑے سے صاف کرکے ان کے ہاتھ چومے

شاہ صاحب نے محسوس کیا کہ وہ انہیں ہمیشہ سے بھی زیادہ تعظیم دے رہا ہے۔ انہیں احساس تھا کہ اس کے مرید انہیں حیرت سے دیکھ رہے ہیں۔ ہاں الٰہی بخش میں نے وعدہ پورا کردیا ہے لیکن میں زیادہ دیر رکوں گا نہیں۔

آئیں تو۔۔۔۔۔۔۔میں آپ کو جلدی نہیں جانے دوں گا۔ الٰہی بخش انہیں اس گھنے درخت کے نیچے لے گیا جہاں اس کی گدی تھی۔ آپ یہاں تشریف رکھیں سرکار

نہیں۔۔۔۔۔۔۔یہاں نہیں بیٹھوں گا میں۔ یہ تمہارا مقام ہے۔ شاہ صاحب نے کہا۔

میرا مقام تو آپ کے قدموں میں ہے۔ شاہ جی آپ کو قسم ہے دنیا کے بادشاہ کی۔ بیٹھ جائیں۔

یہ مناسب نہیں الٰہی بخش۔

لیکن الٰہی کی ضد کے سامنے انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے۔ وہ بیٹھے تو الٰہی بخش نے ان کے پاؤں دبانے شروع کر دیئے۔ اپنے مرشد کو جو شاہ صاحب کے پاؤں دباتے دیکھ تو الٰہی بخش کے کچھ مرید بھی اس سعادت میں شامل ہونے لگے۔ مگر الٰہی بخش نے انہیں ڈپٹ دیا۔

یہاں صرف میں شاہ جی کے پاؤں دبا سکتا ہوں۔ کوئی اور نہیں۔

تھوڑی دیر بعد الٰہی بخش نے ان سے اجازت چاہی۔ سرکار مجھے کھانا پکانا ہے۔

شاہ صاحب کو حیرت ہوئی الٰہی بخش کے مرید پہلے ہی کھانا پکانے میں مصروف تھے۔ بہر حال انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ بعد میں الٰہی بخش پھر ان کے قدموں میں آ بیٹھا۔

شاہ جی۔ میرے سرکار آپ کے لئے دستر خوان بچھا دوں؟

الٰہی بخش! مجھے بھوک نہیں ہے۔ شاہ صاحب نے کہا۔

الٰہی بخش ان کے پاؤں دبانے لگا۔ چند منٹ بعد اس کا ایک مرید اس کے پاس آیا۔ لنگر تیار ہے بابا۔

ٹھیک ہے تم جاؤ میں آواز دے لوں گا۔

دس منٹ گزر گئے تو شاہ صاحب نے الٰہی بخش سے کہا۔ لنگر کیوں نہیں شروع کرتے الٰہی بخش۔

سرکار آپ بسم اللہ کریں گے تو اس کے بعد ہی لنگر شروع کروں گا۔

الٰہی بخش! میں یہ تو کھانا نہیں کھا سکتا۔

الٰہی بخش اپنے دونوں رخسار پیٹنے لگا۔ آپ نے کیسے وچار سرکار کہ میں اتنا گستاخ ہو سکتا ہوں۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ میں نے علیحدہ سے اور خود اپنے ہاتھوں سے

آپ کے لئے کھانا پکایا ہے۔ دو مرغ میں آپ ہی کے لئے ذبح کر رہا تھا سرکار۔

شاہ فرید کو اس پر بہت پیار آیا۔ وہ پہلے ہی جانتے تھے اور اب پوری طرح سمجھ گئے کہ الٰہی بخش کس طرح کا آدمی ہے۔ اپنے مریدوں کے سامنے کوئی کسی ورکو اپنی گدی پر بٹھا کر اس کے پاؤں دبا سکتا ہے کسی کے لئے کھانے کا ایسا اہتمام کر سکتا ہے۔

رخصت ہوتے وقت شاہ فرید نے الٰہی بخش سے پوچھا تم نے ایسا کیوں کیا الٰہی بخش۔

بات وضاحت طلب تھی لیکن الٰہی بخش سمجھ گیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ آپ کی ذات سے وہ فائدے اٹھا رہا ہوں۔ شاہ جی ایک تو عاقبت سدھار رہا ہوں۔ دوسرے آپ جانتے ہیں کہ مرید ہاتھ چومیں تو مجھ جیسے کمزور اور چھوٹے آدمی کا نفس تو دنبہ بن جاتا ہے۔ میں نفس کے اس موٹے تازے دنبے کو پنپنے نہیں دینا چاہتا۔ شاہ جی ۔۔۔۔

یک شعر سناؤ؟

شاہ الٰہی بخش۔

سادہ سا شعر ہے شاہ جی شاعر کہتا ہے۔

امیر اب تک ہوں میں اپنی انا کا

مجھے تو اپنے رستے میں بچھا لے

شاہ فرید کے ہونٹوں پر ستائشی مسکراہٹ ابھری۔

شاہ جی اب جس گیارہویں کو آپ نہیں آئیں گے یہاں لنگر نہیں ہوگا۔

یہ شرط نہ لگاؤ الٰہی بخش

الٰہی بخش پھر رخسار پیٹنے لگا۔ شرط نہیں میرے سرکار یہ دل کی آواز ہے۔

☆------☆---------☆

شاہ فرید کے مکان کے رنگ و روغن کا کام مکمل ہو گیا لیکن جو تعلق قائم ہو گیا تھا۔ وہ الٰہی بخش کی زندگی میں نہیں ٹوٹا۔ ہر اسلامی ماہ کی دس تاریخ کو الٰہی بخش شاہ صاحب کے پاس آتا۔ سلام و دست بوسی کرتا، پھر کہتا۔ شاہ جی ــــــــــ

مجھے یاد ہے الٰہی بخش، کل گیارہ تاریخ ہے۔ شاہ صاحب کچھ کہنے سے پہلے ہی کہہ دیتے۔ میں یہ تاریخ کبھی نہیں بھولوں گا۔ تم ہر ماہ کیوں تکلیف کرتے ہو؟ تکلیف نہیں شاہ جی، یہ میرا فرض ہے۔

شاہ صاحب جاتے اور شریک ہوتے۔ سب کچھ اسی طرح ہوتا، جیسے پہلی بار ہوا تھا۔ اب شاہ صاحب کے بیٹے بھی ضد کر کے ان کے ساتھ آ جاتے تھے۔ انہیں الٰہی بخش سے بڑی انسیت تھی۔ وہ وہاں جا کر بہت خوش ہوتے تھے۔

انہیں معمولات میں تین سال گزر گئے۔ ان تین برسوں میں الٰہی بخش کی صحت اور خراب ہو گئی۔ اس کے سوا، کچھ بھی نہیں بدلا۔

الٰہی بخش کے دل میں حج بیت اللہ اور روضۂ رسول پر حاضری کی خواہش شدید سے شدید تر ہوتی گئی تھی۔ لیکن اس نے اس سلسلے میں کبھی بیٹوں سے فرمائش نہیں کی۔ پھر اللہ نے بیٹوں ہی کے دل میں ڈال دی۔ اسی سال انہوں نے مل کر اسے تیس ہزار روپے دیئے کہ وہ حج کر آئے۔

اس سال الٰہی بخش بہت خوش تھا۔ اس کی آرزو پوری ہونے والی تھی۔ وہ دن گن رہا تھا۔

ایک دن وہ پہاڑی پر اپنے پسندیدہ درخت کے نیچے کسی سوچ میں کھویا ہوا تھا کہ ایک شخص اس کے پاس چلا آیا۔ بابا ــــــــ پانی والے بابا ــــــــ اس نے کئی

بار پکار۔

الٰہی بخش نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ اسے ایک نظر میں اندازہ ہوگیا کہ آنے والا بڑا ضرورت مند ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے' جنہیں وہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا جسم رہ رہ کر لرز رہا تھا۔ ہونٹ بھی کپکپا رہے تھے۔

الٰہی بخش اسے غور سے دیکھتا رہا۔ آنے والا جوان تھا۔ اس کی عمر تیس سے زیادہ نہیں تھی۔

کیا بات ہے بابا جی؟

میرے لئے دعا کرو بابا

مسئلہ کیا ہے؟

بابا۔۔۔۔۔ میرا بیٹا ہے چار سال کا۔ ہمیں جان سے بھی پیارا ہے۔ وہ کسی خطرناک بیماری میں مبتلا ہوگیا ہے۔ مجھے تو بیماری کا نام بھی معلوم نہیں۔۔۔۔۔۔ ڈاکٹر کہتا ہے آپریشن پر پچیس ہزار کا خرچہ ہوگا تو وہ انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا ورنہ۔۔۔۔۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

تو پھر؟

جوان آدمی روتے روتے رکا۔ میرے لئے دعا کرو بابا' میں تو مشکل سے سو روپے روز کماتا ہوں۔ گھر کا خرچ بھی پورا نہیں پڑتا۔ زمین یا کوئی ایسی چیز بھی میرے پاس نہیں جسے بیچ کر پچیس ہزار کر لوں۔ میں کیا کروں بابا۔ اللہ جی سے دعا کرو۔ مجھے پچیس ہزار دے دے۔ میرے بیٹے کو بچا لے۔

الٰہی بخش کو اس پر بے ساختہ پیار آیا۔ اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے چادر

سال کے بچے کا تصور کیا' جو دھیرے دھیرے موت کی سرحد کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اللہ کا حکم ہو اور پچیس ہزار روپے مل جائیں تو وہ بچہ جوان ہوگا' اس کی شادی ہوگی' اس کے بچے ہوں گے ------

بابو میرے لیے یہ اکلوتا بیٹا ہی سب کچھ ہے۔ یہ پیدا ہوا تھا تو ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ اب ہمارے ہاں اولاد نہیں ہوگی کبھی۔ بابا میری نسل اسی سے چلنی ہے۔ جوان آدمی پھر رونے لگا۔

یا اللہ ------ اس بچے کو درازی عمر عطا فرما۔ الٰہی بخش کے دل سے آواز نکلی۔ اسی لمحے اس کے ذہن میں آندھیاں چلنے لگیں۔ پچیس ہزار روپے' آپریشن' بچے کی زندگی' یہ لفظ اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ پھر ایک اور لفظ ابھرنے لگا ------حج------حج۔

فیصلہ بہت مشکل تھا۔ ایک طرف ایک آگے جانے والی زندگی تھی تو دوسری طرف موت کی طرف بڑھتی ہوئی زندگی کی سب سے بڑی اور آخری آرزو۔ ایک بچے کی تھی اور دوسری کسی اور کے لئے۔ اسے باپ کے الفاظ یاد آئے۔ اللہ سے عشق کے لئے اس کے بندوں سے عشق ------ اور عشق میں حساب کتاب تو نہیں ہوتا اور حساب کتاب میں بھی ننھا پودا' گرنے والے دیمک زدہ بوڑھے درخت سے بھاری ہوتا ہے۔

مشکل سے سہی' الٰہی بخش فیصلے پر پہنچ گیا۔ اس نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے جوان آدمی سے کہا۔ مت رو بابا کے۔ اللہ بہتر کرے گا' لیکن پہلے تجھے میری ایک بات ماننا ہوگی۔"

جوان آدمی اسے پر امید نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

تو یہاں درخت کے نیچے لیٹ کر سونے کی کوشش کر۔ سو گیا تو انشاءاللہ تیرا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ یہ نہ پوچھنا کہ کیسے حل ہوگا۔

جوان آدمی لیٹ گیا۔ پریشانی میں نیند رات کو بھی نہیں آتی، لیکن اس سے الٰہی بخش نے بات ہی ایسی کہی تھی کہ وہ پانچ منٹ کے اندر اندر سو گیا۔ الٰہی بخش اٹھ کر اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ واپس آیا تو اس کے پاس وہ تیس ہزار روپے تھے، جو اس نے حج کے لئے رکھے تھے۔

اس نے جوان آدمی کو جگایا نہیں۔ وہ سو کر اٹھا تو الٰہی بخش نے کہا۔ لے بالکے، انشاءاللہ تیرا مسئلہ حل ہو گیا۔ میری ہدایت پر عمل کر۔ کھڑا ہو، بسم اللہ پڑھ کر سامنے کی طرف چل۔ ہر درخت کی جڑ دیکھتا رہ۔ انشاءاللہ سات درخت پورے ہونے سے پہلے تیرا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

جوان آدمی اٹھ کھڑا ہوا۔

لیکن یاد رکھ، اس واقعے کا کبھی کسی سے ذکر نہ کرنا اور نہ کسی کو بتانا کہ مجھ سے ملاقات۔

جوان آدمی بسم اللہ پڑھ کر آگے چل دیا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ اسے کچھ ملے گا۔ مگر وہ قطار کے ہر درخت کی جڑ کو غور سے دیکھتا رہا۔ بلکہ وہ جھک جھک کر ٹٹولتا بھی تھا۔ پانچویں درخت پر پہنچ کر ٹٹولنے کی ضرورت نہیں رہی۔ کپڑے کی وہ پوٹلی دور سے ہی نظر آ رہی تھی۔ اس نے بسم اللہ پڑھ کر بے تابانہ پوٹلی اٹھائی اور اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں نوٹ ہی نوٹ تھے۔

تیس ہزار روپے

جاؤ گے۔ بیٹے کا علاج کرا۔ اللہ اسے زندگی دے۔ اب اس کے صحت مند ہونے تک
یہاں نہ آنا۔ الٰہی بخش نے پکار کر کہا۔
جوان آدمی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ تیز قدموں سے پہاڑی سے اترنے لگا۔

☆----------☆---------☆

وقت سست رفتاری سے گزرتا رہا۔ الٰہی بخش کی صحت خراب تر ہوتی گئی لیکن معمولات
جاری رہے۔ شاہ فرید سے اس کی عقیدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ حج کے دن قریب
رہے تھے۔ یک دن مبشر نے کہا۔ حاتم نے حج کا کیا کیا؟
الٰہی بخش سر جھکائے بیٹھا رہا۔
با------کیا بات ہے؟ خیر تو ہے؟
بیٹے تو سمجھ لے کہ میرا حج ہو گیا۔ اللہ قبول کرنے والا ہے۔ الٰہی بخش نے دبے دبے
لہجے میں کہا۔
میں سمجھا نہیں بو
پیسے خرچ ہو گئے بیٹے۔
کوئی بات نہیں بو مبشر نے بلا توقف کہا۔ اگلے سال سہی با' پیسوں کی فکر نہ کر۔
الٰہی بخش کا دل شکر سے معمور ہو گیا۔ اللہ نے کیسی سعادت مند اولاد دی ہے۔ سے اس
کا خیال تھا کہ بیٹا اس پر برسے گا۔ تیس ہزار کوئی چھوٹی رقم تو نہیں ہوتی۔ بیٹا پوچھے گا
کہ کیا کیا رقم کا۔ دیکھ بیٹے اللہ نے زندگی دی تو اگلے سال سہی' کون جانے' اس نے آہ
بھر کے کہا۔
اللہ تمہیں ہمارے سر پر سلامت رکھے' با دل چھوٹا نہ کرو۔ مبشر نے اسے تسلی دی۔

یک بات بتائیے' الٰہی بخش نے کہا۔ تو ناراض تو نہیں مجھ سے؟

کیسی باتیں کرتے ہو بابا۔

تو نے پوچھا ہی نہیں کہ میں نے رقم کہاں خرچ کر دی۔

پہلی بات یہ کہ وہ تمہارے پیسے تھے۔ تمہارا اختیار تھا' جہاں چاہتے خرچ کرتے۔
دوسری بات یہ کہ مجھے معلوم ہے کوئی بڑی' بہت بڑی ضرورت ہو گی۔ ورنہ تم حج کے
پیسے خرچ کرنے والے نہیں ہو۔ اب مجھے تم سے ویسے ہی کچھ پوچھنے کا حق نہیں ہے۔
اللہ تجھے خوش رکھے بیٹے میرے سارے بیٹے اللہ کی مہربانی سے اتنے اچھے ہیں اللہ اجر

دینے والا ہے۔

الٰہی بخش نے کسی کو نہیں بتایا کہ اس نے پیسے کہاں خرچ کیے ہیں۔

ذی الحجہ کا مہینہ شروع ہونے سے چند روز پہلے ہی سے الٰہی بخش کی طبیعت بگڑنے لگی۔
وہ اس حد تک بیمار ہو کر بستر سے لگ گیا۔ اسے خیال آیا کہ اس حال میں تو وہ حج کر
بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے اندر ایک طمانیت پھیل گئی۔ جو ہوا تھا' اس میں بہتری تھی۔

اللہ بہترین رہنمائی فرماتا ہے۔

حاجرہ دن رات اس کی دیکھ بھال میں لگی رہی۔ بیٹے بھی خدمت کر رہے تھے لیکن الٰہی
بخش جانتا تھا کہ اس کی حالت بگڑ رہی ہے۔ اس نے کسی کو یہ بات نہیں بتائی۔ بقرعید
سے دو دن پہلے یہ حال ہو گیا کہ وہ بغیر سہارے کے چل نہیں سکتا تھا۔

عید کے دن الٰہی بخش مضطرب تھا۔ اصرار کر کے وہ نماز پڑھنے گیا۔ اس نے بیٹھ کر نماز ادا
کی۔ گھر پہنچا تو وہ بے حد نڈھال تھا۔ کچھ دیر وہ لیٹا رہا۔ پھر اچانک وہ اٹھ بیٹھا۔ اسے
خیال ہی ایسا آیا تھا۔

وہ تھوڑی رہا تھا کہ مزمل نے اسے تھام لیا۔ کیا کام ہے ابا مجھ سے کہو۔

کام ایسا ہے بیٹے کہ خود ہی کرنا ہے۔ الٰہی بخش اتنا کہتے کہتے ہانپ گیا۔ مجھے شاہ صاحب سے ملنے جانا ہے بیٹے۔۔۔۔۔۔۔۔ ڈیرے وی بھٹ۔

وہ تو بہت دور ہے بابا میں انہیں بلا لاتا ہوں۔

الٰہی بخش کا ہاتھ تھامے لیکن اس نے خود کو روک لیا۔ نہیں بیٹے میں گستاخی نہیں کر سکتا تو نے ایسا سوچا کیسے؟

بابا۔۔۔۔۔۔۔۔ تمہاری حالت ایسی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔"

میں جا سکتا ہوں اور جاؤں گا۔ تو مجھے لے چل بیٹے۔ الٰہی بخش گڑگڑانے لگا۔

مزمل نے سوالیہ نظروں سے ماں کو دیکھا۔ عمر بھر اطاعت کرنے والی حمیدہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ انکار کیسے کر سکتی تھی۔

ٹھیک ہے بابا میں گاڑی لے آتا ہوں

بیٹے مجھے پیدل جانا ہے۔

بادل نخواستہ مزمل سے سہارا دے کر باہر لے آیا۔ الٰہی بخش کو ہر چند قدم کے بعد رکنا پڑتا تھا۔ ہر بار وہ رکتا تو بیٹے کے چہرے کو غور سے دیکھتا لیکن سعادت مند بیٹے کی پیشانی پر کوئی شکن اور چہرے پر تکدر کا کوئی سایہ نظر نہیں آیا۔

دھوپ چڑھ رہی تھی۔ انہوں نے آدھے سے کچھ زیادہ فاصلہ طے کیا ہوگا کہ سامنے سے فرید شاہ آتے نظر آئے۔ وہ الٰہی بخش اور مزمل سے عید ملے۔

آپ کہاں جا رہے ہیں شاہ جی سرکار۔ الٰہی بخش نے ہانپتے ہوئے کہا۔

تمہاری ہی طرف جا رہا تھا الٰہی بخش بابا۔ تم تیار رہو۔

الہی بخش کا جسم لرزنے لگا۔ مجھے گناہگار کر رہے تھے۔

کیا میں تم سے ملنے نہیں آ سکتا؟

میری زندگی میں تو یہ ممکن نہیں سرکار۔

اب کیا ارادہ ہے؟

آپ کے ساتھ آپ کے گھر چلوں گا شاہ جی۔

شاہ فرید نے محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ بہت ضد کرتے ہو۔ چلو میں تمہیں لے کر چلوں گا۔

الہی بخش چونک تن کر سیدھا ہو گیا۔ جیسے جسم میں نئی روح دوڑ گئی ہو۔ آپ میرے ہاتھ تھام کر مجھے سہارا دے رہے ہیں شاہ جی؟

ہاں یہ میرا حق ہے اور فرض بھی۔

الہی بخش مزمل کی طرف مڑا۔ بیٹے تو گھر چلا جا۔ اب مجھے تیرے سہارے کی ضرورت نہیں۔ اس کے لہجے میں تمانیت تھی۔ دو گھنٹے بعد تو مجھے لینے کے لئے آ جانا۔

اس کی ضرورت نہیں۔ شاہ فرید نے کہا۔ میں الہی بخش کو خود لے آؤں گا۔

مزمل نہ چاہتے ہوئے بھی واپس چلا گیا۔ شاہ فرید الہی بخش کو سہارا دے کر اپنے گھر تک لائے۔ انہوں نے اسے پلنگ پر بٹھایا اور تواضع کی لیکن ان کے اصرار کے باوجود الہی بخش لیٹنے کو تیار نہیں ہوا۔

شاہ جی ---------- کل گیارہ تاریخ ہے۔

مجھے یاد ہے الہی بخش ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ شاہ فرید نے ہمیشہ کی طرح کہا۔

پھر بھی میرا تو فرض ہے کہ دعوت دینے آؤں۔

یکبات بتاؤں الٰہی بخش۔ شاہ صاحب نے کہا۔ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔
الٰہی بخش نے گہری سانس لی۔ زندگی کام آ گئی سرکار موت آسان ہو گئی۔ اس نے کہا
ور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ دیر تک روتا رہا۔ ہچکیاں بندھ گئیں میں اس قابل نہیں
تھا سرکار، بس اللہ کی دین ہے۔ اس کا کرم ہے۔ اب مجھے زندگی سے کچھ نہیں چاہیے۔
سید حسین نے سے پانی لا کر دیا۔ پانی پی کر اس کی طبیعت ذرا سنبھلی۔ وہ دیر تک شاہ
صاحب کی باتیں سنتا رہا۔ خود وہ بہت کم بولا اور اس نے ایک سیکنڈ کے لیے بھی پیٹھ
نہیں لگائی۔ شام ہوئی تو شاہ صاحب نے کہا۔ الٰہی بخش اب جاؤ میں تمہیں گھر لے
چلوں۔
الٰہی بخش اٹھ گیا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے شاہ صاحب کے بیٹوں کے ہاتھ بڑی
بے تابی سے چومے۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے دیوار کو بڑی محبت سے چھوا۔ اس کے
ہونٹ یوں ہلے جیسے وہ دیواروں سے کچھ کہہ رہا ہو۔ دیوار پر رنگ ہی کا تھا۔
باہر نکلا تو وہ جھکا ور اس نے دروازے کی چوکھٹ کو چھوا۔ اس کے ہونٹ پھر ہلے۔
رستے میں اس نے شاہ صاحب سے کہا۔ ایک بات میں بھی کہوں شاہ جی؟
کہو الٰہی بخش
ب شاید میں یہاں کبھی نہ آ ؤں۔ اصل میں میں آپ کو آخری سلام کرنے آیا تھا۔
اللہ تمہیں بہت عمر دے الٰہی بخش ایسی باتیں نہیں سوچتے۔
الٰہی بخش نے کچھ نہیں کہا۔ اپنے گھر پہنچ کر اس نے کہا۔ شاہ جی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میرے
گھر میں نہیں آئیں گے۔؟
کیوں نہیں۔

الٰہی بخش کی آواز تو تالا ہو گئی۔ وہ بیچ بیچ کر حامدہ اور بیٹوں کو ہدایات دیتا رہا کہ وہ شاہ صاحب کی تواضع کریں۔ شاہ صاحب نے بھی اس روز تعرض نہیں کیا۔ ان کے جانے کے بعد الٰہی بخش اچانک نڈھال ہو گیا۔ رات ہوتے ہوتے اس کی طبیعت بہت بگڑ گئی۔ بیٹے ڈاکٹر کو بلانے پر مصر تھے لیکن اس نے انہیں روک دیا۔ کل تک میں ٹھیک نہ ہو تو ڈاکٹر کو بلا لینا۔ اس نے کہا۔ اب تم لوگ میرے پاس بیٹھو۔

حامدہ اس کے پاؤں دبانے لگی۔ بیٹا سر سہلا رہا تھا اور مدثر اور مزمل اس کے ہاتھ سہلا رہے تھے۔

دیکھو، کوئی قیامت تک نہیں جیتا۔ کوئی ساری عمر اپنوں کے ساتھ نہیں رہتا۔

اس نے کہا "میری بات تم غور سے سنو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور یاد رکھنا۔"

حامدہ چپکے چپکے رونے لگی۔

دیکھو لوگ مجھے پہاڑی پر دفن کرنا چاہیں گے۔ ایسا نہ ہونے دینا۔ مجھے گاؤں کے قبرستان میں دفن کرنا۔ وہ بیوی اور بیٹوں کی کیفیت سے بے نیاز کہتا رہا۔ میرا پیغام سب کو دے دینا کہ میری قبر پر صرف فاتحہ پڑھیں۔ اسے مزار نہ بنائیں۔ شرک نہ کریں۔ میں کسی قابل نہیں تھا۔ صرف دل آزاری سے بچنے کے لئے جھوٹا پیر بن گیا تھا۔ اور میرے بیٹو، یہ لنگر کا سلسلہ بھی بند کر دینا اور تم۔۔۔۔۔۔۔ تمہیں جو میں ہمیشہ سمجھاتا رہا ہوں، وہی کرنا۔ لوگوں کی عزت، لوگوں سے محبت، سادات کا احترام۔ اور ہاں، میرے ہر معاملے میں شاہ جی سے مشورہ کرنا۔ تم سب بھی میری کوتاہیاں معاف کر دینا اور دوسروں سے بھی کہنا کہ میں نے سب سے معافی مانگی ہے۔ مجھے معاف کر دیں۔ میری مغفرت کے لئے دعا کرتے رہنا اور دوسروں سے بھی کرانا۔

وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔ دیر تک چپ رہا۔ مبشر نے دیکھا وہ سو گیا تھا۔ اس نے اشارے سے دوسروں کو بتایا۔ تینوں بھائی دبے قدموں وہاں سے ہٹ آئے۔ صرف حامدہ صبح وہ جاگی تو الٰہی بخش اس وقت بھی سو رہا تھا۔ اس نے اٹھ کر اس کا چہرہ دیکھا وہ بہت پرسکون اور صحت مند لگ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ تھی، جیسے کوئی بہت حسین خواب دیکھ رہا ہو۔

حامدہ کو احساس ہوا کہ وہ بے حس و حرکت ہے۔ اس نے اس کی پیشانی کو چھو کر دیکھا۔

وہ برف کی طرح ٹھنڈی ہو رہی تھی۔ پنچھی پنجرہ توڑ کے اڑ چکا تھا۔

وہ ذی الحجہ کی گیارہویں تاریخ تھی لیکن اس روز لنگر نہیں ہوا۔ مرید آئے تو سہی تھے لیکن اس روز انہیں بس مرشد کو کندھا دینا تھا۔ جنازے میں ایک جوان شخص بھی تھا جو رو رہا تھا اور چیخ چیخ کہہ رہا تھا۔۔۔۔۔۔ بابا۔۔۔۔ پانی والے بابا میرا بچہ ٹھیک ہو گیا ہے بابا۔

بظاہر دیکھا جائے تو الٰہی بخش کی کہانی ختم ہو چکی تھی۔ الٰہی بخش کی کہانی جس کا خمیر عشق سے اٹھا تھا۔

☆--------------☆--------------☆

لیکن الٰہی بخش کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

چوتھے دن تینوں بیٹوں نے ماں کے سامنے وہ بکس کھولا جسے الٰہی بخش بہت عزیز رکھتا تھا۔ کسی کو چھونے نہیں دیتا تھا اور بکس کھلنے کے بعد وہ سب حیران کھڑے تھے۔ بکس میں زیادہ چیزیں نہیں تھیں۔ سب سے اوپر ایک پھول دار کاغذ اور ایک چھوٹا سا کارڈ تھا۔ کارڈ پر بہت خوب صورت تحریر لکھا تھا۔۔۔۔ الٰہی بخش کے سالگرہ کی دلی

مبارک ہو اور نیک خواہشات اور خلوص محبت کے ساتھ سادی۔

پھول کے کاغذ کے نیچے پیکٹ تھا۔ مزمل نے پیکٹ کو کھولا تو گتے کی پیکنگ نمودار ہوئی۔

پیکنگ میں سے ہلکے نیلے رنگ کی خوب صورت شیشی نکلی، جس میں زرد سیال بھرا ہوا تھا۔ یقیناً وہ کوئی خوشبو تھی۔۔۔۔۔۔۔۔ باہر کی خوشبو۔

مزمل نے پرفیوم اسپرے کیا۔ خوشبو کی پھوار نکلی اور خوشبو ہر طرف پھیلنے لگی۔ وہ بہت پیاری خوشبو تھی۔

دونوں بھائیوں نے چونک کر دیکھا تو مزمل کھسیا گیا۔ مگر خوشبو پر اس کا اختیار نہیں تھا۔ وہ تو اب پھیل رہی تھی۔

یہ کیا؟ حامد نے مزمل سے پوچھا۔

خوشبو ہے ابا، ابا کے کسی دوست نے بھی انہیں تحفہ دیا تھا۔

تینوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں طے کیا کہ وہ اماں کو حقیقت کبھی نہیں بتائیں گے۔ تینوں اپنی اپنی جگہ سادی کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

کیسا عجیب نام ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ سادی، اس سادی سے ابا کا کیا تعلق ہوگا۔ یہ کب کی بات ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ کہاں کی بات ہے۔۔۔۔

خوشبو کے نیچے ایک پینٹ اور شرٹ تھی۔ جوتے تھے، جن میں جرابیں تھیں۔

کپڑے بالکل نئے لگ رہے تھے۔ الٰہی بخش نے ہمیشہ اس بکس کا بہت خیال رکھا تھا۔ باقاعدگی سے فنائل کی گولیاں ڈالا کرتا تھا۔

سب حیرت سے ان چیزوں کو دیکھتے رہے۔ یہ طے تھا کہ کپڑے ایک بار بھی نہیں دھلے

تھے۔ بیٹھے سوچ رہے تھے ـــــــــ ابا نے یہ کپڑے پہنے ہوں گے۔ جانے کیا عمر ہو گی اس وقت ان کی ـــــــــ کیسے لگ رہے ہوں گے انہیں پہن کر۔ وہ تصور میں باپ کو یہ کپڑے پہنے دیکھنے لگے۔

حامدہ بھی یہی سب کچھ دیکھ اور سوچ رہی تھی۔

وہ سب وقت کے طلسم کے اسیر تھے۔ وقت ہی اس طلسم کو توڑ سکتا تھا اور وقت نے ہی توڑا۔

دروازے پر دستک نے ان سب کو چونکا دیا۔ مدثر نے کہا۔ میں دیکھتا ہوں۔

اس نے جا کر دروازہ کھولا۔ سامنے ایک موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ موٹر سائیکل سوار وردی پہنے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیکٹ تھا۔ الٰہی بخش صاحب یہیں رہتے ہیں۔

؟ اس نے پوچھا۔

جی کیا بات ہے؟

یہ پیکٹ ہے ان کے نام۔

کہاں سے آیا ہے؟

کراچی سے آپ الٰہی بخش صاحب کو بلا دیں۔

وہ تو نہیں آ سکتے۔ مدثر نے اداسی سے کہا۔

تو ان سے رسید پر دستخط کرا دیں۔

تین دن پہلے ابو کا انتقال ہو چکا ہے۔

کوریئر کو شاک لگا۔ وہ وہیں دعا کے لئے بیٹھ گیا۔ پھر اس نے کہا مجھے بہت افسوس ہے جناب آپ اس رسید پر دستخط کر دیں۔

مدثر نے دستخط کئے اور پیکٹ لے کر گھر میں آ گیا۔

گھر میں اس پر بحث شروع ہوئی کہ پیکٹ کو کھولا جائے یا نہیں۔ پیکٹ پر بھیجنے والے کا پتا موجود تھا۔ وہ آفتاب حسین نامی کسی لیڈی نے بھیجا تھا۔ ان میں سے کوئی بھی اسے نہیں جانتا تھا۔ آخر عزل نے کہا۔ ابا نے کہا تھا میرے معاملے میں شاہ جی سے مشورہ کرنا۔ ہمیں یہ پیکٹ لے کر شاہ کے ہاں چلنا چاہیے۔

اس پر دوسرے دونوں بھائی بھی متفق ہو گئے۔ حاجرہ کو تو کسی معاملے سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بس گم صم بیٹھی تھی۔

تینوں بھائی پیکٹ لے کر شاہ فریہ کے گھر پہنچے۔ شاہ صاحب نے انہیں عزت سے بٹھایا۔

کیا بات ہے بالکو؟

شاہ جی۔۔۔۔۔۔آپ کے نام یہ پیکٹ آیا ہے۔ ہمیں اسے کھولنا چاہیے یا نہیں۔ ہم یہ آپ کے پاس لے آئے ہیں۔ مدثر نے کہا اور پیکٹ شاہ صاحب کی طرف بڑھا دیا۔

شاہ صاحب نے پیکٹ لے لیا۔ ان کے کانوں میں الٰہی بخش کی کہی ہوئی ایک بات گونج گئی اس نے کہا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔میں اپنے بچوں کو اپنے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ کچھ چھپانا نہیں چاہتا ہوں لیکن مجھے بتانا نہیں آتا، کیسے بتاؤں۔۔۔؟

شاہ صاحب نے سوچا ممکن ہے یہ پیکٹ ہی بچوں کو باپ کے بارے میں کچھ بتانے والا ہو۔ تم لوگ اسے کھول لو۔ انہوں نے کہا۔

شاہ جی۔۔۔۔۔۔۔آپ ہی کھول کر دیکھ لیں۔ پھر فیصلہ بھی آپ ہی کریں گے

کہ اس کا کیا کیا جائے۔ بابا نے ہمیں یہی ہدایت کی تھی مبشر نے کہا۔

شاہ فرید نے بڑی احتیاط سے لفافہ چاک کیا۔ اندر سے ایک خط اور یک ورلڈ فنڈ نکلا۔

انہوں نے خط پڑھا۔۔۔۔۔۔۔۔

الہٰی بخش صاحب۔

آپ کو حیرت ہوگی کیونکہ آپ مجھ سے واقف نہیں۔ میں بھی آپ سے واقف نہیں ہوں۔ میں پہلا تعارف کرا دوں میرا نام آفتاب حسین ہے اور میں وکیل ہوں۔ گزشتہ بیس سال سے میں اپنی موکلہ محترمہ سعدیہ بیگم کے مالی اور کاروباری امور کا نگراں ہوں۔ کوئی چھ ماہ پہلے بیگم صاحبہ نے مجھے طلب کر کے ایک خط اور آپ کا پتا مجھے دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ ان کی موت کے بعد میں یہ خط آپ کو پوسٹ کر دوں۔

آپ کو یہ جان کر دکھ ہوگا کہ ابھی چند روز پہلے 10 ذی الحجہ کو شام چھ بجے محترمہ سعدیہ بیگم کا انتقال ہو گیا۔ ان کی ہدایت کے مطابق آپ کی یہ امانت کوریئر سروس کے ذریعے آپ کو ارسال کر رہا ہوں۔

کارلا تقہ شے یاد فرمائیے گا۔

والسلام مخلوص کیش

آفتاب حسین (ایڈووکیٹ)

شاہ فرید خط پڑھنے کے بعد چند لمحے سوچ میں ڈوبے رہے۔ پھر انہوں نے خط مدثر کی طرف بڑھا دیا۔ تینوں بھائیوں نے مل کر وہ خط پڑھا اور شاہ صاحب کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

میرا خیال ہے یہ ذاتی نوعیت کا خط ہے۔ تمہیں یہ خط پڑھ لینا چاہیے۔ شاہ

صاحب نے کہا۔
تینوں لڑکوں نے نفی میں سر ہلایا۔
الہی بخش تمہارے سامنے اپنی پوری زندگی کھول کر رکھنا چاہتا تھا۔ یہ بات اس نے خود مجھ سے کہی تھی لیکن وہ بے بسی محسوس کرتا تھا۔ کچھ بتا نہ سکا۔ شاید یہ تمہارے موقع ہے کہ تم اپنے باپ کو جان سکو۔ اسے سمجھ سکو۔ یہ خط کھول لو۔ تمہیں یہ حق حاصل ہے۔
شاہ صاحب نے کہا۔
تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ تینوں متفق تھے۔ مدثر نے کہا۔ شاہ جی ابا کے معاملات کے لیے ابا نے آپ کو نامزد کیا تھا۔ آپ یہ خط کھولیں اور پڑھیں۔ پھر مناسب سمجھیں تو ہمیں پڑھنے کی اجازت دے دیں۔
شاہ فرید چند لمحے ہچکچائے۔ پھر انہوں نے دوسرا لفافہ چاک کیا اور خط نکال لیا۔ ان کے ہاتھوں میں لرزش تھی اور دل کانپ رہا تھا۔ وہ مرنے والے کی ذاتی زندگی میں داخل ہونے والے تھے۔ کون جانے اس میں کیسے کیسے راز ہوں۔
چھلکتی آنکھوں سے انہوں نے خط پڑھنا شروع کیا۔

☆----------☆----------☆

مجھے بھولے تو نہیں ہو؟ عرصہ بھی تو اتنا بیت گیا۔ تمہاری رہائی گزری جا رہی ہے۔ درمیان میں کئی بار تمہیں خط لکھنے کو جی چاہا لیکن سوچا کہ وہ مقصد ہی فوت ہو جائے گا جس کے لیے اتنی قیمت چکی ہے۔ حالانکہ جانتی تھی کہ وہ مقصد کبھی پورا نہیں ہوا۔
یہ خط ملے گا تو میں اس دنیا میں نہیں ہوں گی۔ شرم آتی تھی اس لئے یہ شرط رکھی کہ یہ خط میرے مرنے کے بعد تمہیں پوسٹ کیا جائے۔ میری ایک بہت بڑی غرض تم سے

وابستہ ہے۔ وہ غرض نہ ہوتی تو شاید اب بھی تمہیں خط نہ لکھتی۔ اس غرض سے ہی یہ ضروری تھا کہ تمہیں سب کچھ بتاؤں۔ تاکہ میری غرض پوری کر سکو۔

اس خط میں کچھ اعترافات ہیں اور کچھ انکشافات۔ اس یقین کے ساتھ پڑھنا کہ ایک ایک لفظ سچ ہے' کوئی مرنے والا جھوٹ تو نہیں بولتا نا۔ میں بھی سب کچھ سچ لکھ رہی ہوں۔ بے حجاب ہو کر لکھ رہی ہوں۔ برا لگے تو مجبور سمجھ کر معاف کر دینا لیکن میری غرض ضرور پوری کر دینا۔

میں اس دوپہر کو کبھی نہیں بھولی' جب طارق روڈ کے فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوئے ایک رنگ ساز کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ آج میں اعتراف کر رہی ہوں کہ مجھے پہلی ہی نظر میں تم سے محبت ہو گئی تھی۔

میں اس وقت بہت کم عمر تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مقام اور مرتبے کا فرق کتنا بڑا ہوتا ہے۔ پھر بھی میں نے اس محبت کی نفی کی' اس کا مذاق اڑایا۔ میں اس طرف نہیں گئی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ بات آگے بڑھے۔ اس کے باوجود مجھ سے نہیں رہا گیا میں ایک بار وہاں گئی اور تمہیں دیکھا یوں کہ تمہیں بھی پتا نہیں چلا ہوگا۔

پھر قسمت تمہیں میرے گھر محسن بنا کر لے آئی۔ تم نے میرے چھوٹے بھائی کی جان بچائی تھی۔ تم زخمی ہوئے تھے۔ اللہ جنت نصیب فرمائے' میرے پاپا بہت اچھے انسان تھے۔ محسنوں کی عزت کرتے تھے۔ انہوں نے تمہیں پرکھا اور پھر میری ڈور سونپ دی۔ اب میں کیا کرتی۔ فیصلہ کرنے والے نے فیصلہ کر دیا تھا کہ مجھے تم سے محبت کرنی ہے۔

میں پہلی ہی نظر سے جانتی تھی کہ تم بھی پہلی ہی نظر میں مجھ سے محبت کرنے لگے ہو۔ تم

مجھے کالج لے جانے اور لانے لگے تو میری آنکھیں خواب دیکھنے لگیں۔ میں پچی عمر سے بڑی اور سمجھدار ہوتی گئی میں نے سوچا تمہیں ڈرائیوری چھوڑ کر دفتری کام کی طرف راغب کروں گی۔ پاپا اس سلسلے میں بخوشی کام آتے۔ تم مزید تعلیم حاصل کرتے اور شاید کسی دن تمہارے پاس وہ سب کچھ ہوتا' جو پاپا کے پاس تھا۔ میں نے اللہ کی نوازشات دیکھی ہیں۔ میرے پاپا بھی غریب ہی سے یہاں تک پہنچے تھے۔ تو یہ سب کچھ سوچا تھا میں نے۔

لیکن اس سسلے میں تم نے ہونے والی گفتگو نے میری آنکھیں کھول دیں۔ مجھے پتا چل گیا کہ حقیقت پسندی کیا ہے اور اس کے کیا تقاضے ہیں تم جو تھے وہی رہنا چاہتے تھے۔ اب میں سوچتی ہوں کہ یہ درست ہے آدمی کو وہی رہنا چاہیے جو وہ ہے۔ تم میری خاطر سمجھوتے تو نہیں کر سکتے تھے۔ تمہیں مجھ سے محبت تھی تو اس لئے کہ تم اس محبت پر مجبور تھے۔ پھر میری سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ تم نے مجھے پانے کا کبھی سوچا بھی نہیں۔ تم مجھے پانا ہی نہیں چاہتے۔ تمہاری محبت بے غرض اور بہت بلند ہے۔

یاد ہے تم نے مجھ سے کہا تھا۔ نیچے سے اوپر جانا مشکل ہے۔ ہاں اوپر سے نیچے آنا آسان ہے اور یہ بھی کہ کیا اوپر اور کیا نیچے یہ تو اپنا اپنا نقطہ نظر ہے میں تمہاری خاطر سمجھوتے کر سکتی تھی۔ نیچے آ سکتی تھی۔ میں بانڈہ ہنگ میں دال چاول چنتے' چارہ بناتے' جب تھاپتے زندگی گزار سکتی تھی لیکن عزت جاتی رہتی۔ میں بغاوت کرتی تو والدین کی عزت بھی جاتی اور میں تمہارے گھر میں بھی عزت کی مستحق نہ ہوتی۔

میں اعتراف کر رہی ہوں کہ محبت تو مجھے ہوگئی تھی لیکن محبت کیسی کی جانی چاہیے' یہ میں نے تم سے سیکھا۔ مگر میرے اور تمہارے انداز میں ایک بڑا فرق تھا۔ تم محبت کئے جاتے

تھے لیکن تمہیں میرے جذبات اور محسوسات سے کوئی غرض نہیں تھی۔ محبت مجھ پر کیسے اثر انداز ہوگی، یہ تم نے کبھی سوچا بھی نہیں۔ جبکہ مجھے تمہاری فکر تھی۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ شہر اور شہر کے لوگوں بالخصوص خواتین کے بارے میں تمہارے نظریات دو طرح کے ہیں۔ تمہارے خیال میں وہاں حیا اور آبرو کی کوئی اہمیت نہیں۔ یہ غلط تھا اور غلط ہے۔ میں تمہیں سمجھا سکتی تھی لیکن نہیں، مجھے تو تمہارے نظریات کی اس خامی سے فائدہ اٹھانا تھا۔

چنانچہ میں نے تمہارے لئے شاہد کا ہوا تخلیق کر ڈالا۔ میری سوچ یہ تھی کہ یا تو تم رقابت میں مبتلا ہو کر میرے تجویز کردہ سمجھوتے کو قبول کر لو گے یا پھر مجھے برا سمجھ کر میری محبت چھوڑ دو گے اور نفرت کرنے لگو گے۔ اب سوچتی ہوں کہ میرا سوچنے کا انداز بچکانہ تھا۔ دونوں میں سے ایک بات بھی نہیں ہوئی۔ ہاں شاید شہر اور شہریوں کے بارے میں تمہارا نظریہ اور پختہ ہو گیا۔

میں اس کے بعد پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی اور نہیں ہٹی۔ یونیورسٹی میں میں ہر روز تمہارے سامنے پاکیزگی کے ثبوت فراہم کرتی رہی لیکن تمہارا کچھ نہیں بگڑا۔ البتہ عشق کا مفہوم مجھ پر واضح ہوتا چلا گیا۔

میں نے کئی بار سوچا کہ پاپا سے بات کروں۔ میں جانتی تھی کہ پاپا شوری سے کی میری بات سمجھ اور مان لیں گے۔ اس لئے کہ ان کے لئے میری خوشی اہم تھی لیکن مسئلہ امی کا تھا۔ امی ابتدا سے تم سے چڑتی تھیں اور ان کا چڑنا بے سبب بھی نہیں تھا۔ بیٹی کو ماں سے زیادہ کوئی نہیں سمجھتا۔ ماں بیٹی کی ہر نظر، ہر لہجہ اور ہر خواہش پہچانتی ہے۔ ہمارے درمیان کبھی اس موضوع پر اشارتاً بھی بات نہیں ہوئی لیکن مجھے یقین ہے کہ امی نے

مجھے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا تھا۔ اسی دن جب میں نے حارق روڈ پر پہلی بار تمہیں دیکھا تھا۔ تم میرے ساتھ تھیں شاید امی نے تبھی سمجھ لیا تھا اور پھر تم ہمارے گھر آ گئے اور میرا تمہارا ساتھ رہنے لگا۔ امی کھل کر کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھیں۔ تو وہ تم سے نفرت کے سوا اور کیا کرتیں۔

تم نہیں جانتے امی بخش کہ میں نے کتنی کرب ناک راتیں نیند سے محروم گزاری ہیں۔ آدمی اچھا اور خود کو بدترین ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہو تو وہ کیسے کرب سے دوچار ہو سکتا ہے۔ پھر اس کا نتیجہ بھی کچھ نہیں نکل رہا تھا۔ میری صحت تباہ ہونے لگی۔

پھر وہ واقعہ پیش آ گیا جب امی نے تم پر چوری کا الزام لگایا اس روز میرے غم و غصے کی کوئی حد نہیں تھی لیکن میں چھوٹی تھی۔ امی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی تھی۔ میں جانتی تھی کہ تم کتنے سچے اور خوددار آدمی ہو۔ مجھے یقین تھا کہ تم ملازمت چھوڑ دو گے لیکن پھر مجھے اندازہ ہوا کہ تمہارا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ میں نے سمجھ لیا کہ تم مجھ سے یونہی بے لوث محبت کرتے' میری خدمت کرتے پوری زندگی بھی گزار سکتے ہو۔ یعنی ضائع کر سکتے ہو اور تم اچھے آدمی ہو ایسے انجام کا مستحق نہیں ہوتا۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ امی بار بار روز کسی نہ کسی بہانے تمہیں ذلیل کریں گی اور تم میری محبت کی خاطر سے سہہ لو گے۔ سہتے سہتے عزت نفس سے محروم ہو جاؤ گے۔ تمہاری خوبصورت روح کچلی جانے گی۔ یہ مجھے گوارا نہیں تھا۔ میں تمہیں ویسا ہی خوبصورت' پھلتا پھولتا اور کامیاب انسان دیکھنا چاہتی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب تمہارے جانے کا وقت آ گیا ہے۔ وہ بہت تکلیف دہ فیصلہ تھا اور وہ نتیجہ حاصل کرنے کا جو طریقہ میں نے اپنایا' وہ اور زیادہ اذیت ناک تھا۔ اس روز میں نے خود کو تمہارے سامنے بالکل گرا لیا۔ خود کو ذلیل کر لیا میں نے۔ مگر

مجھے طمانیت ہے کہ اب تم مجھ سے محبت ترک کر دو گے۔ گھر جاؤ گے۔ شادی کرو گے ور اچھی زندگی گزارو گے۔ اپنی اولاد کی تربیت اچھی طرح کرو گے۔

میری اس حرکت نے تمہیں جانے پر مجبور کر دیا۔ تم جا رہے تھے تو میں تمہیں کھڑکی سے دیکھ رہی تھی۔ میری آنکھیں برس رہی تھیں لیکن دل میں اذیت میں لپٹی یک خوشی تھی کہ میں تمہارے کام آئی۔ میں نے محبت کا حق ادا کر دیا۔

صبح پاپا ور امی کو پتا چلا کہ تم چلے گئے ہو۔ پاپا نے کہا۔۔۔۔۔۔۔ کیوں؟ میں نے تو اس سے معافی مانگ لی تھی ور اس نے کہا ہی نہیں تھا کہ وہ جا رہا ہے۔ وہ ایسے بغیر بتائے جانے والا تو نہیں۔ پاپا کی بات ٹھیک تھی۔ وجہ میں جانتی تھی لیکن بتا نہیں سکتی تھی۔ میں نے امی سے کہا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پورا گھر چیک کریں۔ کہیں وہ کچھ چرا کر تو نہیں لے گیا۔ امی نے کچھ نہیں کہا وہ شرمندہ ہو کر رہ گئیں۔

پاپا کو تم سے کتنی انسیت تھی' اس کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ میرے لئے بھی کوئی ڈرائیور نہیں رکھا گیا۔ بلکہ پاپا نے میری وہ کار بھی فروخت کر دی۔ تمہارے اس کوارٹر میں بھی کوئی نہیں رہا۔

میں اگلے ہی روز تمہارے کوارٹر میں گئی مجھے امید تھی کہ نفرت کی وجہ سے تم میری دی ہوئی چیزیں چھوڑ گئے ہو گے لیکن وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ سوائے یک پرانی قمیض کے۔ مجھے مایوسی ہوئی لیکن میں نے سوچا میں نے حرکتیں ہی ایسی کی ہیں کہ تھوڑے دنوں میں تم مجھے بھلا کر نئی زندگی شروع کر دو گے۔ تمہاری پرانی قمیض میں اپنے ساتھ لے آئی کہ اس میں تمہاری خوشبو بسی تھی۔ وہ قمیض آج بھی میرے پاس موجود ہے۔ وقت گزرتا گیا۔ تعلیم مکمل کر کے میں نے پاپا کے کاروبار میں دلچسپی لی۔

سب کچھ سنبھالنے لگی۔ پھر یکے بعد دیگرے پاپا اور امی مجھے چھوڑ گئے۔ اظہر شادی کر کے علیحدہ ہو گیا۔ میں اکیلی رہ گئی لیکن میں بہت خوش تھی۔

میں اکثر تمہارے کوارٹر میں چلی جاتی۔ کبھی کبھی گھنٹوں وہاں بیٹھی رہتی۔ ملازمہ ہر روز کوارٹر کی صفائی کرتی تھی۔ شام کو وہاں روشنی کر دی جاتی۔ وہاں میں نے کبھی اندھیرا نہیں رہنے دیا۔ اس کوارٹر کو میں نے کبھی غیر آباد نہیں رہنے دیا۔

میں خوش تھی کہ تم شہری بدکردار اور آوارہ ساوی کو بھول گئے ہو۔ مگر پھر میری یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔ ایک رات میری آنکھ کھلی اور مجھے احساس ہوا کہ تم مجھے یاد کر رہے ہو۔ میں تمہارے سامنے بیٹھی ہوں۔ اس کے بعد ہر رات پچھلے پہر یہی ہونے لگا۔ میری آنکھ کھلتی اور میں تمہارے کوارٹر میں چلی جاتی۔ تم سے باتیں کرتے کرتے وہیں سو جاتی۔

اب سے کوئی تین ساڑھے تین سال پہلے مجھے صاف لگا کہ یہ ناتا ٹوٹ گیا ہے۔ پھر مجھے کبھی تمہاری یاد نہیں آئی۔ مجھے کبھی کسی نے نہیں جگایا۔ وہ بڑی محرومی تھی لیکن نہ جانے کیوں مجھے یہ اطمینان تھا کہ تم مجھ سے خفا نہیں ہو۔ تب میں مطالعے کی طرف راغب ہو گئی ہوں۔ ایک دن بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔ تمہیں یاد ہے، پہلی بارش کے وہ شعر ہماری سمجھ میں نہیں آئے تھے۔

سوچتے سوچتے یہ تو میری سمجھ میں آ گیا کہ انسان کی پیشانی میں اسم اللہ کا نور رکھا گیا ہے۔ سجدہ اسی کو کرایا گیا تھا۔ وہ سا شعر عجیب طرح سے سمجھ میں آیا۔

میں جن حالات سے گزری تھی ان میں آدمی جبر اور قدر کے فلسفے میں الجھ ہی جاتا ہے۔ میں سوچتی کیا میں چاہتی تو تم سے شادی کر سکتی تھی؟

کیا یہ میرے اختیار میں تھا؟ تمہاری محبت تو مجھے زبردستی سونپی گئی تھی۔ میں نے

بلال وہ تو تم سے محبت نہیں کی تھی۔ میں سوچتی کیا میں مجبور نہیں ہوں؟ یا مجھے اختیار ہے؟ گر میں مجبور محض ہوں تو پھر سزا کیسی اور جزا کیوں؟ اس سلسلے میں میں مطالعہ کرتی رہی۔ یک دن میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب "مسئلہ جبر و قدر" پڑھ رہی تھی کہ ٹھٹک گئی لکھا تھا۔۔۔۔۔۔۔انسان کی عظمت اس میں بھی ہے کہ اس نے اللہ کی ایک عظیم امانت کا بوجھ اٹھایا۔۔۔۔۔

شاہ فرید پڑھتے پڑھتے رک گئے۔ ان کے کانوں میں الٰہی بخش کی آواز گونجی۔۔۔۔ اللہ جی نے پکارا۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے کوئی جو میری ایک امانت کا بوجھ اٹھائے۔ یہ سن کر سمندر کی سانسیں ٹوٹنے لگیں۔ پہاڑ ہیبت سے لرزنے لگے۔ پوری کائنات پر رزہ طاری ہو گیا۔

شاہ صاحب حیرت سے خط پڑھتے گئے۔ لفظوں کا فرق تھا۔ خط میں بھی وہی کچھ لکھا تھا جو الٰہی بخش نے کہا تھا۔ وہ پڑھتے چلے گئے۔

یوں میری سمجھ میں ناصر کاظمی کا وہ شعر آ گیا یقین ہے کہ تم بھی سمجھ چکے ہو گے۔ پھر بھی یہ سب لکھ دیا ہے کہ تم سے تعلق کی وجہ سے ضروری تھا۔ یہی ایک چیز تو تم سے شیئر کر سکتی ہوں میں۔

ب میں پنی غرض بھی بیان کر دوں۔ جس نے یہ خط لکھوایا ہے میرے نزدیک تم بہت بڑے انسان تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بڑے مقام والے۔ پھر بھی میں ہمیشہ تمہارے لیے دعا کرتی رہی کہ اللہ تمہیں بڑا مرتبہ عطا فرمائے۔۔۔۔ آخر میں بڑا مقام۔ مجھے اللہ کی ذات سے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوگا اور ایسا ہوا تو تم جنت میں جاؤ گے۔ جنت میں تم اپنی مرضی کا ساتھی بھی مانگ سکتے ہو۔ میری التجا ہے کہ اس موقع پر تم

رب کریم سے مجھے طلب کر لینا۔۔۔۔۔۔۔۔۔اپنی سادی کو۔

یقین کرو اس خواہش ہی کی وجہ سے میں نے شادی نہیں کی کہ کہیں اور پابند ہو جاؤں گی۔ دنیا میں ونچ نیچ ہے۔ تفریق ہے' اس لئے ہم نہیں مل سکے۔ تو وہاں تو مل سکتے ہیں' جہاں یہ جھگڑے نہیں ہوں گے۔ نہ کوئی شہری ہوگا نہ دیہاتی۔ میں نے شادی نہیں کی۔ سو اب تم اللہ کے حضور مجھے طلب کر سکتے ہو۔

میں شہری عورت ہوں۔ وفا کا دعویٰ ہے نہ حیا کا لیکن اللہ کی پاکی کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ مجھے کبھی کسی مرد نے چھوا تک نہیں۔ اس لمس کے سو میرے جسم پر کوئی داغ نہیں' جو اس آخری رات تم سے لپٹنے کا نتیجہ ہے۔ اللہ نیتوں کا حال جانتا ہے۔ وہ بھی میں نے خواہش کے تحت نہیں کیا تھا۔ صرف تم کو بچانا مقصود تھا اور اس پر بھی اللہ سے توبہ کرتی رہی ہوں اور یقین ہے کہ میری توبہ قبول کر لی گئی ہے۔ میں بے داغ ہوں اب بخش۔ ب میں اس دنیا میں۔ مجھے امید ہے کہ تم میری آخری خواہش وقت " نے پر ضرور پوری کرو گے۔ میں اب بس تمہارا انتظار کروں گی۔ میری ہر غلطی معاف کر دینا۔

فی امان اللہ

فقط تمہاری اور صرف تمہاری سادی

☆۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔☆۔۔۔۔۔۔۔۔۔☆

شاہ صاحب شل ہو رہے تھے ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔وہ بھی جو انہوں نے نہیں دیکھا تھا اور جو وہ نہیں جانتے تھے۔ دیر تک وہ ساکت بیٹھے رہے۔ آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔

پھر انہوں نے لرزتے ہاتھوں سے وہ خط مدثر کی طرف بڑھایا۔ یہ بھی پڑھ لو بہ لکھو تمہار

باپ اپنی پوری زندگی دکھانا چاہتا تھا۔اللہ نے اس کی یہ خواہش بھی پوری کر دی۔
تینوں لڑکے خط پڑھنے لگے۔۔۔۔۔۔۔

بائدہ جھنگ کے جلاہے عاشق الٰہی بخش کی کہانی اختتام کو پہنچ گئی تھی۔

☆۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔☆۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔☆

لیکن نہیں الٰہی بخش کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

الٰہی بخش کی وفات کو دو ماہ ہوئے ہوں گے کہ حاجی نیاز محمد' شاہ فرید سے ملنے اس کے گھر آئے۔ انہوں نے اس بار حج کی سعادت حاصل کی تھی۔ انہوں نے شاہ فرید کو کھجور اور آب زم زم کا تحفہ پیش کیا اور ایک تسبیح بھی دی۔

دونوں باتیں کرتے رہے پھر حاجی نیاز محمد نے کہا سنا ہے کہ الٰہی بخش فوت ہو گیا۔

ہاں بھئی موت تو سب کیلئے ہے۔اللہ جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔بہت نیک" دل تھا۔شاہ صاحب بولے۔

اس کے ہاں دعا کرنے چلیں گے؟

ضرور کیوں نہیں۔

دراصل اس کی یک امانت ہے میرے پاس۔حاجی صاحب نے وضاحت۔حج سے واپسی پر مجھے کراچی میں رکنا پڑ گیا تھا۔یہاں آنے میں دیر ہو گئی۔

دونوں آئے اور بائدہ جھنگ کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔

شام کا وقت تھا۔الٰہی بخش کے تینوں بیٹے گھر میں موجود تھے۔دعا ہوئی۔پھر حاجی نیاز محمد نے وہ تھیلا کھولا جو ان کے ہاتھ میں تھا۔میرے پاس الٰہی بخش کی کچھ امانتیں ہیں۔انہوں نے کہا۔یک تو الٰہی بخش کی اپنی ہے اور باقی آپ گھر والوں کے ہے۔لڑکے

حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔

حاجی صاحب نے زم زم کی پانچ شیشیاں' کھجوریں' تین ٹوپیاں' پانچ تسبیحاں اور ایک جاء نماز دی۔ یہ زم زم کی ایک شیشی' ایک تسبیح آپ پانچوں کے لئے ہے۔ میرا مطلب ہے تم تینوں کے اور تمہاری والدہ ہمشیرہ کے لئے۔ ٹوپی ایک ایک تم تینوں کے لئے اور جاء نماز تمہاری ماں کے لئے۔ الٰہی بخش نے یہی کہا تھا مجھ سے۔

مدثر نے وہ تمام چیزیں لے لیں۔ جزاک اللہ فی الدارین حاجی صاحب۔

حاجی صاحب نے پھر تھیلے میں ہاتھ ڈالا اور اس بار ایک بڑا رومال اور دعاؤں کی ایک چھوٹی سی کتاب نکالی۔ اور یہ ہیں الٰہی بخش کی امانتیں۔

یہ ابا نے کب دیں آپ کو؟

حج کے بعد۔ حاجی نیاز محمد نے کہا۔ روضہ رسول اکرم ﷺ کے سامنے اس سے ملاقات ہوئی میں نے اس سے خیریت پوچھی۔ وہ کہنے لگا۔۔۔۔۔۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے نیاز محمد میں نے اس سے پوچھا۔۔۔۔۔ یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے الٰہی بخش۔ اس نے دکھایا۔ دعاؤں کی یہ کتاب اس رومال میں لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے کہا یہ مجھے دے دو اس نے یہ دونوں چیزیں مجھے دے دیں۔ پھر بولا۔۔۔۔۔۔۔ نیاز محمد میرا ایک کام کرو گے؟ اس نے مجھ سے یہ تمام چیزیں گھر لانے کی فرمائش کی۔ تم لوگوں کے نام لے کر کہا کہ کس کے لئے کیا لے کر جانا ہے۔ میں نے کہا یہ سب تو تم خود بھی لے جا سکتے ہو۔ الٰہی بخش تو وہ اداسی سے کہنے لگا۔ میں بہت بیمار ہوں۔ خود ہی پہنچ جاؤں تو بڑی بات ہے۔ تم بس میرا یہ کام کر دو۔ میں نے وعدہ کر لیا اور اللہ کی عنایت سے پورا بھی کر دیا۔ اب یہ الٰہی بخش کی امانتیں بھی لے لیجئے۔

شاہ فرید کی اپنی کیفیت عجیب تھی ۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ الٰہی بخش کے بیٹوں کی طرف کیا دھیان دیتے۔

حاجی نیاز محمد کا ہاتھ بڑھا ہوا تھا لیکن کتاب اور رومال لینے کے لئے کوئی ہاتھ نہیں بڑھا۔ الٰہی بخش کے تینوں بیٹوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

یہ لے لو نا بیٹے۔ حاجی صاحب نے کہا۔

چاچا آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ مدثر نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ابا تو حج پر جا ہی نہیں سکے تھے۔

حاجی نیاز محمد ہکا بکا رہ گئے۔ کیسی باتیں کر رہے ہو۔ میں خود ملا ہوں اس سے۔

کوئی اور ہوگا چاچا! شکل ملتی ہوگی۔ مزمل بولا۔

ہاں چاچا حج کے خرچ کے پیسے تو ابا نے پہلے ہی خرچ کر دیئے تھے۔ نہ خرچ کیے ہوتے تب بھی ابا کی حالت ایسی نہیں تھی کہ حج کر سکتے۔ مبشر نے اس کی تائید کی۔

اور بقر عید کی اگلی صبح ابا کا انتقال ہو گیا تھا۔ مدثر نے کہا۔ اور عید کے دن ابا شاہ جی سے ملنے گئے تھے۔ مزمل نے شاہ فرید کی طرف اشارہ کیا۔ حاجی نیاز محمد نے تائید طلب نظروں سے شاہ فرید کی طرف دیکھا انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں نیاز محمد۔

کچھ بھی ہو مجھے یقین ہے کہ وہ الٰہی بخش ہی تھا۔ حاجی نیاز محمد نے کہا۔ تم یہ رومال دیکھو۔ یہ الٰہی بخش کا نہیں ہے کیا؟

مدثر نے رومال لے کر اسے کھولا۔ وہ الٰہی بخش کا پسندیدہ رومال تھا۔ رنگین رومال جس پر روضہ رسول مبارک کی شبیہہ بنی تھی۔ الٰہی بخش اس رومال کو سر پر لپیٹے رہتا تھا۔ گزشتہ کئی

روضے سے یہ رومال نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن مدثر کو یاد تھا کہ الٰہی بخش نے عید کی نماز یہی رومال سر پر باندھ کر ادا کی تھی۔

بھائی ذرا دکھاؤ تو۔ مزمل نے ہاتھ بڑھایا۔ یہ تو ابا کا ہی رومال معلوم ہوتا ہے۔

مجھ پر شک کرتے ہو کیا میں جھوٹ بولوں گا؟ حاجی نیاز محمد بگڑ گئے۔

غصہ نہ کرو نیاز محمد۔ شاہ فرید نے ان کا کندھا تھپکا۔ لڑکوں کا قصور نہیں بات ہی ایسی ہے۔

اب مبشر رومال کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا پھر اس نے کہا یہ دیکھو یہ ابا ہی کا رومال ہے۔

ان سب نے دیکھا۔ رومال کے کنارے پر ننھے ننھے حروف میں الٰہی بخش کا نام لکھا تھا۔

رومال ایک بار لاعذری میں دیا گیا تھا۔ وہاں سے آیا تو یہ نام لکھا ہوا تھا۔ اب وہ سب گنگ تھے۔ ان کے سامنے ایک ایسی حقیقت تھی جو ان کی عقل سے ماورا تھی۔

دیر تک خاموشی رہی۔ حاجی نیاز محمد کے تصور میں وہ منظر چل رہا تھا جب اس نے الٰہی بخش کو روضہ مبارک کے سامنے دیکھا تھا۔

یہ کیسے ممکن ہے؟ مزمل بڑبڑایا۔

یہ سب کیا ہے شاہ جی۔ مدثر شاہ فرید کی طرف مڑا۔

یہ اللہ کی باتیں ہیں بالکو وہ جانے۔ شاہ فرید نے کہا۔ ہر بات سمجھنے کے لئے نہیں ہوتی۔ بعض باتیں پہلے ماننی پڑتی ہیں پھر خود بخود سمجھ میں آ جاتی ہیں۔

وہ تو ٹھیک ہے لیکن۔۔۔۔۔۔۔

میں تم لوگوں سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ شاہ فرید نے کہا۔ اور تم سے بھی نیاز محمد۔ وہ نیاز محمد کی طرف مڑے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ بات بس ہم لوگوں کے درمیان رہے اس

کا بھی کسی سے تذکرہ نہ کرنا۔

کیوں شاہ جی۔

دو نقصان ہیں اس کے۔ کچھ لوگ تو اسے جھوٹ سمجھیں گے۔۔۔۔۔۔مذاق اڑائیں گے اور کیونکہ یہ سچ ہے' اس لئے وہ نقصان میں رہیں گے۔ دوسرے جو لوگ اسے سچ مان لیں گے وہ الٰہی بخش کی قبر پوجنا شروع کر دیں گے۔

سچ کہتے ہیں آپ۔ حاجی نیاز محمد بولے۔

اور تم جانتے ہو یہ تمہارے ابا کو پسند نہیں تھا۔ شاہ صاحب نے لڑکوں سے کہا۔

ورنہ وہ پہاڑی پر دفن ہونے کی مخالفت نہ کرتا۔

آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں شاہ جی۔ مدثر نے کہا۔

بس اس کو بھول جاؤ۔ اب ہم چلتے ہیں۔

لڑکوں نے انہیں احترام سے رخصت کیا اور ان کے جاتے ہی گھر میں رومال کو تلاش کرتے رہے لیکن وہ رومال انہیں کیسے ملتا۔ وہ رومال جو حاجی نیاز محمد انہیں دے کر گئے تھے اور جو بیٹھک میں میز پر رکھا تھا' وہ رومال گھر میں کہیں اور کیسے ملتا۔ وہ گھر سے نکلے اور باپ کی قبر کی طرف چل دیئے۔

ڈیرے دی وڈ نامی گاؤں کے محلے سادات آباد میں واقع فرید حسین شاہ کے مکان کے اوپری حصے میں آج بھی الٰہی بخش کا کیا ہوا وہی رنگ چمک رہا ہے۔۔۔۔۔۔

الٰہی بخش کا رنگ۔۔۔۔۔۔

☆۔۔۔۔۔۔۔۔ختم شد☆۔۔۔۔۔۔۔۔۔